UNIVERSAL LIBRARY

OU_226606

UNIVERSAL LIBRARY

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

مسلمانوں کا دورِ جدید

اور

ہندوستان کا مستقبل

پروفیسر لوتھارپ سٹاڈرٹ" کی نیو ورلڈ آف اسلام کا اردو ایڈیشن
یعنی صدی سابقہ و حال کی اسلامی جدوجہد کا اصلی فوٹو مشرقِ قریبہ میں مغربی سیاست
بعد از جنگ کی مفصل روئداد۔ ہندوستان کے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی
تغیرات کی دلچسپ کیفیت اور اِن سب کی بنا پر آنے والے امکانات کا صحیح جائزہ

مُرتبہ و مؤلفہ

مولوی عبد القیوم ملک صاحب۔ بی اے (علیگ) بیرسٹرایٹ لاء
سابق ایڈیٹر "مسلم سٹینڈرڈ" لنڈن و آنریری سکرٹری ادارہ تجارات اسلامیہ
و ممتحن سول سروس کمیشن و لکچرار سکول علوم شرقیہ یونیورسٹی آف لنڈن

پبلشران

شیخ عبد الرحمٰن حبیب الرحمٰن تاجران کتب بازار مائی سیواں امرتسر

آفتابِ برقی پریس امرتسر میں باہتمام مولوی محمد عبد اللہ منہاس پرنٹر چھپا

1952

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ
۱	دیباچہ	۱
۲	تنقید	۳
۳	مقدمہ	۶
۴	احیاء اسلام	۲۳
۵	(پان اسلامزم) اتحاد المسلمین	۴۱
۶	تاثراتِ مغرب	۷۳
۷	تحریک وطنیت	۱۰۰
۸	ہندوستانیوں کا جذبۂ وطنیت	۱۷۰
۹	اقتصادی حالات میں تبدیلی	۱۸۸
۱۰	معاشرتی تغیرات	۲۰۵
۱۱	معاشرتی بے چینی وبالشویت	۲۱۸
۱۲	خاتمہ	۲۳۶

تنقید

گو۔ دنیائے اسلام کے دورِ جدید کا خواب آج نہیں۔ بلکہ آج سے سو سال قبل دیکھا گیا تھا۔ اور اس کی شہادت سید جمال الدین افغانی۔ سید محمد عبدہ مفتی مصر اور شیخ خیر الدین وزیر تیونس جیسی مقتدر ہستیوں نے دی۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس وقت وہ خیال محض خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔

یورپ کی یورشیں کیا اسوقت اور کیا اس کے بعد پیہم اسلامی دنیا کے باقی ماندہ آزاد حصص پر ہوتی رہیں۔ اور اُن کا خاتمہ اگر ہوا تو صرف اس وقت ہوا۔ جب سے جنگ عظیم کے بعد مغربی قوا نے ترکوں کی شرکت جنگ کی آڑ میں اُس کی رہی سہی قوت کو پامال کر دیا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ اور بقول مسٹر لائیڈ جارج ترکوں کو اپنے کئے کی سزا مل گئی مگر سوال یہ ہے۔ کہ آیا غیر ترکی بلاد اسلامیہ کو ان کے کئے پر اس کی جزا ملی یا نہیں۔ نتائج جنگ اور عہد نامجات جدید سے جن کے رو سے دنیا کی ضعیف قوموں کے حقوق کی تکمیل ہونی تھی۔ چیکوسلو واکیا۔ یوگو سلافیہ حتٰے کہ پولینڈ اور جارجیا جیسی کم بضاعت عیسائی ریاستوں کو حیات جدید کا وثیقہ مل گیا۔ مگر واسئے برحالت ما۔ اہل شام۔ اہل مصر اور اہل حجاز و عراق جن کی اعانت و صیانت نے اتحادی ممالک کی تکمیل کی نہ صرف آزادی موعودہ سے محروم رہے۔ بلکہ اس اہلیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ جو انہیں زیر سیادت ترکی حاصل تھی۔ گو پروفیسر ٹاورٹ کی وسیع علمیت نے اہل مشرق کی موجودہ حالت زار کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ مگر افسوس انہوں نے قوائے مغرب کی چیرہ دستی کو کسی اخلاقی کسوٹی پر نہیں جانچا۔ اور جبکہ راقم الحروف کو ان کی سیاحت لندن کے دوران میں ایک طویل گفتگو کا موقعہ ملا۔ تو میں نے ان

میں اور دیگر تمام بلادِ مخصوص مستشرقین نے ہی چنداں فرق نہ پایا۔ جن کی "پان یورپینیت" کا سودا اِن کے ہر قسم کے غیر مغربی حقوق و دعاوی کے اعتراف کا مانع ہوتا ہے۔ قابل پروفیسر نے میرے اعتراضات کا جواب دیا تو یہ دیا کہ خود عمالانِ جمہوریہ امریکہ جنوبی امریکہ کی غیر متمدن طوائف الملوک سے نالاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ اِن پر کسی نہ کسی قسم کا امریکی اقتدار قائم رکھیں۔ مگر اِس کا جواب اِن کے پاس کچھ نہ نکلا۔ کہ اِن کا یہ خیال خواہش کے درجے سے نکل کر کبھی فضائے عمل میں ظاہر نہیں ہوا۔ برخلاف اِس کے۔ مشرق میں باستثنا جاپان کوئی ایسا ملک نہ ہوگا۔ جس پر مغربی سیادت نے اپنا بھیانک سایہ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی رنگ میں نہ ڈالا ہو۔ علاوہ انڈین پیرو۔ ہانڈوراس۔ اور میکسیکو کی لاطینی جماعتیں میدانِ تمدن میں کیسی ہی درماندہ کیوں نہ ہوں۔ عربانِ شام و مصر و اہل ہندوستان جن کے ادبی و صنعتی کارہائے نمایاں کا سلسلہ اِس گئے گذرے زمانے میں بھی قطعاً بند نہیں ہوا۔ کیوں نعمت آزادی کے غیر مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اور اِن کی ہر قسم کی احتجاج کی پیش بندی سفلانہ ردِّ عمل سے کی جاتی ہے۔ میری دانست میں اِس سوال کے مخاطب اہل مشرق ہونے چاہئیں نہ کہ اہل مغرب۔ اِس میں کلام نہیں کہ ایک درندہ خصال قوت کے سامنے جس نے اپنے زور بازو کی آراستگی میں اپنے تمام عقلانی قوا لگا رکھے ہوں ایک متمدن مگر ضعیف کم مایہ اور قلیل التعداد قوم کی پیش نہیں جا سکتی۔ مگر اہل ہندوستان یا قوم عرب میں تو اِس قسم کی کوئی کمی موجود نہیں کیا اِن استادانِ یورپ میں جوہر عقل کی کمی ہے یا اِن کے بلاد کو قدرت نے مادی برکات سے مالا مال نہیں کیا۔ پھر ہندوستان کو لیجئے۔ وہ کونسی بات ہے۔ جو اِس خطہ میں موجود نہیں۔ مطالع ارضی ہے۔ تو اِس میں زیادہ۔ دنیا بھر کی معاشرت کی یادگاریں ہیں تو اِس میں بڑھکر۔ اخلاقیات میں یہ دنیا کے تین بزرگترین مذاہب کا ملجا۔ اور تعداد نفوس میں اگر بقول ایک انگریز اہل الرا اسے "خرگوشوں کا ڈربہ" کہا جائے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔ اب اگر ایسی سرزمین اور اتنے نفوس پر چند لاکھ افیال حادست کریں۔ تو اِس میں اِن کا کیا قصور ہے۔ پروفیسر رٹاڈرٹ نے اِس کمی کا ذمہ دار

اہلِ مشرق کی تمدنی بے مائیگی کو قرار دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ اور یہ بیان پروفیسر موصوف کی وسیع مشرقی معلومات کے باوجود اس کی جبلی تنگ نظری کو ظاہر کرتا ہے۔ میری دانست میں یہ نقص اہلِ مشرق کی اخلاقی جرأت کی کمی اور صحیح معنوں میں فقدانِ روحانیت کے سبب ہے۔ سنین حال کے ہندوستانی مظاہرات بادی النظر میں کیسے ہی غیر متوقع کیوں نہ ہوں۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ باستثنا معدودے چند اہلِ ہندوستان کی انسانی ملخ میں باہمی تعاون ایثار۔ اور حقیقی قومی شرف کا احساس ابھی تک صرف شاید نام ہی تک پیدا ہو سکا ہے۔ یہی کیفیت حجاز اور عراق کے وسیع خطوں کی ہے۔ جہاں خود غرضانہ عیاری اور غیر اسلامی منافرت اور رقابت کی گرم بازاری نے اس ارضِ مقدس کی حالت وہ کر دی۔ کہ گویا نعوذ باللہ منہا نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کا اس میں ظہور ہی نہیں ہوا۔ ہاں بے دے کر اگر کہیں اس ہمہ گیر نحوست میں آفتابِ اُمید کی کرن پڑتی ہے۔ تو وہ سرزمین اناطولیہ پر جس کی فوق العادہ شہامت اور تحیر خیز ایثار کی بدولت درماندہ مشرق کا کم از کم ایک دمدمہ اغیار کی پامالی سے محفوظ ہے۔ پروفیسر سٹاؤرٹ کہتے ہیں۔ اہلِ مشرق کا مستقبل بالعموم اور مسلمانانِ عالم کا بالخصوص جن کے ساتھ سارے مشرق کی زندگی وابستہ ہے۔ قسمت کے دیوتاؤں کی آغوش میں ہے۔ جن پر ان کا ایمان ہے۔ مسلمانوں کے دورِ سابقہ کی بے ہمتی اور غایت درجے کی بے عزتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاید یہ بیان قطعی طور پر غلط نہ ہو۔ مگر اس میں شبہ نہیں۔ کہ اس عالمگیر درماندگی کے ذمہ وار زیادہ تر وہ خود بھی ہیں۔ مگر میرا ایمان گواہی دیتا ہے۔ کہ حالات مابعد جنگ عظیم نے اب مسلمانوں کو وہ مسلمان رہنے نہیں دیا جو وہ پہلے تھے۔ بشرطیکہ ہم قرآن کریم کی تلقینِ عمل کے حامی ہوں۔ کوئی دن جاتا ہے۔ مسلمانانِ مشرق موجودہ مصائب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہینگے اور ترکانِ احرار کی سرفروشانہ سعی کی مشعل ہدایت لیکر "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کے مقدس وعدے کی تکمیل اپنے جدوجہد سے کرینگے۔

عبدالقیوم ملک

مقدمہ

اسلام کا دورِ جدید

طلوع و ترقی اسلام تاریخ دنیا کا ایک نہایت ہی دلچسپ باب ہے۔ اس کی ابتدا ایسے ملک میں اور ایسے لوگوں میں ہوئی جو اس سے قبل دنیا میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتے تھے۔ اور ایک ڈیڑھ صدی کی مختصر میعاد میں اس نے نہ صرف قدیم مذہب کو تہ و بالا کر دیا۔ بلکہ کئی کئی بڑی بڑی سلطنتوں کو پارہ پارہ کر کے اِن کے کھنڈرات پر ایک نئی اور بہر صورت مکمل دنیا کی بنیاد رکھی۔ یہ دنیا دنیائے اسلام ہے۔

جس قدر غور سے مطالعہ کیجئے۔ اُسی قدر آغاز اسلام کی حیرت انگیزی کا ثبوت ملتا ہے۔ جہاں دیگر مذاہب کا وجود اور اُن کی ترقی زیر قدرت سلاطین و فرمانروایانِ ملک کی اعانت و صیانت زیربار احسان رہے ہیں۔ اسلام ہی ایک واحد سلسلۂ روحانیت ہے۔ جو محض اپنے سیدھے سادے مگر عجیب و غریب اُصولوں کے بل پر کامیاب ہوا۔ عیسویت کا دامن ایک قسطنطین کے بار احسان سے تا ابد بھرپور رہیگا۔ بدھ مذہب اشلوک کے بذلِ احسان سے عہدہ برآ نہ ہو سکیگا۔ اور کون کہہ سکتا ہے۔ کہ خسرو کی دست گیری بقاء زرتشتی کا موجب نہیں ہوئی۔ فی الحقیقت یہ اِن سلاطین کی یاوری کا نتیجہ ہے کہ ہم آج اِن مذاہب کے پیروؤں کو دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلا ہوا پاتے ہیں۔ اب اسلام کی ابتداء ملاحظہ ہو۔ ایسے ایک قلیل آباد خطۂ ریگستان میں اس کی ابتدا ہوئی۔ جس کے لوگ خانہ بدوش اور تاریخ کے غیر ممتاز ترین طبقہ تھے۔ مگر انہیں لوگوں کی ایک مختصر جماعت نے نورِ اسلام کی مشعل کو ہاتھ میں لے کر ایسے وقت میں تسخیرِ عالم کا قصد کیا۔ جبکہ اِن کا معین و معاون کوئی بھی نہ تھا اور ایک دنیا اُن کی بیخ کنی پر تلی ہوئی تھی۔ مگر اسلام نے معجزہ کر دکھایا۔ وہ یہ تھا۔ کہ ۸۰ سال کے قلیل عرصے میں ہلال منور کی شعاعیں سلسلہ کوہ پیرنیز سے تا بہ ہمالہ اور ریگستانِ وسط ایشیا سے فضائے صحرائے اعظم تک پڑنے لگیں ؎

میرے خیال میں اسلام کی اس حیرت انگیز کامیابی کے اسباب میں سے تین امدادی اسباب نمایاں تر ہیں۔ اول۔ قوم عرب کے خصائل۔ دویم۔ مواعظہ محمدی کی حقیقت اور سویم اس وقت کی مشرقی دنیا کے حالات گو اس وقت تک اہل عرب کار ناموں نے ممتاز سے محروم تھے۔ مگر ان میں جوہر تھے۔ جو ذرائع اظہار کے متلاشی تھے۔ پیغمبر اسلام سے کئی پشتیں پہلے مختلف قسم کی جذب عمل کا اظہار کر چکے تھے۔ وہ اپنے آبائی اوہام باطلہ کو چھوڑنے کے خواہشمند تھے۔ اور قطعی طور پر ایک بہتر زندگی کے متمنی تھے۔ عین اس زمانۂ تمکوج میں صدائے اسلام وفضائے عربستان کے ایک گوشہ سے گونجی۔ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جس کی ذات میں اس کی قوم کے خصائل کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ایک سیدھی سادھی توحید کی تعلیم دی۔ جو کلیسیت اور عقاید کی پیچیدگیوں سے معرّا تھی۔ اور مذہبی جوش کے ان پنہاں اور بند چشموں کو جاری کیا جو سامی طبقۂ نسلِ انسانی کے رگ و ریشہ میں ہے۔ آج عرب اپنی دائمی رقابتوں اور عناد کو بھول گئے۔ اور نو یافتہ نور کی تاروں میں منسلک ہو کر دُنیا کو اللہ یعنی خدائے واحد کے زیر رحمت لانے کے لئے اس کے ہر گوشے میں ایک سیلاب کی مانند پھیل گئے۔

اسلامی رو خطۂ عرب سے بیرونی دنیا کی طرف بادِ صحرا کی طرح چلی۔ اور فوراً ہی ایک روحانی خلا سے متصادم ہوئی۔ عرب کی ہمسایہ سلطنتیں یعنی بازنطینی اور عجمی جو بظاہر پُر شوکت معلوم ہوتی تھیں۔ اپنے پُر ہیبت ماضی کی یادگار محض تھیں۔ ان کے مذاہب بے معنی اور مضحکہ انگیز توہمات کا مجموعہ تھے۔ ایران کا قدیم عقیدہ زرتشتی اب "مغانی" باطن پرستیوں کا ایک بے معنی ڈھکوسلہ رہ گیا تھا۔ اور عیسائیت جو کثرت پرستی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ خود غرض یونانی پادریوں کے عقائد فاسدہ کی تختۂ مشق بن کر عیسٰے مسیح کی تعلیم کا ایک مسخ شدہ بدل رہ گئی تھی علاوہ ازیں ان دونوں مذاہب کا شیرازہ آئے دن کی ملحدانہ بدعات اور اُس کا نتیجہ شدید عذاب اور باہمی تنازعات سے بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اُس پر طرہ یہ کہ دونوں سلطنتوں کا نظام عمل غایت درجہ کے استبداد پر مبنی تھا۔ جس نے رعایا کو نکما اور ان کے جذبہ حمیت کو برباد کر دیا تھا۔ ایک طویل اور تباہ کن جنگ نے ان دونوں سلطنتوں کی رہی سہی طاقت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ وقت متمدن دنیا کی یہ حالت تھی۔ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا۔ جونہی مشرقی رومی سلطنت کے منظم

اور سلطنتِ ایران کے زرہ پوش مبارز صحراے عرب کے اسلامی قہرمانوں کے مقابل آسکے ان کا صدیوں کا نظام اور قدیمی تربیت ایک آن میں خاک میں مل گئی۔ حتیٰ کہ ان کے سپاہیوں میں سے جذبۂ حب الوطنی بھی مفقود ہو گیا۔ ان مستبد سلطنتوں کی رعایا اور باغی فرقوں نے اس طوفان کا یا تو نہایت بے دلی سے مقابلہ اور یا نہایت جوش سے خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی اپنی ظالم سلطنتوں کے انجام پر انتہا درجہ کی خوشی کا اظہار کیا۔ تھوڑی ہی مدت میں وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ جن کے سادہ اور عام فہم اصول ان کے مسخ شدہ اور یا باطل عقائد سے انہیں کہیں زیادہ اچھے معلوم ہونے لگے۔ لیکن کیا فاتح عرب محض ایک بے اصول جنگی سپاہی تھے۔ جو قتل و غارت کے لئے اپنے گھروں سے نکلے تھے؟ ہرگز نہیں! عرب ان فتوحات سے پورا اور جائز فائدہ اٹھانے کا قصد کر چکے تھے۔ اور ان کی فیاض اور ارفع اسلامی خلقت میں نہ صرف ملک گیری بلکہ ملک داری کے تمام خصائص مضمر تھے۔ عربوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں اپنے گھروں کی بنائیں ڈالیں۔ اسلامی مساوات کی پاک تعلیم کے مطابق ان قوموں سے شادی بیاہ اور بھائی چارہ کا سلسلہ قائم کیا۔ اور اس معاشرتی اور سیاسی اتحاد سے ایک مخلوط اور بالکل جدید تمدن کا آغاز کیا جس کا نام اسلامی تمدن ہے۔ اس تمدن نے نہ صرف روم و یونان کی بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دی۔ بلکہ ایران اور شام کی روایات علم و فن میں اسلامی اور عربی قومی حریت اور مستعدی کی روح پھونک دی۔ دورِ اسلام کی پہلی تین صدیاں (۷۵۰ -- ۱۰۰۰) اس وقت کی دنیا کا ایک نہایت درخشاں زمانہ تھا۔ جس میں مسلمانوں نے خوبصورت اور دلفریب عمارات۔ شاندار مساجد اور عظیم الشان یونیورسٹیاں قائم کیں جہاں قرونِ وسطےٰ کے مسیحیت پرست جہالت مآب یورپ کے مقابلے میں علوم قدیم و جدید کا چرچا ہونے لگا۔ مگر دسویں صدی کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں کے روز بد کی صورت نظر آنے لگی۔ پہلے تو یہ انحطاط بتدریج ہوا۔ اور بارھویں صدی کے پُر آشوب زمانے تک مغربی اور اسلامی دنیا کی رفتاریں تقریباً ایک سی تھیں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ۱۲۵۸ء تک اسلام کی قرن زریں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کے انجام کی ابتدا یوں ہوئی۔ سب سے پہلے عربوں کی پرانی لعنت یعنی فرقہ آرائی نے پھر عود کیا۔ کئی پارٹیاں اسلامی

سیادت کی دعویدار ہو بیٹھیں اور ان کی رقابتیں مہلک خانگی فسادوں کی صورت میں رونما ہوئیں۔ ان بے معنی جھگڑوں سے ایک مایوس کن نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے ابتدائی جوش کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ابوبکرؓ اور عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسی پرعظمت شخصیتوں کی جگہ ایسے لوگوں نے لی جن کے ہاتھ میں منصب خلافت ان کی دنیا پرستی اور استبداد کا آلہ بن گئی۔ مقام خلافت پہلے دمشق میں منتقل کردیا گیا اور اس کے بعد بغداد میں۔ اس نقل مرکز کی وجہ عیاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں استبدادی طریق حکومت مشکل سے کامیاب ہوتا تھا۔ ریگستان کے جنگجو حریت پرست عرب کسی شخص کی مطلق العنانی کے پابند نہ ہوتے تھے۔ اور ان کی جبلی مساوات پسندی کو رسول اسلامؐ کی تعلیم اخوت نے اور بھی قوی کردیا تھا۔ خلافت مکہ ایک الٰہی جمہوریہ تھی۔ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو عامتہ الناس نے انتخاب کیا تھا۔ جس کے سامنے وہ اپنے افعال کے مطابق شریعت قرآن جواب دہ تھے۔

لیکن دمشق اور اس کے بعد بغداد میں حالات مختلف تھے۔ وہاں خالص عربی نژاد عرب شامی عجمی اور نیم عربی مسلمانوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ استبدادی بود و باش سے آشنا تھے۔ اور خلفاء وقت کے سامنے گردن خم کرنے کے لئے تیار رہتے تھے جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ خلفاء بغداد کا میلان زیادہ تر ان لوگوں کی طرف ہونے لگا۔ جن میں سے وہ اپنے وزرا۔ مصاحبین حتیٰ کہ عساکر کا انتخاب کرنے لگ گئے۔ ان بدعات سے متنفر ہوکر خشمگین اعراب مکہ نے اپنا بوریا بستر سنبھال فضائے صحرا سے آزادی کی راہ لی اور حکومت خلافت مشرق قدیم کی شخصی حکومت کی ہمشکل بن گئی۔ انتقال خلافت بغداد نے (سنہ ۷۵۰ء) جو عباسی خلافت کی بنا کے بعد عمل میں آیا۔ ایوان حکومت کے تمام دروازے ایرانی عمال اور ایرانی اثر کے لئے کھول دئے۔ نامور خلیفہ ہارون الرشید جو الف لیلہ کا ہیرو ہے ہر طرح سے ایک ایرانی تاجدار تھا۔ اور کیکاؤس اور کیخسرو جیسے سلاطین کا مماثل تھا نہ کہ ابوبکر اور عمر کا۔ اور استبداد نے ایسے خلفا کے لئے وہی کیا جو ایسے طریق حکومت کا لابدی نتیجہ ہے۔ محمدؐ جیسی ذات کے جانشین متلون وعشرت پسند جابر ہوگئے اور وسیع سلطنت اسلامیہ کی عنان حکومت ان کے ضعیف ہاتھوں سے نکل پڑی۔

آخر اِس سلطنت کے انجام کا وقت آگیا۔ حوصلہ مند رہنماؤں کے عدم وجود۔ خانگی رکاوٹوں اُور مساوات و اخوتِ اسلامیہ کی فقدان کے ہوتے ہوئے بھلا اتنے بڑے نظام سیاست کا شیرازہ کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ گھر گھر دعوے دارِ امارت بن بیٹھے اُور قبلِ اسلام کی روایات قبائل سازی پھر تازہ ہوگئیں۔ بلکہ وہ سرعت رفتار جس سے اسلام آگے بڑھا تھا۔ اب اُس کی ذریعہ زوال ہوگئی۔ عربوں میں قبولیت اسلام کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ خود عربی قومی خلقت میں وہ خصائص پیدا ہو چلے تھے۔ پروفیسر سٹاوڈرٹ نے اِس بیان میں ایک تحریرا اجتہادی غلطی کی ہے۔ اگر ان کو آغاز اسلام کے وقت کی عربی تاریخ کا علم ہوتا تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ کہ طلوعِ آفتاب رسالت محمدؐ عربی فی الحقیقت اِس عام تاریکی کو روشن کرنے کے لئے ہوا تھا جو اِس وقت نہ صرف دنیائے عرب بلکہ دنیائے متمدن میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی) جن کا احیاء اسلام کا خاص مشن تھا۔ مگر جب اور قوموں نے اسلام قبول کیا۔ تو انہوں نے اِس کے صاف اُور کھرے اصولوں کو اپنی قومی طریق استدلال اُور خصوصی نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔ جس کی وجہ سے اسلام وہ پاک اُور سیدھا سادہ اسلام نہ رہا۔ جس کا وعظ رسول عربی نے فاران کی چوٹی پر سے کیا تھا۔ اِس امر کا ایک انتہائی ثبوت ایران کے مسلمانوں میں ملتا ہے۔ جہاں رسولؐ عربی کی عام فہم توحید ایک پیچیدہ فلسفۂ معرفت کے پیچوں میں آگئی۔ اُور مذہب شیعی کا باعث ہوئی جس نے خطۂ ایران اُور عام دنیا اسلام کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی۔ یہ بات شمالی افریقہ کے بربری مسلمانوں کی غایت درجہ کی پیر پرستی اُور ہندوستانی مسلمانوں کی توہمات و نیچر پرستی کا باعث ہوئی ہے۔ اِس میں کلام نہیں۔ کہ محمدؐ عربی ایسی آمیزشوں سے حد درجہ خفا تھے۔

حالات مذہبی کے اِس تغیر کے ساتھ ساتھ سیاسی طاقت کو بھی صدمہ پہنچنے لگا۔ اُور دورِ عباسی کے شروع ہوتے ہی خلافت اسلامیہ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ خاندان فاطمیہ جو منصب خلافت سے محروم کر دیا گیا تھا کے ایک ممبر نے قرطبہ ہسپانیہ میں ایک اُور خلافت قائم کر دی جسے نہ صرف ہسپانیہ کے مسلمانوں نے بلکہ شمالی افریقہ کے مسلمانوں نے بھی تسلیم کر لیا۔ اِس کے بعد ایک اُور خلافت مصر میں بھی قائم ہو گئی۔ خاندانِ فاطمیہ رسول اکرمؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ

سے سلسلۂ نسب رکھنے کے سبب منصب خلافت کا دعوے دار تھا۔ خلافت بغداد بھی بتدریج زائل ہوگئی اور علم خلافت اب ایک نئے نومسلم فرقے یعنی ترکوں کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا۔

قبل اس کے کہ "اعراب جدید" یا نیم عرب طبقہ اسلام کے ہاتھوں سے ترکی سیادت میں انتقال خلافت پر بحث کی جائے یہ بہتر ہوگا اگر اوائل انحطاط اسلام کے مذہبی اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

رسولؐ عربی کے زمانے کے عرب ایک تازہ دم عالی حوصلہ قوم تھی۔ جو کارہائے نمایاں کی سر انجام دہی کے لئے از حد مستعد تھے۔ ان کی خلقت میں تامی تعصب مذہب تو موجود تھا۔ لیکن وہ تنگدل نہ تھے۔ وہ اپنے مذہب کے پر جوش حامی تھے۔ مگر پرستاران غیر عقاید کے متحمل بھی تھے۔ وہ اپنے مذہب کے شدت سے پابند تھے۔ جس کا سمجھنا ان کے لئے یا کسی اور انسان کے لئے مشکل نہ تھا۔ اسلامی تعلیم کا کل نظام خدا پرستی اور چند عقاید پر مشتمل ہے توحید الوہیت۔ رسالت محمدؐ مطابق تعلیم قرآن۔ فرائض مثلاً۔ روزہ۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ حج یہ مختصر اصول اسلام کی کل جسم و جان ہیں اور یہی وہ اسلام تھا جو دنیا کے فاتح عربوں کا مذہب تھا ایسے سادہ اور عام فہم مذہب کے اصول عربوں کے بیدار شدہ احساسات کے منافی ہرگز نہ ہوسکتے تھے۔ جو صحرائے عرب کی بنجر اور سنگلاخ فضا سے باہر ایک زیادہ متمدن زندگی کے خواہاں ہوتے جاتے تھے۔ عربوں نے قدیمی تمدنوں کے نام لیواؤں کو تسخیر کیا۔ مگر ان کے سامان عشرت کو برباد نہیں کیا۔ بلکہ اس کا بنظر غور و تحقیق مطالعہ کیا۔ اور اُن کی مفید باتوں کو قبول کیا اور قدیم علوم و فنون و ادب سے پوری طرح متمتع ہوئے۔ عربی ذہانت اور دماغی تجسس اور ان نادرات مدنیت کے وجود نے ان کے فرس کشش کے لئے تازیانہ کا کام دیا۔ اور انہوں نے وہ وہ بے بہا مادی اور عقلانی جوہر دکھائے۔ کہ آج "تمدن اسلام" ایک پر معنی اور ستائش خیز جملہ ہے۔ لیکن میں کہونگا۔ کہ اس کار عظیم میں علاوہ عربوں کے اور لوگ بھی شریک تھے مثلاً مرتد عیسائی یہودی اور عجمی جو باضابطہ اور مغانی باطل پرستیوں سے مُنہ موڑ کر اسلام کی سچی تعلیم کے حلقہ بگوش ہوگئے تھے۔ آہ افسوس! یہ زمانہ فضل و سعادت اب ختم ہوگیا۔ اور اُس کی جگہ رجعت پسند گروہ نے لی۔ جن کی طاقت ترقی پر تھی۔ "لبرل" گروہ عام طور پر

معتزلہ لفظ سے پکارا گیا ہے۔ اِس امر کا حامی تھا۔ کہ اسلام نہ صرف اپنی اصلی سچی تعلیم کو قائم رکھے۔ بلکہ اس کا ہر ایک عقیدہ بُرہان اور دلیل کا پابند ہو۔ برخلاف اِس کے ایک دوسرا اقدامت پسند گروہ تھا۔ جو اُصول مذہب کی بنیاد "نظیر" پر موقوف کرنا چاہتا تھا۔ اِس گروہ میں کئی ایک مرتد عیسائی نومسلم تھے۔ جو بازنطی کلیسہ کی متشرعیت کے عادی تھے۔ اِن لوگوں نے قرآن پاک کے احکام کی نئی تفسیر اپنے طریق استدلال کے مطابق کرنی شروع کی اور اس کے ساتھ رسول عربی صلعم کی احادیث کی ترتیب و تنظیم اِس نہج سے کی کہ خود نظام اسلام کی بنیادیں اب گویا اِن اُصولوں پر قائم ہوتی نظر آنے لگیں۔ جن پر قرون وسطےٰ کی مسیحیت کی اساس اُٹھائی گئی تھی ؂

گو کہ اِن مقلدان قدامت اور "بُرہان پسند" فرقوں کی یہ نئی جنگ طبعی طور پر ایک عرصہ تک جاری رہی۔ مگر اس کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ علامات اور اسباب اِس امر کی کامل شہادت دیتے تھے۔ کہ پیروان تقلید تاریخی مقابل گروہ پر بازی لے جائینگے۔ مشرقی روایات جو زیادہ تر نسلی رسم و رواج اور آب و ہوا کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ آخری فتح استبداد کے حق میں دیتے تھے۔ یہ استبداد ایک محدود زمانے کے لئے آزاد بادیہ نشینوں کے سیلاب کے نیچے دب گیا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوتا تھا۔ کہ پرانے فطری میلان سیاست الٰہی جمہوریہ کے مبدل بہ استبداد ہو جانے سے پھر اُبھرنے والے ہیں ؂

استبداد حکومت مُلکی قطعی طور پر ہر نوع کے احیاء جبر کا پیش خیمہ تھا۔ کیونکہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ سیاسی مطلق العنانی جو آزادیٔ فعل کی جانی دشمن ہے۔ آزادی خیال کی معاون یا متحمل ہو۔ یہ صحیح ہے۔ کہ بعض خلفاء دمشق کچھ دنوں معتزلہ عقائد کے گرویدہ ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ فاطمی خلفاء و اعیان ملت کی تربیت زیادہ تر "دُنیا دلیت" کی آب و ہوا میں ہوئی تھی۔ اِس لئے قدرتی طور پر وہ دلیل و برہان کے قائل تھے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہ معلوم ہونے لگا۔ کہ آزادی عقائد و ایمان ہر قسم کی آزادی کا منبع ہے۔ فلاسفران معتزلہ اپنی بحث کو محض میدان عقائد و مسائل روحانی تک ہی محدود نہیں رکھتے تھے۔ اور اب وہ ممنوعہ و ممنوع حدود سے تجاوز کرنے لگے۔ اور آغاز اسلام کے اُن پُرشوکت ایام کو حسرت سے یاد کرنے لگے۔ جبکہ منصب خلافت اسلام موروثی جائداد نہ سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ جمہور اسلام

کے انتخاب کا نتیجہ اور خلیفہ وقت اپنے تمام قول و فعل کا اس جمہور اور رائے عامہ کے سامنے ذمہ دار ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض منچلے لوگ وسط عربستان کے غایت درجہ کے متعصب اور سخت مسلمان قبائل سے تعلقات پیدا کرنے لگے اور بعض خوارج جیسے حامیان حریت کے ساتھ ہو کر خلافت سے منکر اور انتہائی وضع کے جمہوری نظام سیاست کے مدعی ہو بیٹھے۔

ان کیفیات کا مختصر نتیجہ یہ ہوا۔ کہ خلیفہ آزاد خیال علما سے کشیدہ ہو کر پابند تقلید و قدامت پسند اہل علم کی طرف زیادہ رجوع کرنے لگا۔ اور دوائر حکومت میں شاہ پسند نیم عرب عمال کو حریت کے دلدادہ بادیہ نشین اعرابوں پر ترجیح دینے لگا۔ عباسیوں نے برملا مذہبی آزاد خیالی کی مخالفت کی۔ اب مذہب اور اس کے عقائد ایک مقررہ میزان میں ترتیب دے گئے۔ معتزلہ علما کی چھانٹ چھانٹ کر بیخ کنی شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ بارھویں صدی تک اسلامی لبرل ازم کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اسلامی قلب کے تمام مدخل اور مخرج بند ہو گئے۔ مگر وہ آج کھل رہے ہیں۔

گیارھویں صدی کے ابتدا ہی سے اسلامی تمدن کا زوال بین طور پر نظر آ رہا تھا۔ نیم عربی عمال حکومت اپنی ابتدائی مستعدی اور تنومندی کھو چکے تھے اور اب اُن کی طاقت دوسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی تھی۔ ان کے نئے جانشین ترک تھے۔ ترک قوم اس خانہ بدوش مجموعہ قبائل کی مغربی شاخ ہیں۔ جو زمانہ قدیم سے وسط ایشیا کے وسیع میدانوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔ ان کو مجموعی طور پر یورال۔ الٹائی شاخ نسل انسانی یا تورانی کہا جاتا ہے۔ عرب ان ترک خانہ بدوشوں سے بہت عرصے سے واقف تھے۔ جب ایران کو اسلام نے تسخیر کیا اس وقت مسلمان سالاران فوج نے ان ترکوں کو شمال مغربی حدود ایران پر دھاوا کرتے ہوئے پایا زمانہ عروج خلافت میں ترکوں کا وجود کبھی بھی موجب خوف نہیں ہوا۔ بلکہ مفید ثابت ہوا۔ عام طور پر کند ذہن اور جدت طبع سے عاری تُرک دو خوبیوں کا بہ طریق احسن اظہار کرتے تھے۔ احکام کی اطاعت اور جنگی شجاعت۔ دوسرے لفظوں میں یہ تُرک اعلے درجے کے سپاہی تھے۔ خلفاء نہایت شوق سے ان کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرتے تھے۔

جب تک خلافت کا وجود استوار تھا۔ اس وقت تک یہ تُرک باعث خطر نہ تھے۔ لیکن

جب مرکزی قوت کم ہوتی گئی۔ تو اُن ترکی عساکر کی حالت میں بھی اک گونہ تغیر رونما ہوا۔ یعنی اب وہ بصورت محکوم نہیں بلکہ بطورِ حاکم اپنے افعال کا اظہار کرنے لگے۔ کوئی جگہ اِن کی تاخت سے محفوظ نہ رہی۔ اور ہر جگہ انھوں نے اپنے قبائل کے سرداروں کی قیادت میں پُرانے نظامِ سلطنت اور سلسلہ ہائے معاشرت کو تہ و بالا کرنا شروع کردیا:

تُرک اپنی آبائی بت پرستی کو خیر باد کہکر اب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اور اِس سے اِن کے قومی خصائص میں نمایاں تغیر واقعہ ہُوا۔ لفظ تُرک کے مفہوم میں فرقہ ترکان عثمانیہ شامل نہیں جو آجکل قسطنطنیہ انگورہ اور ایشیا کوچک میں آباد ہے۔ اِس علاقے کے ترکوں میں مغربی اور شرقِ قریبہ کے نسلی امتیازات اِس قدر حلول کر گئے ہیں۔ اور اِن پر یورپی اور خالص اسلامی تمدن نے اِس درجہ اثر کیا ہے۔ کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی خانہ بدوشانہ خصوصیات سے بالکل معرا ہو چلے ہیں۔ باوجود اِس کے وہ آئے دِن اپنی ابتدائی قومی خصائص یعنی فوق العادہ شجاعت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جو اِن کے ترکان بھائیوں میں پائے جاتے تھے:

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ اِن ترکوں کی جبلی خصوصیات کیا تھیں۔ جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ وہ خصائص احکامِ فوجی کی بے چون وچرا تعمیل۔ عدم جدّت و کند ذہنی ہیں۔ اگر وہ کسی جدید خیالات کو قبول کرتے تھے۔ تو اِن کے نزدیک وہ گویا ایک حکم قومی کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے زوالِ عرب کے بعد عنانِ اسلام اپنے ہاتھ میں لی۔

اسلام اور دنیا کے حق میں یہ واقعہ ایک معنی خیز واقع تھا۔ بالخصوص جبکہ اِن کی فوجی شہامت اب اِسلام کی خدمت کے لئے وقف تھی۔ اِن جنگجو ترکوں کا پہلا کام فتح ایشیائے کوچک و یورشلیم تھی۔ جو گیارھویں صدی میں واقعہ ہوئی۔ اُس وقت تک ایشیائے کوچک عیسائیت کے زیرِ نگین تھا۔ اسلام کا پہلا حملہ عربوں کے ذریعہ سے ہوا۔ مگر اس کی انتہائی حد سلسلہ کوہ طارس تک رہی اور اس کے بعض حکومت بازنطینیہ نے اپنی حالت کچھ نہ کچھ سنبھال لی۔ گاہے گاہے سرحدی ریل پیل ہوتی رہی۔ مگر نہ اِسقدر کہ عام حالات میں کچھ تبدیلی ہو سکے۔ اب ترکوں نے اِس مزاحمت کا خاتمہ کر دیا۔ اور خود قسطنطنیہ کو معرض خطر میں ڈال دیا۔ یورشلیم تو ۶۳۷ء سے ہی مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ مگر حضرت

عمرؓ نے عیسائی مقامات مقدسہ کا پورا ادب ملحوظ رکھا۔ اور اس کے جانشینوں نے عیسائی زائروں پر جو تعداد کثیر میں مختلف اطراف و جوانب سے وہاں جمع ہوتے تھے۔ کسی قسم کا ظلم یا تعدی روا نہ رکھی۔ اور گو ترکوں نے اس پالیسی کو نہ بدلا۔ مگر یورپ میں پاپائے روما اور کلیسیہ کے اختیار تمام نے جاہل عیسائیوں کے دلوں میں انتقام کے جذبات مشتعل کرنے شروع کئے اس کا اثر عیسائی دنیا پر بہت ہی گہرا پڑا۔ مغربی پرستاران عیسویت جو اس زمانے میں جوش مذہبی میں ڈوبے ہوئے تھے فرط جذبۂ جہاد سے لبریز رہے تھے۔ پطرس راہب اور اس کے پرجوش مجاہدین کا نعرۂ جہاد یورپ کی سرزمین کے چپہ چپہ سے گونجا۔ اور تعصب مذہبی سے چور لکھوکھا صلیبی جانباز ایک سیل عظیم کی صورت میں اس حیرت انگیز کشت و خون صلیبی کیلئے جس کا نام تاریخ میں محاربات صلیبی ہے۔ مشرق اسلام پر اُمنڈ پڑے۔

ترکوں کی فتح اسلام اور اس کی صدائے بازگشت محاربات صلیبی دنیا کے لیے آلام تہذیب کا باعث ہوتے ہیں۔ انہوں نے مشرق اور مغرب میں کچھ عرصے کے لئے بُعد عظیم پیدا کر دیا۔ سنہ ۱۰۰۰ء میں اسلامی۔ عیسائی تعلقات خاصے دوستانہ تھے اور ان کی بہتری کی اُمید دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اسلام کی ابتدائی مہمات کی یاد دلوں سے جا رہی تھی۔ فریقین کی حدود فاصلہ قریب قریب مستقل طور پر مقرر ہو چکی تھیں۔ اور ان کو پامال کرنے کی کوئی خواہش کسی فریق میں ابھی نہیں آئی تھی۔ اگر کوئی رقابت واقعی تھی۔ تو وہ ہسپانیہ میں تھی۔ جہاں عیسائی اور مسلمان ہمیشہ باہم پڑوسی بن کر امن سے رہتے تھے۔ مگر وہاں کے واقعات قدرتی طور پر ایک سرحدی مخاصمت سے بڑھ کر نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان بین دینی ترقی پر تھا۔ اگر یہ تعلقات پُرامن طریقہ سے قائم رہتے۔ تو خدا جانے کیسی کیسی برکات کا موجب ہوتے اسلامی دنیا اس وقت تک مغربی دنیا سے تمدن و تہذیب میں کئی درجے بڑھی ہوئی تھی اور گو یورپ کے عیسائی اس وقت وحشی۔ جاہل اور بربری خصال تھے۔ مگر آنے والا زمانہ ان کی امیدوں کو ابھار رہا تھا۔ اور ترقی کی راہ میں بسُرعت گامزن ہونے کے شوق میں تھے۔ اگر گیارھویں صدی کا اسلامی عیسائی ارتباط قائم رہنے پاتا۔ تو یقین واثق ہے۔ اُس کا اثر ایشیا و یورپ دونوں براعظموں پر پڑتا مغرب

میں اسلامی تہذیب کے ذریعہ سے جس میں رومی اور یونانی تمدن قدیم کے جوہر ملے ہوئے تھے۔ مغربی قوموں کا احیا بہت جلد ہوتا اور مشرق بھی قرون وسطے کی یورپی بیداری کے تاثرات سے محفوظ ہوتا اور اس فالج سے بچ جاتا جو آہستہ آہستہ اپنا مہلک اثر اس کے رگ وریشہ پر ڈال رہا تھا۔

مگر یہ تقدیر میں نہ تھا۔ تہذیب کے دشمنی اہل یورپ اب جوع الارضی کی مرض میں مبتلا ہونے والے تھے۔ بنابریں ان کے اور اہل ایشیا کے تعلقات کا دلپذیر رہنا کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔ مشرق اور مغرب کا تصادم جو ایک مدت دراز تک قائم رہا اب گویا دو متضاد اصولوں کی جنگ تھی جن میں سے ایک تو اصول تمدن مغربی جس کی اساس جوع الارضی پر تھی۔ اور دوسرا اصول تمدن مشرقی جو مساوات اور روحانیات پر مبنی تھا۔ محاربات صلیبی فی الحقیقت ان دو اصولوں کے مخالفانہ حملے تھے۔ جو ایک زمانے تک پے درپے ہوتے رہے اور مشرقی قوا کی کامیابی کے نکتہ نظر سے ۱۶۸۳ء میں ویئنہ کے دیواروں کے نیچے جا کر ختم ہوئے۔ مگر یہ اس تصادم کا خاتمہ نہ تھا۔ اب مشرق ضعیف ہوچکا تھا۔ اور آئندہ کے ہر ایک حملے میں اہل مغرب کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ ان صدیوں کے باہم تنازعات کا ایک بد نتیجہ یہ پیدا ہوکہ فریقین کا تعصب انتہا درجہ تک بڑھ گیا۔ جس کا زہر عین زمانہ حال کے۔ عیسائی۔ اسلامی معاملات میں سرایت کرچکا ہے۔ انگورہ کے ترکوں کے مصائب اور یونانیوں کے مظالم مسلمانوں پر محض امن جنگ کی صدائے بازگشت ہیں۔ جو صلیب پرست مجاہدین اور ترکوں کے درمیان ہوتی رہی ہو

مگر اس کتاب کی غرض یہ نہیں کہ اس خونین داستان کو دھرایا جائے۔ یہ حوالہ صرف یہ دکھانے کے لئے دیا گیا ہے۔ کہ ان جنگوں نے مشرق اور مغرب کے درمیان دائمی بُعد پیدا کردیا ہے۔ مسلمانان مشرق کا تمدن اس کے علاوہ اب ایک اور حملے کا نشانہ بھی بنا۔ اور اس حملے کی ابتدا تورانی قوم سے ہوئی۔ بارھویں صدی کے اختتام پر تورانی نسل کی مشرقی اقوام کو ایک پرہیبت اور جبری سردار نے جس کا نام چنگیز خان ہے۔ متحد کرکے دنیا کو لوٹنے کا قصد کیا۔ سب سے پہلے اس نے شمالی چین پر چڑھائی کی۔ جس کو اس نے بالکل تاراج کر ڈالا۔ اور اس کے بعد مغرب کی طرف توجہ کی۔ اس وحشی اور تندخو کی ہیبت اسکے

دشمنوں پر اس قدر چھا گئی تھی۔ کہ اب تک متمدن دنیا میں اس کا نام نہایت حقارت سے لیا جاتا ہے۔ چنگیز خاں کی فوجوں کے ساتھ تربیت یافتہ چینی انجینئر تھے۔ جو بارود کا استعمال جانتے تھے۔ اور قلعہ بند شہروں پر کامیابی سے حملہ آور ہوتے تھے۔ منگول تاریخ کے مہیب ترین وحشی لٹیرے کہے گئے ہیں۔ اِن کا مقصد ملکوں کی تسخیر نہ تھی۔ بلکہ محض قتل و غارت جہاں کہیں اِن کی ٹڈی دل اُترتا تھا۔ شہریوں بستیوں اور مرد و زن کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اور اس کے بعد یہ منگول تازہ مقامات کا رخ کرتے تھے۔

مغرب کا رخ کرنے کے چند سال بعد چنگیز خاں مر گیا۔ لیکن اس کے جانشینوں نے اس کی پالیسی کو جاری رکھا۔ کیا مسلمان اور کیا عیسائی دونوں قوموں پر منگولوں کے حملے ہوئے۔ مشرقی یورپ کا صفایا ہو گیا اور وہاں کے عیسائی قعرِ جہالت میں دھکیل دیے گئے۔ جس کا اثر آج تک روسی قوم کی بربریت میں پایا جاتا ہے۔ مگر یورپ سے کہیں بڑھ کر اسلام کو اِن حملوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ منگول پولینڈ سے آگے کبھی نہیں بڑھے۔ بدیں وجہ مغربی تمدنی مرکز اِن کے تباہ کن اثر سے محفوظ رہا۔ مگر مسلمانوں کی تقدیر ایسی نہ تھی۔ منگول شمال مشرقی سمت سے طوفان صرصر کی مانند اٹھے اور ہندوستان سے تا بہ مصر ساری اسلامی دنیا کو تاراج کر گئے۔ ایران کا تمدن ابھی ترکی حملوں کے صدموں سے سنبھلنے نہیں پایا تھا۔ کہ منگول آفت نے اُسے آد بایا۔ اب اسلام کے مرکز علوم و فنون و مدنیت کی باری آئی۔ گو بغداد کا دورِ رشیدی ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی وہ شان نہ رہی تھی۔ جو دنیا بھر میں افسانہ ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی وہ مقام خلافت تھا۔ اور اسلامی ذہنی اور دماغی عظمت کی زندہ یادگار تھا۔ ۱۲۵۸ء میں منگولوں نے اس پر حملہ کیا۔ اور کیا مرد کیا عورتیں۔ مال۔ املاک غرضیکہ ہر ایک چیز کو نیست و نابود کر دیا۔ مگر بغداد صرف مرکز خلافت ہی نہ تھا۔ وہ عراق کا صدر مقام بھی تھا۔ جہاں دنیا کے دو دریاؤں کے درمیانی وادی کو ایک نیم فراموش شدہ قوم نے سالوں کی محنت اور کوشش کے بعد بہشت عدن کی صورت دی تھی اور زمین کی آبپاشی کے لئے عجیب و غریب سلسلہ آبرسانی پیدا کیا تھا۔ یہ عراق مختلف حکومتوں اور بادشاہوں کے زیرِ نگیں رہا۔ مگر کسی نے اِن تاریخی یادگاروں کو بے حرمت نہ کیا۔ منگولوں نے اِن تمام وسائل فلاح و مدنیت کو ایک ایک کر کے

توڑا اور ملک کو بھوکا اور ننگا کر کے اس کی وہ حالت کر دی ۔ جو ترکی سیادت کی ابتدا میں تھی۔ یہ خطہ زمین جو کسی زمانے میں گہوارہ شائستگی کہلاتا تھا ۔ اب ایک بے غیرت اور وحشی خانہ بدوش نیم عربی قوم کا مسکن ہو گیا ہے ۔ جس میں وہ اپنی بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑوں کی مرطوب دلدلوں اور خشک بیابانوں میں گلہ بانی کرتے ہیں۔

بغداد کی تباہی مسلمانوں اور ایشیا کے لئے ایک مصیبت عظیم تھی ۔ مگر یہ بدقسمتی تنہا نہیں آئی ۔ اپنے عروج کے ابتدائی سالوں میں مسلمان شمالی افریقہ پر سے یلغار کرتے ہوئے ہسپانیہ میں پہنچے تھے ۔ جہاں اسلام کے قدم مضبوطی سے جم چکے تھے ۔ اسلامی ہسپانیہ کا مرکز قرطبہ تھا ۔ جہاں مسلمانوں نے ترقی و تمدن کے وہ مدارج حاصل کئے ۔ کہ عظمت میں بغداد سے بھی بڑھ گئے ۔ مگر عیسائیان ہسپانیہ کب آرام سے بیٹھنے والے تھے ۔ صدیوں تک مسلمانوں نے اُن کی وحشت اور بربریت کے طوفان کو شمال ہسپانیہ کی خشک اور سنگلاخ پہاڑیوں میں بند رکھا ۔ مگر ان کی آپس کی خانہ جنگیاں دنیا کے لئے نئی لعنت کا سامان اور مصیبت پیدا کر رہی تھیں ۔ ۱۲۱۲ء کی جنگ لاس ناواس ڈی ٹولوسا میں مسلمانوں نے شکست پائی ۔ اور یہ واقعہ ان کی تباہی کا پیش خیمہ ہو گیا ۔ اس کے بعد جلد ہی مسلمان قرطبہ کھو بیٹھے اور ہسپانیہ کے عیسائی وحشیوں نے ان کے تمدن اور سامان تہذیب و عشرت کے ساتھ بعینہ وہ سلوک کیا جو منگولوں نے بغداد کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا ۔ مسلمان چندے غرناطہ میں رُکے مگر اس کا اثر ان کی حالت مجموعی پر کچھ نہ پڑا کیونکہ اسلامی تمدن یورپ کا خاتمہ تو فتح قرطبہ کے بعد ہی سے شروع ہو چکا تھا۔

منگول حملوں کی لہریں ہر دوسرے تیسرے اٹھتی رہیں اور مسلمانان ایشیا کی تباہی کا موجب ہوتی رہیں ۔ اس حملے کی آخری لہر تیمرلنگ فاتح کی صورت میں اٹھی ۔ اور ہر جگہ موت اور تباہی چھوڑ گئی ۔ اس وقت تک مغربی منگولوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اس واقعہ نے دنیا میں ایک اور اسلامی قوم پیدا کی ۔ منگول حملوں کے خاتمے پر برباد و فلاکت زدہ دنیائے اسلام ترکان عثمانی کے زیر حکومت آئی ۔ یہ قوم اُن گروہوں کا پس ماندہ حصہ تھی ۔ جو شکست حکومت قسطنطنیہ کے بعد ایشائے کوچک میں پہنچی تھی

اِن کی کامیابی کی وجہ زیادہ تر اِن کے سلاطین کا تدبّر اور ہوشمندی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اِن کی قبولیت اسلام جس نے مختلف ترکی قبائل کو متحد کرکے ایک مضبوط اسلامی سلطنت کی بنیاد کے سامان پیدا کر دئے تھے۔ اب اِس سلطنت کو مشرق اور مغرب میں اپنی طاقت بڑھانے کی آرزو ہوئی۔ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے فتح قسطنطیہ سے بازنطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس سے سو سال کے اندر ایران سے مراقش تک اپنا سکّہ جمالیا۔ اور جزیرہ نما بلقان کو تسخیر کرکے وینا کے دیواروں سے جا ٹکرائے۔ گو ترک منگولوں کے عم زاد بھائی تھے۔ مگر دانائی تدبر اور تمدن میں اِن سے کہیں بڑھ کر تھے۔ بنا بریں انہوں نے اپنی فتوحات کو ایک مستحکم سلطنت کی صورت بخشی اور اگر بوجہ جبلی کند ذہنی ہر قسم کی ترقیات زمانہ سے اِستفادہ نہیں کیا۔ تو کم از کم اپنے صیغہ حرب کو بہمہ وجود مکمل اور منتظم رکھا۔ اِس لئے اِن کے عروج کے زمانے میں اِن کا توپخانہ اور اِن کی پیارہ پا دنیا کی بہترین سپاہ گنی جاتی تھی۔ اور یورپ اِن کے نام سے کانپتا تھا۔

مگر اب یورپ کا زمانہ بیداری شروع ہو چکا تھا۔ ایک طرف اسلام منگولی صدموں کا نشانہ بن چکا تھا۔ اور دوسری طرف یورپ احیاء مدنی و مکاشفات راہ بحری امریکہ و ہندوستان جیسے تغیر انگیز واقعات سے حوصلہ افزا کمالات کا منبع و مرکز بنا ہوا تھا جس وقت کولمبس اور واسکوڈی گاما نے امریکہ اور ہندوستان کے بحری راستے دریافت کئے اُس وقت پر تمدن مغربی وسط یورپ میں دبا ہوا تھا اور تعصب اور جہالت کی طاقتوں سے زور آزما ہو رہا تھا۔ روس منگولوں تاتاروں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ اور ترک جن کی جنگی طاقت شباب پہ تھی یورپ کی ہستی کا خاتمہ کئے دیتے تھے۔ افریقہ۔ مشرق اور مشرقی یورپ ہر سہ سمت سے یورپ نرغے میں آیا ہوا تھا۔ اور اس کے پشت پناہ اب صرف دیوار آب یعنی سمندر ہی رہ گئی تھی۔ ایک طرف منگولی دیو مہیب دوسری طرف بحر محیط۔ اِن دونو کے درمیان یورپ کی نوخیز توتیں پھنسی ہوئی تھیں۔ ایک چشم زدن میں فضائے آب شاہراہ ترقی ہو گئی۔ اور یورپ ملکہ بحر سے ملکہ بر و بحر ہو گئی۔

یہ عجیب و غریب سانحہ دنیا کے نہایت پُراثر واقعات سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ یورپ

سدھے ہوئے کار آزمودہ ایشیائی جانبازوں کا آمنے سامنے کا مقابلہ باُمید کامیابی ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب اسے جانب سے مار کرنے کا موقع ملا۔ رخت حرب کی طرف سے یورپ اب بے خطر ہو بیٹھا تھا۔ کیونکہ قسمت نے سمندری دولت کے خزانوں کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں رکھ دیں نئی ایجادات نئی دریافتیں آئے دن ہونے لگیں۔ اور یورپ کا بچہ بچہ اب ان دولتوں سے مالا مال ہونے لگا۔ جن کے ذریعہ سے تمدن و عشرت کے دروازے کھل گئے۔ اور ایشیائی حملہ آوروں کا ہراس اس کے دل سے جاتا رہا۔ بھلا کہنہ محدود ایشیائی سازو سامان اس گنج بے پایاں کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ جو جدید مغربی اختراعات اور نئے مقبوضات سے یورپ کی قومیں حاصل کر رہی تھیں۔ اس ابتدا سے یورپ اعلےٰ مدارج کو طے کرتا ہوا سائنس کی مدد سے قرون وسطیٰ کی نحوست کو الگ کر تجلیٔ جدید کے روز روشن میں آپہنچا:

مگر ویانے ناکامی پر مسلمانوں کی خواب خرگوش نہ کم ہونی تھی پر نہ ہوئی۔ وہ تمدن بلکہ کی بوسیدہ دھجیاں پہنے رہے۔ حتیٰ کہ ان کی جنگی مستعدی بھی مفقود ہو گئی۔ کیونکہ رہے سہے اسلامی وقار کے محافظ ترک سست اور آسائش پسند ہو گئے۔ کچھ دنوں تک ترکی ہیبت یورپی حملوں کی مانع ہوئی اور مغربی قومیں اپنی چھوٹی چھوٹی جنگوں میں لگی رہیں لیکن ویئنا کی دیواروں کے سامنے ۱۶۸۳ء کی شدید ترکی شکست نے شرقی کھوکھلے پن کا راز افشا کر دیا۔ اب ترک آئے دن یورپی طاقتوں سے ستائے جانے لگے۔ اور ان کی سلطنت محض یورپ کے آپس کے عنادوں اور رقابتوں کی وجہ سے بچی رہی نہ کہ اپنے زور بازو سے۔ مگر اس مغربی حملے کا بوجھ مشرق پر اُسوقت گراں معلوم ہونے لگا۔ جبکہ انیسویں صدی کا آغاز ہوا۔ اٹھارویں صدی بھر یورپ کیا مشرق اور کیا مغرب سب طرف سے اسلامی سلطنتوں پر ماریں کرتا رہا۔ مگر اس کا معتد بہ نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ باوجود اس کے اسلامی دنیا کو ہوش نہ آئی۔ اور اس کی سستی اور فلاکت دن بدن بڑھتی رہی۔ اس کے لئے ہر ایک قسم کی ترقی کفر تھا۔ ہر مصیبت کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور پس و پیش کی جدید تحریکات کی مطلق پروا نہ کی +

انیسویں صدی کا یورپ یورپ قدیم نہ تھا۔ قدرت کے بیش بہا اسرار اس کے

دماغ میں تھے۔ بر و بحر کی دولت کے خزانے اِس کے قبضہ قدرت میں تھے۔ دنیاوی اطلاع کی حرص اس کی سوح رواں تھی۔ خشک اور بوسیدہ اسلامی تجربے نے اِس یورپ کو اپنا مدِ مقابل پایا۔ اِس کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ ایک ایک کر کے مسلمانانِ عالم کے حصے بخرے ہو گئے۔ انگلستان ہندوستان اور مصر دبا بیٹھا۔ روس قفقاز سے بڑھ کر وسط ایشیا کا مالک ہو گیا۔ فرانس نے شمالی افریقہ اپنی جائداد بنا لی اور دیگر یورپی سلطنتوں نے باقی ماندہ دنیائے اسلام کو ہضم کر لیا۔ جنگِ عظیم کے خاتمے پر مسلمانوں کی رہی سہی طاقت سلب کر لی گئی۔ عہد نامہ سیور کے رو سے ترکی سلطنت کو قطعی نابود کر دیا گیا۔ اور از روے تحریر ایک بھی اسلامی سلطنت ایسی نہ رہی جسے حقیقی معنوں میں خود مختار اور آزاد کہا جا سکے۔

مگر واقعات ظاہر کرتے ہیں۔ کہ یہ فقدانِ آزادی اسلام صرف کاغذی حقیقت ہے۔ کیونکہ یورپ کی عین کامل فتح و کامیابی کی ساعت میں مسلمانانِ مشرق نے ایسا اٹھا بیداری و احتجاج کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے کبھی نہیں کیا۔ اِن سو سالوں میں جبکہ اسلامی جسم کی قطع و برید ہو رہی تھی۔ اسلامی جماعت کے دِل و دماغ میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہو رہا تھا۔ مغربی ظلم اور چیرہ دستی نے آخر کار غیر متحرک مشرق کے لاشے میں جان پھونکی اور آخر وہ عجیب و غریب حالات پیدا ہوئے۔ جن کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کم و بیش ۲۵ کروڑ پیروانِ دین اسلام کے دِلوں میں مراقش سے تا بہ چین اور ترکستان سے لیکر کانگو تک ایک نیا جذبہ رو نما ہوا۔ نہایت موزون طور سے اِس نئی تحریک کا پہلا لمعہ سرزمین عرب میں چمکا انیسویں صدی کے آغاز میں اِس سرزمین سے ایک نئی تحریک یعنی "وہابی" تحریک کی ابتدا ہوئی۔ جس سے احیاء مسلمین کا خواب پھر دکھائی دینے لگا اور اتحاد مسلمین ایک ممکن مسئلہ معلوم ہونے لگا۔ اِس جذبہ اندرونی کی معاون بہت سی خارجی تحریکات بھی ہوئیں۔ مثلاً۔ حکومت مشروطہ۔ وطنیت۔ سائنٹیفک تعلیم۔ صنعتی جدوجہد۔ اور اِن کے علاوہ ایسے مسائل جیسے مسئلہ نسوان۔ اشتراکت بلشویت اِن عجیب و غریب احساسات سے اور مغربی سیاسی

چیرہ دستیوں سے متاثر ہو کر دنیائے اسلام عملی اور منتجہد زندگی کے میدان کی طرف بڑھنے لگی۔ جنگ نے ایک تلاطم عظیم برپا کر دیا ہے۔ اور آج اسلام نہایت ہی قوی جذبات کے زیر اثر ہے۔ جس کا بدیہی نتیجہ ایک جدید دنیائے اسلام ہو گا۔ وہ جذبات اور وہ احساسات کیا ہیں جو زمانہ حال کی دنیائے اسلام کے محرک ہیں؟ کتاب کے پیش آئندہ ابواب میں اِس دلچسپ سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب اول

احیاء اسلام

اٹھارھویں صدی کے اخیر تک مسلمان حد درجہ کے تنزل کو پہنچ چکے تھے۔ دنیا کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک ہر جگہ ان کی فلاکت و درماندگی عیاں تھی ان کی معاشرت اور ان کا اخلاق زائل ہو چکا تھا۔ اسلام کی ابتدائی رونق اور عظمت کی بجائے اب معدودے چند خوشحال رہ گئے اور لاکھوں خستہ و بے حال ہو گئے تھے۔ ان کے علم و ہنر کا خاتمہ ہو گیا تھا اور چند مدارس جو ان کے دورِ سابقہ کی یادگار تھے۔ اب قوت زیست کے محتاج نظر آتے تھے۔ گو سلاطین ترکی و شاہانِ مغلیہ ہندوستان برسرِ اقتدار تھے لیکن یہ محض دکھاوا تھا۔ فی الحقیقت مرکزی نظام مفقود ہو چکا تھا۔ اور سلطنت کی باگیں خود سر اور مطلق العنان صوبہ داروں اور باشاؤں کے ہاتھوں میں تھیں۔ ملکی انتظام اور امن عام قزاق سرغنوں کی دست برد سے خاک میں مل چکا تھا۔ شہری آبادی اور دیہاتی زراعت پیشہ لوگوں کے کاروبار ملکی بدامنی کی وجہ سے برباد ہوئے جا رہے تھے۔ مذہب کی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔ محمد عربیؐ کی خالص توحید پر مضحکہ انگیز رسومات و بدعات کا پلستر چڑھا ہوا تھا۔ مساجد و معابد کی بے رونقی اور غیر آبادی موجودہ زمانے کے جاہل اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کی روحانی پستی پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی تھی۔ جنہوں نے سچے اسلام کی سادہ تعلیم چھوڑ کر اب پیر پرستی اور قبر پرستی پر اپنا ایمان رکھ چھوڑا تھا۔ خدائی برکات و فضل کا ذریعہ ان کے خدا فراموش اور مذہب فروش فقیروں سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے گنڈے تعویذ بن گئے تھے۔ قرآن کی تعلیم کو بھول کر خاص و عام شراب خوری اور بداخلاقی کی قبیح عادتوں میں مبتلا تھے۔ اور تو اور خود اسلام کا مرکز و منبع شہر مکہ معظمہ

میں ایسی مایوس کن تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ حال سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ اگر رسول عربی ؐ ایسے وقت میں دنیا میں نازل ہوتے۔ تو یقین واثق ہے۔ وہ دین حنفہ کے نام نام لیواؤں اور بدترین ملحدین اور بت پرستوں میں کچھ بہت بڑا تفاوت نہ پاتے۔

لیکن عین اِس ساعت نکبت و فلاکت میں گہوارہ اسلام یعنی صحرائے عرب سے ایک ندا اٹھی۔ جسنے جملہ عالم اسلام کو چونکا دیا۔ یہ آواز اسلامی مصلح شیخ عبدالوہاب کی تھی جس نے مسلمانوں کو ان کی روحانی پستی سے نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اِس واقعہ سے اصلاح مسلمین کا آغاز ہوتا ہے۔

شیخ عبدالوہاب وسط عرب یعنی خطہ نجد میں ۱۶۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ جو اب تک ہر قسم کی غیر اسلامی بدعات سے محفوظ رہا تھا۔ اور اِن لوگوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ جو خلفائے بغداد کی مکروہ کارروائیوں سے متنفر ہو کر عرب کے وسیع میدانوں میں اپنے گھر بنا کر رہتے تھے کسی خلیفہ یا سلطان کی ہمت نہ تھی کہ اِن حریت پسند اسلام شعار پاکبازوں کے حصاروں میں گھسنے کی کوشش کرتا۔ جہاں انکی تواضع کے لئے جانستان عربی نیزے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ عرب کسی طاقت کی سیادت قبول نہ کرتے تھے۔ اور اپنے اونٹوں اور گلوں کو لئے لق و دق نخلستانوں میں گھومتے رہتے تھے۔ اور حقیقی اسلامی اور معاشرتی سادگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بادیہ نشین اعراب اپنے شیوخ کے زیر فرمان تھے۔ اور نخلستانوں کے رہنے والے بعض قبائل اپنے قائدین کی سرکردگی میں زندگی گذارتے تھے۔ باوجود اس کے اِن کے شیوخ اور اِن کے سرداروں کو ہمیشہ مقررہ رسم و رواج کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ اور رائے عام کا نہایت ہی شدت سے احترام کرنا ہوتا تھا۔ گو ترکوں نے حرمین مقدسہ اور بحر احمر کے ساحلی مقامات پر اختیار حاصل کر لیا تھا۔ مگر نجد اور اس کا صحرا بایاں اِن کی حکمرانی سے باہر تھا۔ عربوں کے لئے کسی قسم کی بدعت مذہبی یا معاشرتی نہایت ہی ناخوش آئیندہ تھی۔ اور انہوں نے طریق حیات کو اسلام کے ابتدائی اصولوں پر قائم کر رکھا تھا۔

شیخ عبدالوہاب اِن حالات کے درمیان عالم حیات میں آئے۔ یہ شیخ ممدوح فطری طور

پرخاموش اور غائر طبیعت کے واقع ہوئے تھے۔ اور بہت جلد اِن کی شہرت علم وفضل و پارسائی نے ابن عرب کو مسخر کر لیا۔ بعمر شباب مکہ معظمہ کا حج کیا اور اس کے بعد مدینہ میں کچھ سالوں تک تحصیل علوم کا شغل رکھا اور اس کے بعد نجد کو واپس آئے۔ اِن کے دل میں مسلمانوں کی بدعات و تخریبات سے رہ رہ کر غصے کی لہریں اُٹھتی تھیں۔ اور انہوں نے تہیہ کر لیا۔ کہ حتہ المقدور لوگوں کو اس غیر مسلم زندگی سے باز رکھنے کی کوشش کرینگے۔ انھوں نے سارے عربستان میں دورے کئے۔ اور لوگوں کو عہد اصحابہ کرام کی سی اسلامی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی۔ اس میں ان کو بے حد کامیابی ہوئی حتیٰ کہ وسط عرب کے قوی ترین قبیلہ بنی سعود کا سردار محمدؐ والی نجد اِن کی مشن کا حامی ہو گیا۔ اس واقع نے شیخ عبدالوہاب کی کوششوں میں چار چاند لگا دئے۔ عرب کے مختلف قبائل آ کر اس کی حمایت کرنے لگے جن کو انھوں نے رسول اکرم کے زمانے کی سی اخوت میں منسلک کر لیا۔ فی الحقیقت شیخ عبدالوہاب حضرت عمرؓ و حضرت ابو بکر جیسے خلفائے راشدین کے مماثل تھے۔ جب ۱۷۶۵ء میں شیخ ممدوح کا انتقال ہوا تو ان کا معاون شیخ سعود ان کا قابل جانشین ثابت ہوا۔ نجد کی نئی وہابی حکومت منین اوائل کی خلافت مکہ کے مشابہ تھی۔ گو شیخ سعود کی جنگی طاقت خاصی تھی۔ لیکن اُس نے اپنی رعایا کی آزادی پر کبھی بھی دست تعدی دراز نہیں کیا۔ طریقِ حکومت کسی قدر سخت تھا۔ لیکن خالص انصاف پر مبنی نجد اور وہابی نجح نہایت عالم ہوشیار اور کمال درجے کے معدلت گستر تھے۔ عمالان حکومت نجد کی حسن کارکردگی سے چوری اور قزاقی قطعاً نابود ہو چکی تھی ترویج و تشویق تعلیم کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا ہر ایک نخلستان اور ہر ایک بستی میں سکول قائم کئے گئے تھے۔ اور معلین دور دور مقامات پر اعراب بدوی کی اصلاح کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ امارت نجد کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر امیر سعود کو اب اصلاح دنیائے اسلام کا خیال پیدا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے حرمین مقدسہ کی طرف رجوع کیا۔ اور انیسویں صدی کے ابتدا ہی میں اس مہم کو کامیابی کے ساتھ ختم کیا۔ ان نجدی حامیانِ دین حق کے سامنے کسی کی طاقت کیا کوئی بھی طاقت ٹھیر نہیں سکتی تھی۔ وہ ترک سلاطین کے استبداد کے جانی دشمن تھے۔ اور اس امر کے مدعی تھے۔ کہ سیادتِ اسلام کی باگ صرف مساوات پسند لوگوں کے ہاتھ میں رہے۔ ان کے سلسلہ فتوحات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اعراب نجد تمام مشرق میں پھیل کر ایک ہی حرکت میں اصلاح مسلمین کا اہتمام بالشان کام سرانجام دینے والے ہیں۔

لیکن قسمت کھڑی ہنس رہی تھی۔ وہابیوں کے مقابلے کی تاب نہ لاکر سلطانِ روم نے اپنے ذی قدرت نائب محمدؐ علی انکی سرکوبی کا حکم دیا۔ یہ ایک البانی الاصل ترکی سردار تھا جو محض سیاسی تدبر اور کامیاب حکمت عملی سے مصر کا حکمران بن گیا تھا۔ یورپی طریقِ حرب کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اس نے مغربی افسرانِ جنگ کی مدد سے ایک فوج جرار ترتیب دی تھی۔ اس فوج کی تربیت جو البانیہ کی جفاکش مسلمان پہاڑی اقوام سے بھرتی کی گئی تھی۔ مغربی طریق پر کی گئی تھی۔ اور جدید اسلحہ سے آراستہ تھی۔ محمد علی پاشا نے نہایت خوشی سے سلطان کے حکم کی تعمیل کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ نجد کے سادہ لوح مگر پُرجوش جنگجو آخر گولیوں کے بوچھاڑوں اور توپوں کے گولوں کے نیچے دب گئے۔ الغرض حرمین مقدسہ پر پھر ترکی قبضہ ہو گیا۔ اور نوزائیدہ وہابی سیاسی مشن کا خاتم ہو گیا ہ

لیکن وہابی روحانی مشن کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ اس واقعہ کے بعد بھی نجد روحانی تحریکات کا مرکز بنا رہا۔ جس کا اثر آج کل دنیا کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے۔ خود مکہ معظمہ میں یہ اثر یہاں تک پھیل گیا تھا۔ کہ حجاج جو ہر سال ہر چہار اطراف عالم حج کے لئے آتے تھے۔ داعیانِ وہابی کی پرجوش تلقین سے متاثر ہو کر واپسی پر اپنے اپنے ملکوں میں وہابیت کے پرجوش واعظ بن جاتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہابی تحریک کی صدائے بازگشت دنیاء اسلام کے مختلف حصوں سے آنے لگی۔ شمالی ہند میں مولانا سید احمد نے پنجاب کے مسلمانوں کو اس قدر تلقین کی کہ کر دیا۔ کہ انہوں نے شمالی ہندوستان میں ایک مذہبی حکومت کی بنیاد ڈال ہی دی تھی۔ اگر مولانا ممدوح داعیٔ اجل کو لبیک نہ کہہ جاتے۔ گو ان کی موت کے بعد سکھوں نے ۱۸۳۱ء میں وہابیت کا پنجاب کا خاتمہ کر دیا۔ مگر یہ تحریکات اسقدر دیرپا تھی۔ کہ انگریزوں کو فتح پنجاب کے بعد وہابیوں نے کچھ کم تکلیف نہیں دی۔ ہندوستان سے تو وہابیت کا رخصت ہو گئی۔ مگر افغانستان اور قبائل سرحدِ ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے غیر مسلم طاقت کا جانی دشمن بنا گئی۔ اسی زمانے میں نامور سید محمد بن سنوسی الجزائری مکہ معظمہ آئے۔ اور وہابی اُصولوں سے متاثر ہو کر سلسلہ سنوسیہ کی بنیاد رکھی۔ میری رائے میں تحریک بابی جو سلسلہ وہابیہ سے بظاہر بالکل بے تعلق معلوم ہوتی ہے۔ فی الحقیقت اسی وہابی رو کا ایک عکس ہے۔ اور زمانہ حال کی عام تحریک اتحاد مسلمین یا "پان اسلامزم" اسی وہابی ازم کے تخم کا شجر بہ اثمار ہے۔ جس کا اصل مقصد احیا مسلمین ہے۔ اس تحریک کے سیاسی پہلو پر

باب دوم میں بحث ہوگی۔ اور فی الحال عام تحریک احیاء اسلامی کے مذہبی اور معاشرتی مظاہرات تک سلسلہ بیان کو محدود رکھا جائیگا۔ وہابی تحریک فی الحقیقت ایک تحریک اصلاح تھی۔ اس کا اصلی نصب العین مسلمانوں کو مخرب الاخلاق بدعات سے ہٹا کر اصلی اور حقیقی اسلام کی طرف لانے کا تھا اور یہ کہ نبی اوسے کے بعد جو کچھ فاسد عقاید و رسومات مثلاً پیر پرستی توہمات مسلمانوں کی روز مرہ کی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی بیخ کنی کیجائے۔ رسول اکرم کے سادہ ایمان اور سادہ زندگی کی تلقین بمطابق تعلیم اسلام اس کا خاص مقصد تھا۔ وہابی مصلح خالص اسلامی زندگی و ادائیگی فرائض اسلام مثلاً روزہ نماز وغیرہ کے اشد درجہ حامی تھے۔ حتیٰ کہ ریشمی لباس کا استعمال خورد نوش کی بے اعتدالی۔ استعمال قہوہ اور تمباکو و دیگر مصرفیات کو حرام گردانتے تھے۔ معاشی اظہار شان و شکوہ مثلاً عمارات کو برا سمجھتے تھے۔ بنا بریں انہوں نے تسخیر حجاز کے بعد رسول عربیؐ کے روضہ اطہر کے سر بفلک میناروں کو شہید کر دیا تھا۔ میرے رائے میں وہابیوں کا حد درجہ کا مذہبی تعصب باوجود ان کی اخلاقی پاکیزگی کے کلیتاً اسلام کے لئے موجب رحمت نہ تھا۔ اور اسے اسلام کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے۔ کہ ان کی سیاسی طاقت میں تنزل آنے کے بعد انکی کوششیں صرف مذہبی معاملات کی اصلاح تک محدود رہ گئیں ؎

اسلام کے بعض نکتہ چین وہابیوں کی ان کوششوں کو اسلام کی درماندگی کی دلیل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب اسلام میں ترقی کی صلاحیت نہیں ہے یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہر ایک تحریک اصلاح مذہبی کے اوائل مدارج میں مذہب کو ہمیشہ اس کے زمانہ ابتدائی کی سادگی کی طرف موڑ کر پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور مصلحین امت ہر قسم کی بدعات اور غیر مشروعات کے متحمل نہ ہو کر خصوصاً اس کے کہ ان میں سے بعض قوم کی ترقی کی مظہر ہوں ہر ایک بدعت کی شکست و ریخت کے درپے ہوتے ہیں۔ خود مصلحین عیسویت یعنی پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانیوں کا طریق عمل اس حقیقت کی دلیل ہے۔ اور ان کے بعد جب انسانیات کے طریق استدلال کا دور دورہ ہوا۔ تو ارسمس جیسے مدعیانِ انسانیات پروٹسٹنٹ ازم کو قطعاً انسانی ترقی سمجھ کر یہ کہہ اٹھے آخر ایسی اصلاح سے کیا حاصل جو ایک سے ناقابل خطا پوپ کے بجائے اپنا ملجا و ایک مبرا از غلطی بائیبل بنائے۔

اور اُس کی کورانہ تقلید کرے۔

برخلاف اِس کے مسلمانوں کی وہابیت فوراً ہی اپنی ابتدائی شکلوں سے ترقی پاکر عملیات کے میدان میں آپہنچی جس سے ایک نہایت خوش آئیند اسلامی لبرل ازم کی ابتدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے ابتدا میں جو مسلمان مصلح پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے نہایت ہی شدید کوشش کے بعد معتزلہ اصولوں کی حقیقت کا وعظ کیا۔ مگر اس آشکار حقیقت معتزلہ کے بعد جو جنگ برہانیات اور عقائد جبریہ کے درمیان چھڑ گئی۔ اس میں گو اصول معتزلہ بالکل برباد ہو گئے۔ مگر احیاء اسلام بصورت وہابیت نے نئے سرے سے برہانیات میں جان ڈال دی اور سنین اولی کے معتزلہ اصولوں کے وجود نے جس کی یاد علماء سابقہ اپنی تحریروں میں چھوڑ گئے تھے۔ علماء جدید کے دعاوی کی تصدیق کی اور اِن کی ہمت بڑھائی۔ ان دعاوی کا بنیادی اصول یہ تھا۔ کہ تحقیق و برہان مسائل اسلامیہ کی جان ہیں نہ کہ جبر و اکراہ۔ اور اس سے تحریک جدید کو بے حد تقویت پہنچی۔ منشاء خود رسول اکرم کی احادیث سے بنظیر پیش کیجاتی تھی جنہوں نے فرمایا تھا جب میں احکام مذہبی پر کچھ کہوں اسے پیغمبر خدا کی طرف سے قبول کرو۔ مگر جب میں معاملات دنیوی کے متعلق کچھ بیان کروں تو مجھے اپنے جیسا انسان تصور کرو۔ نیز پیغمبر خدا نے یہ بھی فرمایا تھا۔ تم ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہو۔ جس میں احکامات الہی کے عشر عشیر سے انحراف تمہاری تباہی کا موجب ہوگا مگر ایک زمانہ ایسا بھی آنیوالا ہے۔ جبکہ اِن احکامات کے عشر عشیر کا عامل فلاح حاصل کر سکیگا۔

مصلحین مسلمین کی کوشش اصلاح پر بحث کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا۔ اگر مغربی نقادان اسلام کی آرا کو جانچا جائے جو یہ کہتے ہیں۔ کہ اسلام کے اصول ہی اِس کے مترقی ہونے سے مانع ہیں۔ اور اِس کے نام لیوا کبھی بھی دنیا کی آئے دن کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے ہمدوش نہیں رہ سکتے۔ یہ اعتراض صرف متعصب شعار عیسائی پادریوں کا ہی نہیں۔ بلکہ ایسے عقلانیت پرست فلاسفروں اور عالموں کا ہے۔ جیسے رینان اور لارڈ کرومر۔ کرومر تو یہاں تک کہہ گیا ہے۔ کہ اصلاح شدہ اسلام ہی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ کچھ اور ہی چیز ہو جائیگا میں ایسی باوقعت شخصیتوں کی رائے کو جنہوں نے اپنی تمام زندگی اسلامی ملکوں میں گذاری ہے۔ یکلخت رد نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اگر مذہب اسلام کی مکمل تاریخ کا

جائز لیا جائے۔ اور مصلحین اسلام صدیِ سابقہ کی کامیاب کوششوں کا ٹھنڈے دل سے امتحان کیا جائے۔ تو میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ کہ متذکرہ بالا الزامات بالکل بے بنیاد نظر آتے ہیں ہ

یہ خیال دل میں مضبوطی سے جاگزیں کر لینا چاہئیے۔ کہ اسلام زمانہ حال میں ٹھیک اس مقام پر ہے۔ جہاں عیسائیت دورِ اصلاح یعنی ریفرمیشن کے آغاز میں تھی۔ جیسے اس زمانے کے عیسویت پرستوں کے خیالات کی کیفیت تھی۔ وہی آج کل مسلمانوں کی ہے۔ یعنی وہی لکیر کا فقیر ہونا اور تمدن جدید کے مصالحہ سے غفلت سائنٹیفک معلومات سے بےخبری۔ اور آزادیِ خیال سے خوف۔ یہ صحیح ہے۔ کہ اسلامی مذہبی لٹریچر مثلاً فقہ اور گذشتہ ہزار سال کی اسلامی تاریخ کے پڑھنے سے یہ ضرور پایا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کا عام نقطہ نظر یورپی وضع کی دنیوی ترقی و فلاح کا حامی نہیں۔ لیکن کیا بعینہٖ یہی حالات پندرھویں صدی کے عیسائیوں کے نسخے شریعت اسلامیہ اور عیسائی "کینن" کا مقابلہ کیجئے۔ عام سپرٹ میں دونو ایک ہی سے ہیں۔ بطور مثال شریعت کا امتناع سود خواری دنیائے جدید کے تجارتی لین دین کا دشمن ہے۔ یہ مثال بالخصوص اسلام کے غیر مترقی ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ لیکن کیا عیسائی "کینن لا" نے اس طرح سود خواری کو حرام قرار نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ صدیوں تک کاروباری خوشحالی۔ کا اجارہ یورپ کے یہودیوں کی قسمت میں رہا اور جب ایک عیسائی جماعت موسومہ "پہ لا مبر ڈز" نے سود خواری جائز قرار دی۔ تو ہر اطراف عیسائیت سے ان پر لعن طعن ہونے لگی اور ان کا شمار مرتدین عیسویت میں ہونے لگا۔ کیا اسلامی تاریخ میں کبھی بھی ایسا ہوشربا اور منحوس واقعہ عمل میں آیا ہے۔ جیسا کہ عیسائی یورپ میں گیلیو سنجم کے ساتھ پیش آیا۔ کون نہیں جانتا کہ اس حکیم کو پاپائے روم کی مذہبی عدالت میں بوجہ عذاب شدید کر کے اس دعوے سے توبہ نہیں کرائی گئی۔ کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ برخلاف اس کے خود رسول اکرم نے حرمتِ علم کی تلقین کی ہے۔ اس کے متعلق کچھ احادیث ذیل میں دیجاتی ہیں ہ

"علم کا ایک لفظ سو دعاؤں سے افضل تر ہے۔"

"علم کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ عزیز ہے۔"

"علم کا ایک جملہ حاصل کیا۔ اور ایک مسلمان بھائی کو سکھایا ہوا سارے سال کی نمازوں سے افضل تر ہے۔"

"عالم پیغمبر کے خلیفے ہیں۔"

"خدا نے عقل سے بڑھکر نعمت پیدا نہیں کی۔"

"فی الحقیقت اگر کوئی انسان روزہ رکھے۔ نماز پڑھے۔ زکوٰۃ دے۔ حج کرے۔ لیکن اُس کو ثواب اِس قدر ملیگا جس قدر اِس نے اپنے فہم کو استعمال کیا ہو"

یہ کلمات جن کے علاوہ اور بہت سے ایسے موجود ہیں۔ مصلحین حال کی کوششوں کی بروئے احادیث تائید کرتے ہیں۔ میری مراد یہ نہیں۔ کہ تحریک اصلاح محض اِس لئے کہ وہ لبرل اور ساعی بہ ترقی ہے۔ اس لئے اس کی کامیابی میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش ہی نہیں رہتی۔ برخلاف اِس کے تاریخ میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ جو اِس کے برعکس ہونے کا ثبوت ہیں۔ خود اسلام کے ابتدائی حالات اِس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ کہ اِس کی لبرل تعلیم کے ہوتے ہوئے نتائج اِس کے برعکس پیدا ہوئے۔ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے۔ کہ جس وقت زمانہ ترقی سر پر آپہنچتا ہے۔ کہ خود ایسا مذہب جو اس ترقی کا مخالف ہو۔ اس کی رو سے متاثر ہو کر اس کی رفتار کا معاون ہو جاتا ہے۔ اور جب کبھی کسی قوم کے دن جاگے ہیں۔ وہ کسی مذہب کی سپرٹ رجعت پسندی سے قبدل بہ فلاکت نہیں ہو گئے ہاں گاہے گاہے یہ رد روکی جاسکتی ہے۔ مگر یا یں ہمہ اگر ترقی کا جذبہ کافی طور سے حرکت میں آ چکا ہے۔ تو یا تو مذہب کو اپنے آگے دھر لیتا ہے۔ یا روندکر اس کے اوپر سے گذر جاتا ہے۔ یا اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور یا اسے بے جان کر دیتا ہے۔ میری دانست میں تو اب ایسا کوئی قرینہ نہیں جس کے رو سے مسلمانوں کا جذبہ ترقی دبایا جاسکے۔ مسلمان اب مغربی تمدن کے اثرات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ مذہب اسلام کو جنہوں نے جو جہلا سمجھ رکھا ہے۔ اب یہ ممکن نہیں کہ

اِس کرۂ ہوا سے نکل کر کہیں اَور جا سکے۔ ہاں کرو مر جیسے نقطہ چیں چلا اُٹھینگے۔ چلو! یہ تو وہ اب چیز ہی نہیں رہی جسے اسلام کہا جا سکے۔ میں کہتا ہوں۔ کیوں نہیں۔ اگر لوگ ترقی پاکر بھی اپنے آپ کو مسلمان کہیں اَور محمد عربیؐ کی تعلیم سے روحانی استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ تو کیوں وہ لقب مسلمان کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ میری رائے میں وہی حقیقی مسلمان ہونگے۔ کون نہیں جانتا۔ کہ عیسویت جدید قرون وسطےٰ کی عیسائیت سے کہیں مختلف ہے۔ آپس کی فرقہ بندیوں نے اِس رہے سہے مذہب کی ایسی دھجیاں اُڑا دی ہیں۔ کہ ایک سے ایک نہیں ملتی۔ مگر پھر بھی جو لوگ اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں انہیں کون عیسائی نہیں کہتا۔ سوائے اِن چند ایک کے جو تعصب فرقہ بندی میں چُور اپنے سوا ہر ایک کو کافر گردانتے ہیں ✤

آؤ اب مصلحین اہل اسلام پر ایک نظر دوڑائیں۔ میں اِن کی تاریخی اَور مذہبی تحریرات کو ایک طرف رکھکر اِن کے عملیات پر بحث کرونگا۔ خود ایک الجزائری مسلمان عالم نے کیا خوب کہا ہے

کسی انسان کا اِس کے قومی لٹریچر کی بنا پر امتحان نہ کرو۔ بلکہ اِس پر کہ خود اِس کے اپنے قول و فعل کیا ہیں ✤

جیسے کہ اوپر تحریر ہو چکا ہے۔ جدید مصلحین اہل اسلام کی ہمت سنین اولیٰ کے اصول معتزلہ کے وجود نے بندھائی۔ اِس سے ایک دعوےٰ یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اسلام میں لبرل ازم کی لہر ہمیشہ سے موجود تھی۔ مسلمانوں میں انتہائی درماندگی کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے۔ جو آزاد خیال اَور عقلیت پسند تھے۔ سولہویں صدی میں الفارانی نے لکھا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ عقل و علم کے وہ سرچشمے جن سے اسلاف بہرہ اندوز نہ ہو سکے ہوں آنے والوں پشتوں پر کھول دئے جائیں۔ کیونکہ افضالِ ربانی ہر زمانے اَور ہر قوم کے افراد فرزانہ پہ نازل ہو سکتے ہیں۔ اَور ہوتے آئے ہیں ✤

مسلمانوں کے تاریک ترین زمانے میں ایسی صدا بلند ہو چکی ہے۔ جس سے مصلحین حال کی کمر ہمت بندھ چکی ہے۔ اَور انیسویں صدی کے وسط میں تو کئی مسلمان رہنما مختلف ملکوں میں پیدا ہو گئے۔ قدرتی طور پر ابتدا میں اُن کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ اَور اِن کو اپنے تنگ دِل ملاؤں کے طعن و تشنیع کا بھی شکار ہونا پڑا۔ ہندوستان پہلا ملک تھا۔ جہاں اِن

رہنماؤں کو معتدبہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یہاں سر سید احمد خاں مرحوم نے تحریک ترقی جدید کی بنیاد رکھی۔ سائنٹیفک انجمنیں قائم کیں۔ کتابیں۔ اخبارات اور رسائل شائع کئے اور علیگڑھ میں ایک عالیشان اسلامی مدرستہ العلوم قائم کیا۔ سرسید احمد اوائل تحریک جدید کی ایک قابل قدر شخصیت ہے۔ باوجود رجعت پسندی مزاج اور تشرع زندگی کے سرسید مرحوم اسلامی انحطاط کے خلاف وہابی جوش وخروش سے جدوجہد کرتے تھے۔ انہوں نے آزادانہ مغربی تمدن اور روح ترقی کی فوقیت کو قبول کیا ۱۸۶۶ء میں انہوں نے یہ جملات تحریر کئے۔ مسلمانوں کو مغربی سائنٹفک کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ غیر مسلموں کی لکھی ہوئی ہوں اور قرآنی تعلیم کے مخالف ہوں۔ ان کو اعراب سلف کی پیروی کرنی چاہیئے جو فیثاغورس کا فلسفہ بغیر خوف وخطر پڑھتے تھے۔

ہندوستانی اسلامی لبرل ازم کی یہ ابتدا نہایت ہی سعید ثابت ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے حامی ایسے جلیل القدر مسلمان جیسے مولوی چراغ علی سید امیر علی نظر آنے لگے جن کی عالمانہ تصانیف بہ زبان انگریزی ساری دنیا میں مقبول ہوئیں۔ یہ بزرگ اصول معتزلہ جیسے محرک ہوئے اور اسلام کو غلط رسومات سے پاک کرنے کے لئے مستعدی سے جدوجہد کرنے لگے۔ اس گروہ کے ایک اور مصنف ایس۔ خدابخش نے مندرجہ ذیل کلمات تحریر کئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "پیغمبر اسلام کا منشا کبھی بھی یہ نہ تھا کہ اسلام کے دستور العمل کو ناقابل التبدل قوانین میں جکڑ دیا جائے۔ قرآن کریم مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ایک نہایت ہی اعلےٰ کتاب ہے۔ اور ان کی معاشرتی۔ تمدنی۔ اور اخلاقی ترقی کی معاون ہے۔ نہ کہ مانع"۔ اسلام کی موجودہ فلاکت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں"۔ اسلام جس میں مخرب الاخلاق بدعات اور عجیب قسم کے مکروہ عقاید جمع ہو گئے ہیں۔ اور ملاؤں کی کٹھ پتلی بن گیا ہے۔ دین محمدؐ کی مسخ شدہ تصویر ہے" پھر وہ کہتے ہیں "۔ کیا اسلام واقعی ترقی کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر اسلام کو اس کی نام نہاد اسلامی جزویات سے جو دور خلفائے راشدہ سے بعد کی آمیزشیں ہیں۔ پاک وصاف کر دیا جائے تو سوائے توحید اور رسالت نبوی اور دیگر عام فہم اصولوں کے اس میں اور کچھ نہیں رہ جاتا اسلام نہایت ہی سادہ اصولِ زندگی ہے اور جو عقاید اور رسومات اس میں اب نظر آتے

وہ ہرگز اس کے اصلی ابتدائی جزو نہیں ہیں ''۔

مزید برآں یہ تحریک اصلاح مسلمین دنیا کے اور گوشوں میں بھی شد و مد سے جاری ہو چکی تھی سلطنت عثمانیہ کے اس دور میں جو محاربات کریمیا اور عہد حمیدی کے درمیان آتا ہے۔ مدحت پاشا اور رشید پاشا ایسے روشن خیال اراکین سلطنت نے ترکی کے احیاء کے لئے بے حد جانفشانیاں کیں جو بدقسمتی سے حالات نامساعد کے ہوتے ہوئے پوری طرح سے کامیاب نہ ہو سکیں۔ تاہم دور حمیدی کا استبداد ان کوششوں کے نتائج کو کلیتاً نابود نہ کر سکا۔ گو کچھ دیر کے لئے یہ کوششیں رُک گئیں۔ مگر ۱۹۰۸ء کا انقلاب عثمانی اس ابتدائی تخم ریزی کا ثمر بار ور تھا۔ مصر میں مفتی محمد عبدہ شیخ الجامع ازہر کی زیر سیادت اس تحریک آزادی نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور نہ صرف ان ممالک میں جو دنیائے اسلام کی ناک تھے۔ بلکہ ایسے دور دراز مقامات جیسے روسی ترکستان میں بھی اسی قسم کی جد و جہد رونما ہوئی ۔

یہ روشن خیال اسلامی ریفارمرجن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور جو ایک قسم کے انقلاب کے محرک تھے۔ باوجود اپنی آزاد خیالی کے قطعی طور سے پرانی وضع کے مسلمان تھے ان کی آزاد خیالی کی روح فی الحقیقت اسلام ہی کی تعلیمات تھیں۔ اور یہ اس پاک مذہب کی اعلےٰ تعلیم کا اثر تھا جس کا وہ اس طریق سے اظہار کر رہے تھے

ان کے علاوہ دنیائے اسلام میں ایسا طبقہ بھی موجود ہے۔ جو مغربی اثرات سے اس قدر اثر پذیر ہوا ہے۔ کہ اسے اپنے ماضی کی خبر بھی نہیں رہی۔ کم و بیش زیادہ "متمدن" اسلامی ممالک میں مثلاً الجزائر۔ مصر۔ ہندوستان جہاں مغربی اثر زیادہ سرایت کر چکا ہے۔ یہ گروہ اس قدر مغربی اصولہائے زندگی کا دلدادہ ہو گیا ہے۔ کہ اسے یا تو مذہب کی طرف سے گونہ لاپرواہی سی ہو گئی ہے۔ یا وہ برملا دہریت کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ الجزائری عالم شیخ اسمٰعیل حامد نے اس گروہ کا خوب خاکہ کھینچا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ الجزائر میں مسلمانوں کا ایک گروہ مغربی سرتاب نقطہ نگاہ کی طرف اس قدر مائل

ہو چلا ہے۔ جو بظاہر مذہبی فرائض کا تو کسی نہ کسی طریقے سے پابند ہوتا ہے۔ مگر اسے تعلیم اسلام کی تبلیغ کی چنداں حس نہیں۔ یہ گروہ اپنی اولاد کو اسلامی اصولوں پر تربیت دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر غیر مسلموں کی اصلاح کی ضرورت کے قائل نہیں۔ اس دماغی حالت کا نام قوت ایمان تو نہیں۔ اور نہ یہ آزاد خیالی کہی جا سکتی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک قسم کی روحانی سہل انگاری ہے۔

اس گروہ کے علاوہ اور بھی مختلف الخیال گروہ ہیں۔ مثلاً ایسے نوجوان جن کے دل و دماغ پر انتہائی درجہ کے مغربی تمدنی مظاہرات یعنی دہریت مشرطیت ۔ بلشویت وغیرہ وغیرہ کا اثر ہو چکا ہے۔ مگر جو امر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے۔ کہ یہ انتہا درجہ کے آزاد روش نوجوان یورپین قوموں سے نفرت کرنے میں نہایت متعصب اور رجعت پسند مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ شاید اس لئے کہ یہ نوجوان اپنے آپ کو جہلا عوام کا قدرتی رہنما تصور کرتے ہیں۔ اور اس سیاسی طاقت کو حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ جو مغربی حکومتوں کے قبضے میں ہے۔ بنابریں وہ وطنیت پرستی کے ساتھ انتہائی وضع کے رجعت پسند پان اسلامک اصولوں کے داعی بھی ہوتے ہیں۔ اس گروہ کی مثال بعض ایسے لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے جو مذہباً تو دہریت پسند ہیں۔ مگر نمائش زہد اور پرہیزگاری میں کسی سے کم نہیں۔ مسٹر خدا بخش ایک ایسے ہی گندم نما جو فروش کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ میں ایک ایسے مسلمان کو جانتا ہوں۔ جو پبلک میں تو نہایت ہی پرجوش مسلمان ہیں۔ مگر ان کے خیالات متعلقہ اسلام جو میں نے سنے۔ ایسے تھے۔ کہ روسو اور والٹیر جیسے مرتدین ان کے اظہار سے اجتناب کریں۔

وطنیت و پان اسلامزم کے باب میں ان اصحاب کا مفصل ذکر آئیگا۔ مندرجہ بالا مختصر ذکر کی وجہ جو میں نے اس عجیب و غریب گروہ کا کیا ہے۔ تحریک احیاء

اسلام پر ان کے متضاد خیالات و عملیات کے مضر اثرات کا افشا ہے۔ اِن لوگوں کی اصلی نیت درحقیقت یہ ہے۔ کہ متعصب جہلا کو برانگیختہ کریں اور اس کے ساتھ سوائے سامان جنگ کے ہر قسم کے مغربی سازوسامان کے اثرات کی اشاعت کے مانع ہوں۔ مثلاً میں اِس گروہ کے ایک نوجوان تُرک نمائندے کے مقالات کا حوالہ دیتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں "ہاں۔ ہم اہل اسلام دنیا کے عیسویت کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اے اہلِ مغرب۔ تمہیں واضح ہو جانا چاہیئے۔ کہ ایک عیسائی محض اِس لئے کہ وہ عیسائی ہے۔ ہماری نظروں میں کسی طرح کی انسانی وقعت کا مستحق نہیں۔ ہمارے دلائل سادہ اور عام فہم ہیں۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ کوئی شخص جو خدائے واحد کی وحدانیت کا قائل نہ ہو سکے۔ اور اس کی جگہ تثلیث کا بے ہودہ مسئلہ گھڑ لے اور اُس پر ایمان لے آئے ہوشمندی سے بالکل بے بہرہ ہے۔ ایسے آدمی سے گفتگو کرنا حد درجے کی ذلت اور خدائے واحد کی ناقابل عفو بے حرمتی ہے۔ جو آدمی کثرت الوہیت کا مقر ہے۔ وہ کفران نعمتی کی زندہ مثال ہے۔ اور ساری دنیا کا ہدف لعنت ہے۔ جائز ہے کہ ایسے شخص کو یا تو مسلمان کر لیا جائے یا ہلاک کر دیا جائے اور یہی مشیتِ ایزدی ہے۔ ہمارے نزدیک دنیا میں صرف دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو توحید پر ایمان لائے اور دوسرے جو راندہ درگاہ ہوئے۔ اول الذکر مستحق دستگیری۔ خلوص و محبت ہیں۔ اور دوسرا گردن زدنی اور کشتنی ہے۔ توحید سے منکر گروہ میں بدترین فرقہ وہ ہے۔ جو خدا پر تو ایمان لے آتے ہیں۔ مگر انہوں نے اس کا ایک ماں اور ایک باپ قرار دیا ہے۔ لعنت اللہِ علی الکٰذبین لعنت اللہِ علی المشرکین۔ ایسے لوگوں کا وجود دنیا میں موجب نحوست و ظلالت ہے۔ اِن کے عقائد محاسن اسلام کے سامنے ایک بے معنی ڈھکوسلہ ہے۔ اور اس ڈھکوسلے کے ماننے والوں سے چھو جانا اور لین دین کرنا موجب عذاب روحانی ہے "*

ہم تمہارے سیاسی نظام اور تمہارے جنگی مصالح کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اِن دونوں نے مل کر ہمارے دِلوں میں شہدائے سلف کی جانبازیوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ہمارے نوجوانان ترکوں۔ ہمارے بابیوں۔ ہمارے طریقہ ہائے جدیدہ کے نمائندوں کا نصب العین صرف ایک ہے۔ اور وہ کیا ہے۔ مغربی تمدن سے نفرت اور بیزاری۔"

بدقسمتی سے ایسی رجز خوانیاں دنیا میں بہت سے معتقد پیدا کر لیتی ہیں۔ گو روشن خیز ریفارمروں کی طاقت بڑھ رہی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ فی الحال ان کی تعداد بہت محدود ہے۔ اور ان کے گردو پیش عوام جہلا کا ایک بحرِ محیط ہے۔ جو اب تک سوائے اسلام کے اور کسی چیز کو نظر میں نہیں لاتے اور اپنی جہالت اور فلاکت کے باوجود اسلام اور ہر ایک اسلامی چیز کو زندگی کا بہترین منتہا سمجھتے ہیں۔ اگر شدید مجبوری سے مغربی طاقت کے سامنے سرخم کرتے ہیں۔ تو پھر بھی ان کا جذبہ تنفر کم نہیں ہوتا۔ وہ آئے دِن کے تغیرات کے جانی دشمن ہیں۔ اور بڑھتی ہوئی مغربی سیاسی طاقت کے نظارے نے انہیں اور بھی سخت دِل کر دیا ہے۔ ایسے لوگ مطلب پرست پان اسلامی اور انقلاب خیز لیڈروں کے ہاتھوں میں موم کی ناک ہیں۔ جس طرف چاہیں۔ انہیں موڑ لیں۔

اسلام فی زمانہ دو طاقتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ ایک طاقت تو آزاد خیال ریفارمروں کی ہے۔ اور دوسری متعصب اور عیاری شعار لیڈروں کی لبرل یعنی اول الذکر طاقت بھی مسلمانوں کی دستگیری کر سکتی ہے۔ بالخصوص حالاتِ زمانہ بھی ان کے معاون ہیں۔ کیونکہ مغربی تاثرات تاوقتیکہ مغربی تمدن بالکل برباد نہ ہو جائے دنیا میں نفوذ کرتے ہی رہینگے گو لبرل طاقت کی آخری فتح میں کلام نہیں۔ مگر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ دوسری قسم کے لیڈروں کا گروہ اپنے مقاصد کی کامیابی کے لئے مذہبی فتنہ و فساد

بدامنی ۔ بے چینی اور کیا کیا کچھ اور نہیں کر سکتا ۔ بنا بریں میری دانست میں عمل اصلاح مسلمین اور تعلقات مابین یورپ و ایشیا پُر خطر امکانات سے خالی نہیں ۔ اور ان پر میں آگے چلکر بحث کرونگا ۞

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے ایک امر ایسا ہے ۔ جس کی بنا پر مسلمانانِ عالم کے مشترق ہونے کا خواب ایک ممکن العمل مسئلہ نظر آتا ہے ۔ اور وہ عالمِ اسلام میں دو ایسے فرقوں کا وجود ہے ۔ جو نظامِ معاشرت و تمدن کو نیچے سے اوپر تک درست کرنے کے حامی ہیں ۔ یہ دو گروہ جن کی طاقت خوش قسمتی سے دن بدن بڑھ رہی ہے ۔ لبرل مصلحین اور آزادی پسند علماءِ مذہب کے ہیں ۔ اس پر بحث کرنے کی اس وقت چنداں ضرورت نہیں ۔ کہ یہ سکیم اصلاح کیا ہوگی ۔ اور نہ ہی ایسا فی الحال کیا جا سکتا ہے ۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ صادق نیت اصلاح کا ہونا طریق عمل سے زیادہ ضروری ہے ۔ اور جہاں یہ موجود ہے اصلاح کسی نہ کسی طریقہ سے ہو کر رہیگی ۞

ایک امر قابل لحاظ ہے ۔ اور وہ یہ ہے ۔ کہ اس تھوڑے سے عرصے میں عالم اسلام میں کئی قسم کے مظاہرات انقلاب ہو چکے ہیں ۔ جنہوں نے اس کی حالت صدیٔ سابقہ کو بالکل متغیر کر دیا ہے ۔ وہابیت کے خمیر نے بدعات کا قلع قمع کر کے ایک پاکیزہ اور ستھرے عقیدے کی بنیاد رکھ دی ہے ۔ حتیٰ کہ اسکی متعصبانہ روش بھی قطعاً بے سود ثابت نہیں ہوئی ۔ اس کے ساتھ مغربی تاثیرات کا نفوذ ترقی پر ہے ۔ لہٰذا غیر معلوم آنے والے امکانات کے خیال سے جہاں دل کسی قدر سہم جاتا ہے ۔ وہاں شعاعِ اُمید نیک کی تجلی بھی ہماری رہبری کی کفیل ہے ۞

نوٹ ۔ مندرجہ بالا بیانات میں پروفیسر سناؤڈٹ جاہل مسلمانوں کے تعصبِ اسلامی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں ۔ کہ گو روشن خیال ریفارمروں کی طاقت بڑھ رہی ہے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے ۔ کہ فی الحال ان کی تعداد بہت

محدود ہے۔ اور اِن کے گرد و پیش عوام جہلا کا ایک بحر محیط ہے۔ جو اب تک اسلام کے سوا اور کسی چیز کو نظر میں نہیں لاتے۔ اور اپنی جہالت اور فلاکت کے باوجود اسلام اور ہر ایک اسلامی چیز کو زندگی کا بہترین مُنتہا سمجھتے ہیں اگر شدید مجبوری سے مغربی طاقت کے سامنے سرخم کرتے ہیں۔ تو پھر بھی اِن کا جذبۂ تنفر کم نہیں ہوتا۔ اور وہ آئے دِن کے تغیرات کے جانی دشمن ہیں۔ اِس بیان میں پروفیسر موصوف نے نہ صرف مشہور مغربی خود پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ بلکہ اِس خواہش کا بھی کہ جاہل مسلمان جو بقول اُن علمی اور مادی متاع سے تہی دست ہیں۔ رہی سہی قوتِ ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ شاید پروفیسر کے مختصر مشرقی تجارب نے اِس امر کو کافی طریق سے اِن پر روشن نہیں کیا۔ کہ اِس مادی و سیاسی بے سروسامانی کے باوجود جو چیز اب تک اسلامی قوموں کی ظاہری آن بان اور کم و بیش معاشرتی تنظیم کی ذمہ وار ہے۔ تو وہ اِن کا برُا بھلا جیسا کچھ ہے۔ یہی ایمان اسلام ہے۔ اب اگر بدقسمتی سے وہ اسے بھی چھوڑ بیٹھیں۔ تو پھر اِن کے پاس رہ کیا جائیگا۔ بس پروفیسر کے مندرجہ بالا ریمارک کو کسی قسم کی عیارانہ خواہش کا سبب نہیں ٹھہرانا۔ جس سے اِن کا مقصد یہ ہو۔ کہ مسلمان دنیاوی سازوسامان سے عاری مذہب کا سہارا چھوڑ مادیات اور روحانیات غرضیکہ ہر ایک چیز میں یورپ کے غلام بن جائیں۔ کیونکہ انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے۔ کہ ایسے مسلمان کو بڑھتی ہوئی مغربی سیاسی طاقت نے اور بھی سخت دِل کر دیا ہے۔ ایسے لوگ مطلب پرست پان اسلامی اور انقلاب خیز لیڈروں کے ہاتھوں میں موم کی ناک ہیں۔ جس طرف چاہیں۔ انہیں موڑ لیں۔ اب اگر یہ بڑھتی یورپی سیاسی طاقت امرِ حقیقت ہے۔ تو اِس میں غریب مسلمانوں کا کیا قصور۔ ناظرینِ تاریخ اِس امر سے بخوبی واقف ہیں۔ کہ حوادث حروب صلیبیہ کے باوجود کسی نہ کسی قسم کا مشرقی مغربی ارتباط ایک عرصے تک اِن دو براعظموں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنائے رہا۔ مصیبت اس وقت آن کر

شروع ہوئی۔ جب مغربی اختراعات نے یورپ میں اقوامِ عالم کے متاع کو یورپی
قبضۂ قدرت میں لانے کی صبر شکن آرزو پیدا کردی۔ یہ ظاہر ہے۔ اگر یورپی
لین دین کسی نہ کسی وضع کے طرز قدیم پر رہنے پاتا۔ تو نہ مسلمان متعصب ہوتے
اور نہ یورپ کو اس کے عملی امکانات کا خوف ہوتا۔ اور یہ زمانہ زمانۂ حال ہے
تاریخ جدید کے صفحات پر نظر دوڑانے۔ تو آپ کو صاف دکھائی دیگا۔ کہ جونہی
خرس روس نے قسطنطنیہ۔ قفقاز اور ایران کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے
دیکھنا شروع کیا۔ اور فرانس اور اٹلی نے پے در پے حملے کر کے مسلمانان
افریقہ شمالی کی صدیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ اور انگلستان نے اپنے مصری
وعدوں کے ایفا سے پہلو تہی کی تو ہی مسلمانوں کا جذبۂ تنفر حرکت میں آیا۔
اس پر بھی کوئی ایسی عملی کارروائی نہیں کی گئی۔ جس سے ان قوا کے منصوبوں
کو ضعف پہنچنے کا احتمال ہوتا۔ بنا بریں مسلمانوں کی موجودہ مایوسی کا اگر کوئی امر
ذمہ دار ہے۔ تو وہ مغربی حکمت عملیوں کی غیر منصفانہ افراط تفریط ہے۔ نہ کہ
مسلمانوں کا مذہبی تعصب اور ہوشمند مستشرقین کو یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اگر
کوئی چیز ان جاہل مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کی طرف لے جانے والی ہوگی۔
تو وہ ان کا یہی شغف اسلامی۔ اس میں شبہ نہیں یورپی ترویج و تشویقِ علوم
و فنون کا زمانہ مذہبی الحاد کی علامت قرار دی گئی تھی۔ کیونکہ جب تک یورپ
کلیسیت اور شارعین عیسویت کے زیر اثر رہا۔ براہینات کے مدعی علما اور
فضلا کی چن چن کر بیخ کنی کی گئی۔ ان کی تصانیف کو سر بازار جلایا گیا۔ اور
ان کو دار پر کھینچا گیا۔ اس کے برعکس اسلام نے نہ صرف اشاعت
علوم کی ابتدا کی بلکہ جب تک اسلام کے نام لیوا اس دین فطرت
کے سیدھے سادے اصولوں پر قائم رہے۔ مسلمان علما کی جدوجہد سے
اسلامی تمدن ایسا درخشندہ اور ستائش خیز جملہ اوراقِ تاریخ
میں ایزاد کیا گیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی اسلامی

فلاح کے متمنّی اسی نظیر کی تکرار کے خواہش مند ہیں۔ اور امید لگائے بیٹھے ہیں کہ خالص اسلامی اصولوں کی تقلید درماندہ مسلمین کی موجودہ نحوست کو متبدل بہ سعادت کر دے۔

(۲)
بابِ دوئم

"پان اسلامزم" ۔ اتحادِ مسلمین

مثل اور انقلاباتِ عظیم تحریک احیا اسلام ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ گو اس کا آغاز وہابیت کے سیدھے سادے اصولوں پر ہوا۔ مگر اس کے بعد اُس کے حالات مختلف النوع صورتیں اختیار کرتے گئے باب اول میں تجدید اسلام کے مختلف مدارج ارتقا پر اور تحریک کے اُن مظاہرات پر بحث کی گئی تھی جس میں نہ صرف مسلمانانِ عالم اپنے ابتدائی زمانے کی پاکیزہ اصولوں کیطرف مائل نظر آرہے تھے۔ بلکہ مغربی تمدن کے تاثرات سے بھی اثر پذیر ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی گوش گذار کر دیا گیا تھا۔ کہ ان معلمین و مجددین اسلام کی تعداد فی الحال کچھ بہت زیادہ نہیں۔ اور مسلمان عوام زیادہ تر اس فرقے کے اثر کے ماتحت ہیں۔ جو وسائل ترقی پر امن کی نسبت معاندانہ روش کیطرف زیادہ مائل ہیں اور پھر اس روش کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ بعض حالات میں اس کا "پان اسلامک" طریق پر اظہار کیا جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ تحریک وطنیت کی طریق پر۔ اس باب میں اول الذکر اصول یعنی۔ اصولِ پان اسلامزم پر بحث کی جائیگی۔

پان اسلامزم کی ابتدا جس کا حقیقی مفہوم اتحاد مسلمین ہے۔ رسول عربی کے زمانے سے ہوئی۔ اس کا مقصد پیروان اسلام کا آپس میں اتفاق و اتحاد تھا تاکہ اس قوت سے دشمنان اسلام کا مقابلہ کیا جائے۔ جو اس کی

بیخ کنی کے درپے تھے۔ اسلام کی اصلی غرض و غایت مسلمانوں کو ایک رشتہ اخوت میں منسلک کرنا تھا۔ اس اصول کی کامیابی میں مطلق کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ باوجود ۱۳۰۰ سال کے عرصہ طویل کے اس حقیقت کو ذرہ بھر بھی ضعف نہیں پہنچا۔ اور اتحاد بین المسلمین آج ایسا ہی استوار ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں کا آپس کا مذہبی عناد۔ اس میں شبہ نہیں۔ گاہے گاہے مسلمان بھی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ مگر ان رقابتوں کی حقیقت ایک ہی خاندان کے مختلف ممبروں کے فساد سے بڑھکر حیثیت نہیں رکھتی۔ اور حملۂ کفار کے مقابلے ان کو ہمیشہ بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اخوت اسلامیہ کی اس حیرت انگیز کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ مسلمان اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور اُس کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہ کہنا بالکل درست ہے۔ کہ دیگر مذاہب کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ دنیا میں اس وقت ایک نہیں کئی ممالک ایسے ہیں۔ جہاں پہلے دیگر مذاہب کا دور دورہ تھا۔ مگر اب وہاں ان کا نشان بھی نہیں رہا۔ اور اسلام کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اور ایسی مثال تو دنیا میں ایک بھی نہیں ملتی۔ کہ کسی جماعت انسانی نے بحیثیت المجموع اسلام قبول کر کے پھر اسے چھوڑ دیا ہو۔ حالانکہ قومیں کی قومیں ایسی ملینگی۔ جو ابتدا میں غیر مسلم طریقوں کی پابند تھیں اور اپنے قدیمی اور آبائی مذاہب کو چھوڑ کر اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئیں۔ یہ ممکن ہے کہ مسلمان بعض ملکوں سے بالکل خارج کر دئے گئے ہوں۔ جیسے ہسپانیہ سے مگر اخراج ارتداد نہیں کہا جا سکتا۔

فریضۂ حج اور نظام خلافت اسلامیہ اصول اتحاد کے دو زبردست ستون ہیں۔ مغربی خیال کے برخلاف میری دانست میں حج کا انسٹی ٹیوشن خلافت سے کہیں بڑھکر اسلامی یکجہتی کا ذمہ دار ہے۔ رسول اکرم نے حج کو اسخ ترین فریضۂ اسلام قرار دیا ہے۔ اور ہر سال کم و بیش ایک لاکھ مسلمان دنیا کے اطراف و جوانب سے جمع ہو کر اس فرض مقدسہ کو ادا کرتے ہیں۔ اور مکہ معظمہ کے حرم میں باوجود اختلافات زبان

رسم و رواج وغیرہ وغیرہ جمع ہو کر ایک تحیر خیز و پر عظمت نظارے کا سماں باندھ دیتے ہیں۔ حج کے بعد حاجی کا لقب ان کے نام پر ایزاد کیا جاتا ہے اور تا حد زیست وہ اپنی قوم کے افراد کے درمیان وقعت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے انسٹی ٹیوشن کے سیاسی نتائج کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ حج کے ذریعے سے ہر سال ایک طرح کی کانفرنس بین الاقوام برپا کیجاتی۔ جہاں دین برحق کی ترقی و دفاع کے تمام مسائل پر گفت وشنید ہوتی ہے۔ اور ایک امر قابل ذکر یہ ہے۔ کہ شیخ عبدالوہاب اور شیخ محمد سنیوسی جمال الدین افغانی اور ایسی اور کئی پر عظمت شخصیتوں نے حج ہی کے تجارب و روحانی فیوض سے متاثر ہو کر اپنے اپنے مشنوں کی ابتدا کی۔ خلافت کی تاریخی اہمیت بھی کسی طرح سے کم نہیں۔ حالانکہ بغداد کی تباہی کے بعد اس کا وجود قریب قریب معدوم ہو چکا تھا۔ گو سلاطین آل عثمان نے اس کے بے حرکت جسد میں نئی جان پھونک دی اور عالم اسلام نے ان کی خلافت کا اقرار کیا۔ گو ان کو خلفائے راشدین و خلفائے بغداد کا اعزاز اور اقتدار نصیب نہ ہوا۔ عربوں کی نظروں میں ترکی خلافت ایک معمہ تھی جسے وہ حل نہیں کر سکتے تھے سلطان عبدالحمید مرحوم نے خلافت سابقہ کی عظمت کو از سر نو تازہ کرنے کی خاص کوشش کی اور اس میں جو کچھ کامیابی اسے حاصل ہوئی وہ میری دانست میں زمانہ حاضرہ کی تمام اسلامی ہیجان کا نتیجہ تھا۔ نہ کہ منصب خلافت کی عظمت کا۔ بانیان اسلامزم جدید کے سربرآوردہ لوگ یا تو خلافت حمیدی کے رد کئے دل سے مقر تھے۔ اور یا پیرویاں طریقہ سنیوسی کی طرح برملا مخالف تھے۔ غالباً یورپ میں یہ حقیقت کافی طور سے آشکارا نہ ہو سکی۔ اس لئے اقوام مغرب سلطان عبدالحمید کو اسلامی پوپ سمجھنے لگ گئے۔ خود اسی زمانے میں مغربی مدبرین یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ پان اسلامزم کی روح رواں خلافت اسلامیہ ہے اور اس امید موہوم کو لئے بیٹھے ہیں کہ تحریک اتحاد مسلمین کا وجود اور اسکی قوت شریف مکہ کے خلیفہ بنائے جانے یا تنسیخ خلافت سے زائل ہو جائیگا۔ ایسا خیال انتہائی کوتہ بینی کی علامت ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی منصب خلافت کی توقیر و تحریم کچھ معتد بہ کم نہیں ہوئی۔ اور جمعیت مسلمین کا جنگجو فرقہ کئی سالوں سے ایک وقیع حکمت عملی پر عمل پیرا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ پان اسلامزم اتحاد مسلمین کی ترقی کا انحصار محض خلافت پر ہی نہیں بلکہ حج اور ایسی تحریکوں پر جیسے سلسلہ سنوسیہ وغیرہ

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ یہ تحریک اتحاد المسلمین کی ابتدا اور ترقی کیسے ہوئی۔ اس کی ابتدائی منزل تو بلاشبہ وہابیت تھی۔ نجد کی وہابی حکومت فی الحقیقت ایک الہیانہ سلطنت تھی۔ اور جب شیخ عبدالوہاب کے جانشین امیر سعود کے نبرد آزما سر زمین حجاز کو روندتے ہوئے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ پر جا مسلط ہوئے تو امیر موصوف کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ نجاح و فلاح مسلمین بذریعہ وہابیت بس اب دنوں کی بات ہے۔ گو اس مقصد میں وہابیوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں۔ کہ افغانستان اور ہندوستان جیسے دور دراز ممالک میں اس نے نہایت خطرناک اثر پیدا کر دیا۔ یہ ہیجان در اصل اسلامی سلطنتوں اور مسلمان سلاطین کی درماندگی اور سہل انگاری کے خلاف ایک قسم کا عمل احتجاج تھا۔ یہ پان اسلامزم غیر مسلم مغرب کے خلاف اسلامی تعصب کا نتیجہ نہ تھی کیونکہ اس وقت مغربی خطرہ پوری طرح سے رونما نہیں ہو چکا تھا۔ اور مسلمان آنے والوں حملوں کی تیاریوں سے فی الحال بے خبر تھے۔

انیسویں صدی کے وسطی زمانے میں حالات دگرگوں ہو گئے۔ فرانسیسی تسخیر الجزائر۔ روسی قبضہ قفقاز و انگریزی فتح ہندوستان نے مسلمانوں پر مغربی چیرہ دستی کی حقیقت افشا کر دی اور یہ امر تمام تر اس مخالفانہ روش کا ذمہ دار ہے۔ جو مسلمانوں نے مغرب کے متعلق آج تک اختیار کر رکھی ہے۔ گاہے گاہے امیر عبدالقادر الجزائری اور شمیل قفقازی جیسے تہمتان اسلام نے اس سیلاب کا مقابلہ کیا اور گو اسلامی دنیا میں ان کی ہمدردی کی لہریں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئیں۔ مگر عملی اعانت کہیں سے بھی نہ آئی اور وہ اس مہیب سیاسی آفت کا شکار ہو گئے۔

دنیائے اسلام مغرب کے خلاف غصے اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ اور انیسویں صدی کے آخری رُبع میں اس کے گوشے گوشے میں انتقام کے جزبات موجزن ہوئے۔ الجزائر میں ۱۸۸۱ء میں قبائل عرب نے بغاوت کی اور تمام شمالی افریقہ میں شیوخ و قائدین اٹھ اٹھ کر اسلامی حرمت کے دفاع پر لوگوں کو آمادہ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ شیخ احمد مہدی سوڈانی نے کامل بیس سال تک نہایت شہامت اور کامیابی کے ساتھ انگریزی حملوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ افغانستان میں طوفان خیز جزبات کا دور دورہ ہوا۔ جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو بھڑکا کر انگریزوں کے لئے مصیبت پیدا کی۔ وسط ایشیا میں مریدان سلسلہ نقشبندیہ حرکت میں آئے اور اُن کے نعرہ جہاد نے چینی صوبہ یونین تک مار کی۔ جہاں مسلمانوں نے چینی عمالانِ استبداد کے خلاف ایک شدید بغاوت کی۔ ہالینڈ کے غصب کردہ علاقہ سوماٹرا و جاوا میں پے در پے شورشیں ہوئیں اور ان میں سے ایک کا اثر جو جنگ اچن کا نام سے مشہور ہے۔ آج تک کم نہیں ہوا۔

اس تمام جدوجہد کی نمایاں خصوصیت ہر قسم کے نظام تعلقات باہمی کا عدم وجود ہے مختلف مقامات اور مختلف ممالک اسلامیہ میں عین ایک ہی وقت میں یہ فسادات ہوئے اور ایک ہی جزبہ یعنی حریت و دفاع اسلام ان کا محرک ہوا مگر کسی مرکزی نظام جمعیت نے ان کی رہنمائی نہیں کی اور نہ کسی مقررہ کردہ پروگرام پر عمل ہوا۔ ان ہنگاموں کی روح رواں عقیدہ "مہدویت" تھا۔ جس کا ذکر قرآن حمید میں تو کہیں نہیں آیا۔ مگر مسلمان ہر جگہ ایک مہدی موعود کے منتظر ہیں۔ جو دنیا میں انصاف اور روحانیت کا پرچار کریگا۔ وقتاً فوقتاً متعصب ملاؤں نے مہدیت کا دعوے کرکے مسلمانوں کو بھڑکایا ہے۔ یعینہ جیسے بعض مسیح "یہودیوں" کی ہنگامہ خیزی کا موجب ہوئے ہیں۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ اُن کی آزادی سلب ہو رہی تھی۔ اور اُن کے ملک ایک ایک کرکے قبضہ اغیار میں چلے جا رہے تھے۔ یہ قدرتی امر ہے۔ کہ عوام مسلمین کسی مہدی کے خرقِ العادۃ ظہور سے خلافی

د روحانی امداد کے سائل ہوتے۔ مگر وائے افسوس ان ہنگاموں کی حقیقت آتش خرمن سے بڑھکر نہ تھی۔ جو جہاں کہیں جلی شدت سے جلی مگر صرف ایک عرصے کے لئے اور اس کے بعد مسلمانوں کو ناکامی اور بیش از بیش مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ حقیقت سب ہوشمند حامیان پان اسلامزم پر منکشف تھی یورپ کی منظم اور متحدہ طاقت کے مقابلے میں مسلمانوں کی ناکام مقامی بغاوتیں اور جدوجہد نے اس امر کو بے نقاب کر دیا۔ کہ مغربی استبداد اور احتلال کا استیصال صرف منظم اجتماعی اتحاد ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ انہیں لوگوں کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ مغربی طریق عمل اور مغربی طریق نظام کا اختیار کرنا لابدی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہوگا۔ کہ اسلامی روحانیت کی تجدید کی جاوے جو دوران مقابلہ متحدہ اسلامی جمعیت کی روح ہو اور حصولِ مدعا کے بعد نظام جدید کی بنیاد بن سکے۔ اس اصول پر لبرل اور پان اسلامک فرقوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں گروہ مسلمانوں کی موجودہ ہلاکت کے معترف ہیں۔ اور دونوں اسکی آئندہ نجاح کے متمنی ہیں۔ اختلاف اس ترقی کی مخصوص صورت پر آن کر پیدا ہوتا ہے۔ لبرل گروہ اس امر کا مدعی ہے۔ کہ مسلمان مغربی اصولوں کو اپنا نصب العین قبول کرلیں۔ اور پان اسلامک گروہ اسلامِ اصل کا حامی ہے۔ اور اسباب مادی کے سوا ہر قسم کے یورپی اثر کا جانی دشمن ہے۔

میری رائے میں انیسوی صدی کا وسطی زمانہ صحیح اور باضابطہ تحریک جدید کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اس تحریک کی دو عملی نقطۂ نظر ہیں۔ ایک کی مثال سلسلہ سنوسیہ جیسی تحریکیں ہیں اور دوسری جمال الدین مرحوم کا پروپاغندا ہے۔ آؤ اب پہلی مثال پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

دنیائے اسلام میں سلسلہ ہائے روحانی کا وجود کوئی نئی بات نہیں۔ اور ہر ایک سلسلے کا نظام تقریباً ایک ہے۔ ان سب کی آرگنائیزیشن کا مرکز ایک "زاویہ" ہے۔ جس میں "اخوان" یعنی مقلدین ایک مقدم یعنی شیخ سلسلہ کی قیادت کے ماتحت

اپنے اپنے سلسلے کے اصولوں پر کاربند ہوتے ہیں۔ سلسلہ سنیوسیہ کے قبل کے تمام سلسلوں میں سالکانِ بالعموم دنیاوی معاملات سے اجتناب کرتے آئے ہیں۔ ان کا نصب العین روحانی اور عرفانی رہا ہے۔ جس میں مراقبہ شدید وضع کی ریاضتیں ان کا دستور العمل رہی ہیں۔ اگر کوئی سیاسی اثر ان سلسلوں کا پیدا بھی ہوا ہے تو وہ بہت محدود اور مقامی ہے۔ ان کی باہمی بے تعلقی اور رقابت ہر قسم کی اجتماعی معاملات کی مانع ہوئی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ان سلسلوں کے زاویے پائے جاتے ہیں۔ گروہ یا تو اپنے قدیمی دستور العمل کی پابندی کرتے آئے ہیں یا انہیں سلسلہ ہائے جدید کے اصولوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

سلسلہ ہائے جدید کا وجود انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے اور ان میں سلسلہ سنیوسیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے بانی حضرت سید محمد بن سنیوسی ۱۸۰۳ء میں مستغنم (الجزائر) میں پیدا ہوئے۔ ان کے لقب سید سے معلوم ہوگا۔ کہ وہ آلِ رسول میں سے ہیں۔ مسلمان سادات کو خاص احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے مراقش کی مشہور اسلامی یونیورسٹی نیفس میں تعلیم پائی اور تحصیل علوم کے بعد کئی سالوں تک اسلامی زندگی کی موجودہ قباحتوں کے خلاف وعظ و نصیحت کرتے رہے انہوں نے مکہ معظمہ کا حج کیا اور وہاں وہابی شیوخ سے ملکر ان کے جوش اصلاح کو اور بھی تقویت پہنچی ۱۸۴۳ء میں مکہ معظمہ سے طرابلس شمالی افریقہ کو واپس آئے اور شہر ورنہ کے قریب "زاویہ بیضہ" کا افتتاح کیا۔ یہ ان کے حسن انتظام اور تدبر کا نتیجہ تھا۔ کہ تھوڑے ہی دنوں میں مریدین کے گروہ کے گروہ ان کے سلسلہ میں آآ کر داخل ہونے لگے ان کا رویہ ترکی حکام طرابلس کے متعلق کچھ بہت دوستانہ نہ تھا۔ جس کے سبب وہ اپنا صدر مقام ورنہ سے ہٹا کر اندرون ملک یعنی جر بوب میں لے گئے۔ جب ان کی وفات ۱۸۵۹ء میں واقع ہوئی تو اُن کے سلسلے کے پیرو شمالی و مشرقی افریقہ کے ہر گوشے میں پھیل چکے تھے۔

ان کے خلف ثانی اور جانشین نے جو سنیوسی المہدی کے لقب سے ممتاز تھے ۔ اس سلسلے کو اور بھی ترقی دی ۔ تقرر خلافت سنیوسیہ جس کا عمل بانی سلسلہ کے حین حیات میں قرار پا چکا تھا۔ نہایت ہی دلچسپ ہے ۔ سید محمدؐ بن سنیوسی نے اپنے دو فرزندوں کا جبکہ وہ عالم طفلگی میں تھے ۔ اس طور سے امتحان کیا ۔ انہوں نے دونو کو کھجور کے ایک بلند درخت پر چڑھنے کا ایما فرمایا ۔ جب وہ دونوں چوٹی پر پہنچ گئے تو خدا اور اس کے رسول کا نام لیتے ہوئے نیچے کود پڑنے کو فرمایا ۔ بڑا فرزند ڈرا اور اس نے اپنی گرفت چھوڑنے سے انکار کیا مگر چھوٹے فرزند خدا پر بھروسہ کرکے نیچے گر پڑے اور صحیح وسالم زمین پر سے اٹھ کر چلنے لگ گئے ۔ اس آزمائش نے حق خلافت فرزند صغیر کو تفویض کروا دی ۔ اپنے والد بزرگوار کے زمانے میں شیخ سنیوسی المہدی نے ہر طرح سے اس انتخاب کی تصدیق کی اور اپنی دانائی اور پاکیزگی اطوار سے سلسلہ کے اثر کو دور دور تک پہنچایا اپنے عہد کے آخری سالوں میں انہوں نے اپنا صدر مقام جوف میں منتقل کر دیا ۔ جو صحرائے طرابلس میں ایک مخصوص مقام تھا ۔ اور جب ان کی وفات ۱۹۰۲ء میں واقعہ ہوئی تو ان کا بھتیجا شیخ احمد الشریف ان کا جانشین ہوا ۔ جس کے ہاتھ میں سلسلے کی باگ زمانہ حال تک ہے ۔ ان کے حسن انتظام کے نتائج سے پایا جاتا ہے ۔ کہ انہوں نے سلسلہ کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں نمایاں کوشش کا اظہار کیا ہے ۔

سلسلہ سنیوسیہ کے آغاز سے لیکر آج تک اسی سال کا زمانہ گذر چکا ہے اور اس کے وسیع اثر کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل بجا ہے ۔ کہ اسلام جدید کی تمام تحریکوں میں اس کا وجود اہم ترین ہے ۔ اس کے پیرو دنیا کے ہر ایک گوشے میں پائے جاتے ہیں ۔ بالخصوص عربستان میں جہاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اس کے اثر کا خاص نفوذ ہے ۔ مراقش سے لیکر سومالی لینڈ تک سارے شمالی افریقہ میں اس کے زاویے موجود ہیں ۔ جو تمام زاویہ صدر کے احکام کے تابع ہیں ۔ اب تک صرف ایک مغربی سیاح ان کے زاویوں کا مشاہدہ کر چکا ہے ۔

اپنے محفوظ صدر مقام جوف سے جو ہر چہار اطراف سے صحرائے وسیع سے گھرا ہوا ہے شیخ سلسلہ اپنے احکام افریقہ کے ہر گوشے میں بھیجتے رہتے ہیں۔

مگر یہ زاویئے صرف سلسلے کی مذہبی زندگی کے مرکز ہی نہیں جس کے رہنما مقدم ہیں۔ بلکہ ہر ایک مقام پر ایک وکیل یعنی مختار معاملات ملکی بھی رہتا ہے۔ جو نہ صرف مریدین سلسلہ بلکہ تمام آبادی کے معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اور اس کی حیثیت ہر طرح سے اہم گنی جاتی ہے۔ بنابریں فرانسیسی اطالوی اور انگریزی مقامی حکام جو مغربی سیاسی احتلال کے عمال ہیں ان وکیلوں کے احکام کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتے۔

علاوہ ازیں اعمال ان سینوسیہ بھی مغربی طاقتوں کی برملا مخالفت کرنے سے محترز ہیں۔ اب کچھ نہیں تو نصف صدی تک سینوسی جماعت اپنی اثر کو ترقی دینے میں کامیاب ہوتی آئی ہے۔ مگر انہوں نے سیاسیات میں نہایت حزم واحتیاط سے کام لیا ہے۔ گاہے گاہے انہوں نے کسی حد تک مغربی طاقتوں کے برخلاف تلوار بھی اٹھائی ہے۔ جس کا ثبوت جنگ طرابلس کے واقعات سے ملتا ہے۔ مگر سلسلہ سینوسیہ من حیث المجموع مغربی سیاست سے برسرپیکار نہیں ہوا۔

اور یہ روش قائدین سینوسیہ نے صرف مغربی طاقتوں کے متعلق ہی اختیار نہیں کی بلکہ غیر مغربی سلطنتوں کے متعلق بھی اسی طرح کی پالیسی پر کاربند رہے ان کا تعلق ترکوں سے کچھ بہت دوستانہ نہیں رہا۔ اور دور حمیدی میں جبکہ سلطان المعظم نے اپنی پان اسلامک تحریک میں خاص کامیابی حاصل کر لی تھی۔ سینوسی المہدی نے لفظی اختلاط و دوستی سے بڑھکر اظہار عقیدت کبھی نہیں کیا۔

مگر اس روش سرد مہری سے جو قائدین سلسلہ سینوسیہ نے دیگر اسلامی جماعتوں کے متعلق اختیار کر رکھی ہے۔ یہ نتیجہ پیدا نہ کر لینا چاہئے۔ کہ سینوسی فرقہ اب منمر اور آسائش پسند ہو چلا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ شب و روز سلسلہ کے استحکام کیلئے کوشاں ہیں۔ ان کے واعظین اور مبلغین مریدوں کی روحانی اصلاح کرنے اور ان کے جماعتی

نظام کو درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جماعت سنوسیہ کا اولین مقصد مسلمانانِ شمالی افریقہ کی اصلاح و تنظیم ہے۔ جس کے بعد وہ ساری دنیا میں تجدید و تنظیم جمعیت اسلامیہ کا اہم کام ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اسکی بنیاد پر سنین اوائل کی سی حکومت الہیہ کی عمارت کھڑی کی جا سکے۔ دوسرے لفظوں میں حقیقی اتحاد مسلمین پر ان کا ایمان ہے کہ اسلامی حریت اور سیاسی فلاح کی پہلی منزل روحانی فلاح ہے۔ اس لئے ان کی کوششیں فی الحال زیادہ تر اپنے مریدوں کے علویات خصائل اور روحانی جزئیات کو پاکیزہ بنانے کے لئے وقف ہیں۔ مگر اس کے ساتھ مادی ذرائع ترقی سے غفلت نہیں کی گئی۔ اس لئے آج کل سنوسی نخلستانوں میں زراعت کا انتظام دن بدن بہتر ہو رہا ہے۔ آئے دن نئے چاہات کھودے جاتے ہیں۔ قافلوں کی آسائش اور تجارت کے فروغ کیلئے کاروانسرائیں مسافرخانے غرضیکہ تمدنی اور معاشرتی بہبودی کے ہر قسم کے وسائل کام میں لائے جا رہے ہیں۔ شیخ سنوسیہ نے مہدی سوڈان کی سختی اور شدت غضب سے کراہیت کا اظہار کیا تھا۔

یہ اصول عمل سلسلہ سنوسیہ کی غیر متوقع حزم و تحمل کا ثبوت تھے اور اسلئے جماعت سلسلہ بتدریج مگر دن بدن ترقی کر رہی ہے اور وہ اس متیقن ترقی کو اس مخدوش طریق عمل پر ترجیح دیتے ہیں۔ جس سے وہ ایک ہی آن میں مغربی طاقت کا خاتمہ کر دیں۔ ان کے سو نہیں ہزاروں مقدم اور وکیل افریقہ کے عرض و طول میں لاکھوں نئے مریدوں کو اپنے حلقے میں داخل کر رہے ہیں، اور جنوبی سمت کیطرف لاکھوں حبشیوں کو نور اسلام سے منور کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کے روحانی احیا کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ان کی مشنری سپرٹ پھر سے عود کر آئی ہے گو اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں کی سعی تبلیغ کبھی بھی کم نہیں ہوئی اور اس کے زمانہ اقتدار کی کامیابی تو خیر عین انحطاط میں بھی اس کا مبلغانہ اصول کمزور نہیں ہوا۔ قرون وسطیٰ میں اسلام نے ہندوستان اور چین میں نمایاں ترقی کی اور ترکوں نے بلقان میں اسکی بنیادی قائم کر دی۔ چودھویں

اور سولہویں صدیوں کے درمیان تو اسلام نے ایسے دور دور مقامات میں کامیابی حاصل کی جیسے مغربی افریقہ۔ جاوا۔ سماٹرا ملایا و جزائر فلپائن۔ مگر اس زمانے کے بعد مبلغانہ کوششوں کا سلسلہ کسیقدر رک گیا اور اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کی غفلت یاس انگیز درجے تک پہنچ گئی۔

مگر انیسویں کے ابتدا میں اسلامی تحریک احیا کا آغاز ہوتے ہی مسلمانوں کا جذبہ غیرت پھر کچھ حرکت میں آیا۔ اور سوائے یورپ کے ہر جگہ اسلام پھر اپنی سابقہ تیزگامی سے آگے بڑھنے لگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر ایک مسلمان اپنے اندر کچھ نہ کچھ مشنری سپرٹ لیے ہوئے ہے۔ بنابریں تحریک جدید کے ماتحت نہ صرف ملاؤں اور مبلغوں نے جن کا پیشہ تبلیغ ہے۔ بلکہ تاجروں سیاحوں اور معمولی حیثیت کے مزدوروں نے بھی اس کے پھیلانے میں اعانت کی۔ اس حقیقت کا بین ثبوت سلسلہ ہائے جدید کے مریدوں کی روزانہ زندگی سے ملتا ہے۔ سنیوسی زاویوں سے ہزاروں کی تعداد میں پرجوش مرابوط یا معلم ہر سال ادہر اُدہر نکل جاتے تھے۔ اور اپنے خلوص اور فصاحت کے ذریعہ سے ایک دنیا کو اسلام کے فیوض سے بہرہ اندوز کرتے تھے۔ جو کامیابی ان کو افریقہ کے مغربی اور وسطی حصے میں نصیب ہوئی وہ حیرت انگیز ہے اور ہر ایک اجنبی سیاح اس امر کی شہادت دیتا ہے۔ ایک انگریز لکھتا ہے۔

"وسط افریقہ میں اسلام بسرعت ترقی کر رہا ہے وہ ہر جگہ اوہام پرستی کا استیصال کرتا جا رہا ہے۔ میری رائے میں اس کے مقابلے میں عیسائی مشنری کوشش کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ علیٰ ہذا ایک فرانسیسی پروٹسٹنٹ مشنری لکھتا ہے "ہم ہر جگہ اسلام کو بڑھتا ہوا پاتے ہیں۔ اسکی رفتار سست ہو جائے مگر اسکی حرکت کبھی بند نہیں ہوتی باوجود گوناگوں مشکلات اس کے نام لیوا شب و روز بڑھ رہے ہیں۔ ان کو عیسائیت سے کچھ عناد نہیں۔ کیونکہ وہ اس کی طرف سے بے خطر ہیں۔ مغربی قومیں فتح افریقہ کی تکمیل کی متمنی ہیں۔ مگر اسلام نے یہ مقصد تقریباً حاصل کر لیا ہے"۔

جس صورت سے اسلام نے جنوبی افریقہ کیطرف اپنا رسوخ بڑھایا ہے۔ اس کی

ایک دلچسپ مثال ذیل میں دیجاتی ہے۔ چند سال ہوئے۔ انگریزی حکام کو یہ معلوم ہونے لگا۔ کہ اسلام نیاسا لینڈ میں ترقی کر رہا ہے۔ اور اس کا باعث عربی سوداگروں کی کوششیں ہیں۔ دس سال کے اندر اندر کل نیاسا لینڈ پر اسلامی قبضہ ہوگیا۔ حالانکہ یہ تحریک قطعی طور سے انگریزی مفاد سیاسی کے منافی تھی مگر اس خوف سے کہ کہیں سرکاری مخالفت بد نتائج پیدا نہ کرے اسلام کی ترقی کو روکا نہ جاسکا۔ کئی انگریز اہل الرائے سمجھتے ہیں۔ کہ اسلام کا دریائے زمبیزی کو عبور کرکے جنوبی افریقہ میں داخل ہونا اب دنوں کی بات ہے۔

اس ترقی سے صرف حبشیوں کے باطل عقاید کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ عیسائیت کو بھی صدمہ اٹھانا پڑا ہے۔ مغربی افریقہ کے کئی مسلمان یورپی مشنوں کے ہاتھ سے نکلکر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے ہیں۔ اور براعظم کی دوسری طرف ملک حبشہ کی قدیمی عیسائیت کو اسلامی سیلاب کے آگے بہ جانے کا دغدغہ لگا ہوا ہے۔ اہل حبشہ کا قبول اسلام جنگ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ نہایت پُرامن طریق عمل کا نتیجہ ہوگا۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ ملک حبشہ کے بعض قبائل جو پچاس سال ہوئے اسلام سے قطعاً ناواقف تھے اب اسلامی رسم ورواج کے پابند ہیں۔

براعظم افریقہ میں اسلامی نشوونما کا بیان واقعی ایک حیرت انگیز داستان ہے۔ مگر اس کے علاوہ دنیا کے اور گوشوں میں بھی مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ باب اول میں ہیں نے روس تاتار میں اسلامی تحریک جدید کا ذکر کیا تھا۔ یہ روسی مسلمانوں کی بیداری کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو ان کی مبلغانہ کوششیں تھیں۔ روسی مسلمان ایک عرصے تک ایک متعصب عیسائی حکومت کے ماتحت رہ چکے ہیں۔ جو ایک نہیں کئی کوشش ان کو عیسائی بنانے کی کر چکی ہے۔ یہ کوششیں خال خال حالتوں میں کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں۔ لیکن جونہی اسلامی بیداری کی لہر مسلمانان روس تک پہنچی تو فوراً

ہی انہوں اپنے گمراہ شدہ بھائیوں کو دین برحق کیطرف لانے کی کوشش شروع کردی - اور عیسائی حکومت کے شدید مظالم کا مقابلہ کرتے ہوئے تھوڑے ہی دنوں میں برادرانِ راگم کردہ کو پھر سے مسلمان کرلیا۔ تاتاری مبلغانِ اسلام اب فنلینڈ کے نیم ترک نیم روسی عیسائیوں کیطرف متوجہ ہوئے اور روسی حکومت کی شدید مخالفت کے باوجود معتدبہ کامیابی حاصل کرلی۔

اسی طرح چین میں بھی اسلام کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ چین اور اسلام کا تعلق بہت اوائل زمانے سے عرب تاجروں اور مسلمان سپاہیوں کی کوششوں کی بدولت پختہ ہوچکا تھا۔ حالانکہ نومسلم طبقے کے لوگ چینی عورتوں کو مسلمان کرکے ان سے شادی بیاہ کرتے آئے ہیں۔ مگر پھر بھی چینی مسلمان اپنے آپ کو ایک طرح سے خاص اور بہتر جزو ملک سمجھتا ہے۔ چینی صوبہ یونین و وسطی صوبہ چھلی میں اسلامی عنصر بالخصوص غالب ہے۔ چینی نسل کی اسلامی آبادی کے علاوہ سلطنت چین چینی ترکستان میں لاکھوں مسلمان بستے ہیں جو دراصل ترکی نژاد ہیں اور جن کی چینی قومیت چینی فتح ترکستان کا نتیجہ ہے۔ کچھ بہت زمانہ نہیں ہوا چینی حکومت مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتی تھی۔ مگر انکی آزادروش نے عمالانِ حکومت کو ڈرادیا اور اب ان پر سختیاں ہونے لگیں۔ انیسویں صدی کے ابتدا میں بیداری اسلام کی صدائے بازگشت چین میں بھی گونجی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت سے لیکر ۱۸۷۰ء تک مسلمانانِ چین نے چینی سلطنت کے خلاف کئی مرتبہ بغاوت کی اور سن مذکورہ بالا میں ان ہنگاموں سے سارے کا سارا یونن اور ترکستان بھڑک اُٹھا اور مسلمانوں نے ہر جگہ غیر معمولی تہور اور مردانگی کا ثبوت دیا۔ ترکستان کی سرکشی کا محرک ایک قابل لیڈر شہزادہ یعقوب بیگ مرحوم تھا جس کی قیادت میں یونن اور ترکستان کے مسلمان قریب قریب خودمختار ہو بیٹھے تھے۔ اور بعض مغربی مدبرین تو یہاں تک سمجھے ہوئے تھے کہ نیام سلطنت مسلمانانِ چین مغربی اور اسلامی تسخیر سلطنت اب دنوں کا معاملہ ہے۔ یعقوب بیگ کا ڈنکا تمام عالم اسلامی میں بجنے لگا۔ حتیٰ کہ سلطان روم نے امیر المومنین کے ممتاز

سے لقب اُسے مخاطب کیا۔ کئی سالوں کے شدید محاربات اور قتل عام کے بعد چین نے اپنی سیادت از سر نو قائم کر لی۔ اس شدید انتقام نے چینی مسلمانوں کی تعداد بہت کم کر دی۔ لیکن ان کی جوش اور مستعدی بدستور قائم ہے۔ ان کی موجودہ تعداد بروئے اعداد یورپ ایک کروڑ تک قیاس کیجاتی ہے بنا بریں مسلمانانِ چین باوجود اس ناکامی کے دنیائے اسلام کا ایک موثر جزو ہیں اور ہر قسم کے امکانات مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے ان کے وجود کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

صدی سابقہ کی اسلامی کوششیں صرف انہیں بیانات تک محدود ہیں ہندوستان میں بھی جس کا ذکر پہلے نہیں کیا گیا۔ اسلامی تبلیغ کو خاص کامیابی حاصل ہوئی ہے اور سوماترا اور جاوا میں تو اس سے ساری کی ساری آبادی مسلمان ہوگئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپی سیاسی اقتدار کا نفوذ اسلامی تبلیغ کا معاون ہے نہ کہ مانع۔ کیونکہ جہاں کہیں ریل۔ تار۔ ڈاکخانہ۔ مطابع اور ایسے دیگر مفید انسٹی ٹیوشن موجود ہیں اسلامی تحریک کی معاون ثابت ہوئے ہیں۔

اب ہم اتحاد مسلمین کے اس پہلو پر بحث کریں گے۔ جو سید جمال الدین افغان مرحوم کے نام سے وابستہ ہے۔

سید مرحوم ایران میں ہمدان کے قریب ایک مقام اسد آباد میں پیدا ہوئے وہ افغانی الاصل تھے اور اُن کے لقب سید سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی رگوں میں ہاشمی خون بھی تھا۔ سید جمال الدین کمال درجے کے طباع اور ذہین واقع ہوئے تھے۔ اور ان میں ایک خاص قسم کی قوت مقناطیس تھی جو ہر کہ و مہ کی توجہ کو اپنی طرف کر لیتی تھی۔ ان کی قوائے نہایت اعلےٰ درجے کی حالت میں تھے اور ان کی ساری عمر مسلمانوں کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے میں گذری۔ ان کی سیاحت کا میدان مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کی معلومات عامہ دنیا بسبب سیاحت بے حد تھے اور انکے بہمہ پا فضائل وسیع تھا۔ اسی سبب سے جہاں کہیں گئے ایک دنیا کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ شیخ سینوسی کی حکمت عملی کے برعکس ان کا اصول تمامتر سیاسی تھا۔ سید جمال الدین مرحوم پہلا مسلمان تھا

جس نے مغربی سیاسی اقتدار کے سیلاب کی اہمیت کو محسوس کیا اور ساری عمر مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی تجاویز کی منادی کیلئے وقف کر دی علاوہ ان امپیریل ازم یورپ نے اسے ایک خطرناک مفسد سمجھا اور اسکی کارروائیوں کے روکنے کی ہر ممکن ذرائع سے کوشش کی۔ انگریز بالخصوص اس سے خائف تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ تک سید مرحوم کو ہندوستان میں نظر بند رکھا۔ جس کے بعد وہ ۱۸۹۰ء میں مصر گئے اور بطل حریت عربی پاشا کی سعی میں ہاتھ بٹایا۔ جب انگریزوں نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کیا تو انہیں فوراً وہاں سے نکال دیا۔ سید مرحوم کئی سالوں تک ممالک اسلامیہ کی سیاحت میں مصروف رہے اور آخر قسطنطنیہ پہنچے۔ یہاں سلطان عبدالحمید مرحوم ان کے خیالات کے حامی پہلے ہی سے تھے۔ اور انہوں نے ان کو صیغہ پان اسلامک پروپاگنڈا کا صدر مقرر کیا۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا۔ کہ خود سلطان مرحوم کی کوشش سید جمال الدین کی اعانت سے کامیاب ہوئیں۔ سید مرحوم ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ میں انتقال فرما گئے۔ اور تادم موت اپنے اصولوں کی تبلیغ میں بہ کمال جانفشانی پر مصروف رہے۔

ان کے اصولوں کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

اپنے اندرونی اختلافات کے باوجود عیسائی دنیا مشرق بالخصوص دنیائے اسلام کی بیخ کنی پر تلی ہوئی ہے اور تمام اسلام سلطنتوں کی تباہی اس کا خاص مقصد ہے۔

قرون وسطے کے خونین کارناموں کی سپرٹ جن کا تاریخی نام "محاربات صلیبیہ" ہے یورپ میں موجود ہے۔ اب تک شدید عیسوی تعصب سے پاک نہیں ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حالات کچھ ہی ہوں۔ بین الاقوامی معاملات میں اسلامی قوموں اور ملکوں کے ساتھ رواداری نہیں برتی جاتی۔

"عیسائی حکومتیں مسلمانوں کی پس ماندگی کے عذر کی آڑ میں تو اپنی چیرہ دستیوں کو جائز قرار دیتی ہیں۔ مگر جہاں کہیں ترقی اور اصلاح کی کوشش رونما ہوتی ہے۔ تو اس کے روکنے کے ہر ممکن ذرائع اختیار کرتی ہیں"۔

تمام عیسائی فرقے اپنی ذاتی رقابتوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے تعصب میں متفق ہیں۔ اور اس سپرٹ کا نتیجہ اسلامی حریت کا استیصال ہے"۔

عیسائی دنیا مسلمانوں کے ہر ایک احساس اور جذبہ کو بنظر حقارت دیکھتی ہے اور جو حسیات یورپ میں وطنیت اور حب الوطنی کے نام سے مشہور ہیں ان جذبات کے مشرقی مظاہرات کو کورانہ تعصب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن شمائل کو یورپ میں شرف ذاتی۔ فخر قومی۔ اور حمیت کہا جاتا ہے۔ مشرق میں ان کو تمرد اور تند خوئی کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جو چیز یورپ میں غیرت قومی کہی جاتی ہے۔ مشرق میں اس خواہش کا نام "زینو فوبیا" ہے"۔

ان وجوہات کی بنا پر میں دنیائے اسلام سے اپیل کرتا ہوں۔ کہ وہ ایک مدافعانہ اتحاد میں منسلک ہو اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کیلئے مغربی اصول جنگ و استحکام و تنظیم قوت کا پورا پورا مطالعہ کرے"۔

یہ مختصر بیانات سید جمال الدین مرحوم کی کیفیت قلب کا پتہ دیتے ہیں۔ جس کی تبلیغ میں اس نے اپنی ساری عمر گذار دی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا۔ کہ سید مرحوم کو مغربی سیاسی ترقی سے کسقدر خوف لگا ہوا تھا۔ سید جمال الدین کے علاوہ اور کئی ایک سربرآوردہ مسلمانوں نے اسی قسم کی تلقین کی۔ بطورِ مثال میں ایک جیّد ترکی مدبر عالی پاشا کی تقریر کا ایک جملہ ذیل میں دیتا ہوں۔ جو انہوں نے اپنے محل قسطنطنیہ میں ایک مقتدر پان اسلامک مجمع کے سامنے کی تھی۔ آرمینیس ومبیری مجاری مستشرق اس جلسے میں موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ پاشا موصوف نے فرمایا۔ اس پُرخطر زمانے میں ہم مسلمانوں کی تمنا ہے۔ کہ ہمارے جذبہ مذہبی میں ترقی ہو نہ کہ تنزل"۔

ایسے خیالات کے وجود پر سلطان عبدالحمید مرحوم نے اپنے پان اسلامک پروپاگنڈا کی بنیاد رکھی تھی۔ سلطان مرحوم تاریخ کی عجیب وغریب شخصیتوں میں سے ہے۔ سلطان کے عالی دل و دماغ میں بعض دفعہ ایسے خیالات آتے تھے۔ مجھے میں

طفلانہ اور مضحکہ انگیز کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ بڑی بڑی سکیموں کی تکمیل نہایت پیچیدار حکمت عملیوں سے کیا کرتے تھے۔ فطرتی طور پر استبداد پسند واقعہ ہوئے تھے۔ لیکن بسا اوقات ایسے لوگوں کی رائے پر کاربند ہو جاتے تھے۔ جو ان کی نبض پہچانے ہوتے تھے۔

سلطان عبدالحمید مرحوم ۱۸۷۶ء میں تاریخ ترکی کے نازک ترین زمانے میں تخت نشین ہوئے سلطنت روس ترکی پر ایک شدید حملے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

معاملات حکومت ایسے مدبرین کے ہاتھوں میں تھے۔ جو سلطنت عثمانیہ میں ہر قسم کے مغربی نظام کو منجملہ جس کے پارلیمنٹ ایک تھی۔ رواج دینے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ مگر سلطان مرحوم نے ان تمام جدتوں کو یک قلم موقوف کر دیا۔ معاملات کی اس ابتری سے فائدہ اٹھا کر جو جنگ روس کے بعد پیدا ہو گئیں۔ انہوں نے پارلیمنٹ کا خاتمہ کر دیا۔ اور شخصی حکومت کو بحال کر دیا۔ اس تبدیلی کے بعد سلطان نے اپنی پان اسلامک سکیم کے مختلف پہلوؤں کو عملی صورت دینی شروع کی۔ سلاطین سابقہ کے دستور العمل کے برعکس سلطان عبدالحمید نے اپنے منصب خلافت سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اپنی سیاسی قوت پر زور دینے کے بجائے انہوں نے اپنی روحانی منصب کے رعب کو اس طور سے استعمال کرنے کا اعادہ کیا کہ یورپی سلطنتیں دنیائے اسلام کی برانگیختگی کے خطرات سے متاثر ہو سکیں۔ اس سے کئی سال قبل سلطان مرحوم اپنی پان اسلامک سکیم کو پوری طرح سے میدان عمل میں لا چکے تھے قسطنطنیہ سید جمال الدین جیسے پُرجوش مدعیانِ اتحاد مسلمین کا مرکز بن گیا۔ جہاں سے اب منتخب پان اسلامک داعی دنیا کے ہر گوشے میں بھیجے جانے لگے تاکہ مسلمانوں کو غفلت سے بیدار کریں۔ اور انہیں غیر مسلم حکومتوں سے آزاد ہونے کی ترغیب دیں۔

سلطان مرحوم کا پان اسلامک پروپاگنڈا تقریباً تیس سال تک جاری رہا۔ یہ اندازہ لگانا نہایت ہی مشکل ہے۔ کہ اس پروپاگنڈا کا کیا نتیجہ ہوا۔ بالخصوص اس لئے کہ انقلاب انجمن اتحاد و ترقی نے سلطان کو تخت سے برطرف کر کے دور حمیدی کے تمام معاملات کو تہ و بالا کر دیا۔ کم از کم اتنا تو ضرور معلوم ہے۔ کہ اس کی آزمائش کس قسم کی اسلامی یورپی جنگ سے نہیں ہوئی۔ اس لئے میرا قیاس اسکی قوت کے متعلق محض جزوی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر

اس میں شبہ نہیں کہ یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا۔ کہ سلطان مرحوم کا رتبہ تمام دنیائے اسلام میں بڑھ گیا۔ اور انہوں نے اسلامی اتحاد کا ایک مرکز پیدا کر دیا۔ دنیا کے ہر گوشے سے خلیفہ وقت کے ثناخواں جوق در جوق اسلامبول میں آنے تو ضرور رہے مگر اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ عملی طور پر واقعی پان اسلامزم یورپی طاقتوں کیلئے موجب خوف ہو گئی۔ علاوہ بریں شیخ سنوسی کی عقیدت خلیفہ وقت کے ساتھ کبھی بھی درجہ ثبات تک نہیں پہنچی۔ اور لبرل مسلمان سلطان کی مستبد حکمت عملیوں اور اسکی حکومت کی بے انتظامی سے ہمیشہ شاکی رہے۔ اس لئے یہ امر ہمیشہ مشکوک رہیگا۔ کہ اگر سلطانِ مرحوم کسی وقت مغربی طاقتوں کے برخلاف علم جہاد بلند کرتے تو انہیں کامل کامیابی ہو جاتی۔

پھر بھی سلطان مرحوم نے تحریک اتحاد مسلمین کو ہر ممکن وسائل سے ترقی دینے میں کامیابی حاصل کی۔ یہیں یہ ضرور کہونگا۔ کہ یہ ترقی جمہور اسلام کے یورپ سے نفرت کرنے کا نتیجہ ہے نہ کہ عقیدت بہ خلافت کا۔ خیر کچھ ہی ہو۔ تحریک پان اسلامزم کی کامیابی اب ایک تاریخی حقیقت ہے اور مسلمانوں کے مستقبل میں اس نے ایک خاص جگہ حاصل کر لی ہے۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب نوجوانانِ ترک نے حالات کو بہت پیچیدہ کر دیا۔ اور اس کے بعد جلد ہی انقلابِ ایران اور دیگر ممالک اسلامی کے مختلف النوع تغیرات مثلاً تحریک آزادی نسوان مشروطیت۔ وطنیت وغیرہ رونما ہوئے۔ ان تغیراتِ عظیم کا اثر جہاں تک تحریک اتحاد مسلمین کا معاملہ ہے۔ نہایت ہی غیر متوقع ہوا۔ پان اسلامک جذبہ اب ان جدید تحریکات کے نیچے دب گیا اور دنیائے اسلام میں عام انتشار اور ہیجان قلوب کا سماں بندھ گیا۔

خوش قسمتی سے یہ انتشار و ہیجان نہایت ہی قلیل مدت تک رہا۔ ۱۹۱۲ء کے شروع ہوتے ہوتے تحریک اتحاد مسلمین نے اپنا توازن قائم کر لیا۔ اور اسکی وجہ پھر وہی نکلی۔ جو اس کے آغاز کا موجب ہوئی تھی۔ یعنی یورپی طاقتوں کی زیادتیاں ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے بغیر حیلہ و حجت دولت عثمانیہ کے صوبہ طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے ترکی سے جنگ چھیڑ دی۔ اور اسے اپنے یورپی مقبوضات سے محروم کر کے دنیائے اسلام

میں سراسیمگی کی حالت پیدا کر دی۔ اسی زمانے میں برطانیہ اور روس نے ملک ایران کا گلا آدبایا اور معاہدہ الجزیرہ کی آڑ میں فرانس نے مراقشی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ تو گویا دو سالوں کے قلیل عرصے میں مسلمانوں کی رہی سہی طاقت پر وہ حملے ہوئے۔ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی اور اس پر طرہ یہ کہ ان کی طرف سے ان حملوں کا کوئی اشتعال نہیں دیا گیا۔

مسلمانوں پر ان صدمات کا شدید اثر ہوا۔ دنیائے اسلام ایک سرے سے دوسرے سرے تک غم و ماتم میں مبتلا ہو گئی۔ قدرتی طور پر مدعیان پان اسلامزم نے ان واقعات کو صدی سابقہ کے سید جمال الدین جیسے داعیان تحریک اتحاد مسلمین کی آگاہی خطرات آئندہ کی تصدیق قرار دیا۔ اور یورپی جذبۂ صلیبی کا ثبوت گردانا۔

اس یاس انگیز غم و غصہ کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ طرابلس میں جہاں ترک اور عرب جن کے تعلقات کچھ بہت امید افزا نہ تھے۔ پرانی کدورتوں کو بھول کر دفعتاً اخوت اسلامیہ کی مضبوط رشتوں میں جکڑے گئے۔ اور ایک دنیا کے مسلمانوں کو اپنا ثنا خواں بنا لیا۔

یورپی مدبر احیائے اتحاد مسلمین کے ان درخشندہ مظاہرات سے بہت خائف تھے اور بقول جبریل ہنا تو وزیر خارجہ فرانس آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ آخر طرابلس میں کیا دیکھا ہے۔ جسے طالوی ختم کرنے میں دیر لگا رہے ہیں۔ وزیر فرانس کہتا ہے وہ دیر اس لئے لگ رہی تھی۔ کہ وہ جنگ طرابلس نہ تھی بلکہ جنگ یورپ و اسلام تھی۔ اطالویوں نے اسلامی جذبات پر نہایت بے شرمانہ حملہ کر کے دنیائے اسلام میں ایک آگ مشتعل کر دی تھی۔ جس کے اثر سے یورپ کی باقی ماندہ طاقتیں محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں۔ ایران میں انگریزوں اور روسیوں کی چیرہ دستیوں پر لعنت کیجاتی تھی۔ اور مراقش کی تباہی کے خیال سے جس کا خطرہ لگا ہوا تھا مسلمان بحالت غم و ہراس کانپ رہے تھے۔

جنگ بلقان کے چھڑ جانے پر تو اس غصہ کی انتہا نہ رہی۔ چین سے لے کر کانگو تک کروڑ مسلمانوں کے دل اپنی بے بسی سے چور تھے۔ خود ترکوں کی آخری شکست نے مسلمانوں کی رہی سہی امید پر پانی پھیر دیا۔ ان جذبات کا اندازہ ایک ہندوستانی مسلمان لیڈر کے بیانات سے لگ سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ شاہ یونان ایک مذہبی جنگ کا اعلان کرتا

ہے۔ لندن کے دیوان وزارت سے عیسائیوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا جارہا ہے۔ اور پھر وگراؤڈ سے جامع صوفیہ کے گنبد پر پرچم صلیب کے گاڑے جانے کی پیشین گویاں ہو رہی ہیں۔ آج یہ پرچے ہو رہے ہیں۔ کل یروشلیم کی جامع عمر کی باری آنے والی ہے۔ اے برادران اسلام۔ وہ وقت آن پہنچا ہے۔ جبکہ ہر ایک مسلم کو علم خلافت کے نیچے آکر جان دے دینی چاہئیے۔ ایک اور ہندوستانی مسلم لیڈر کہتے ہیں۔ میں برطانوی حکومت سے اپیل کرتا ہوں۔ کہ وہ اپنی مخالفانہ روش چھوڑ دے۔ تاکہ اسے وہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہو جبکہ جھلائے ہوئے مسلمانوں کی آہ سوزاں اس کے دیوان شوکت کو نیست و نابود کر دیگی۔

سب سے بڑھ کر معنی خیز وہ اپیلیں تھیں۔ جو مسلمانوں نے غیر مسلم ایشیا یوں سے کیں اور ان سے دوستی کے ملتجی ہوئے۔ معاملات کا یہ رنگ ایسا ہی تحیر خیز ہے۔ جیسا کہ خوف انگیز ہے رسول عربی نے تورات اور انجیل کی ہمیشہ عزت کی ہے۔ اور اسلام رسول اکرم کو موسےٰ اور عیسےٰ جیسے پیغمبروں کا جانشین قرار دیتا ہے۔ اسی لئے یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل کتاب کہا گیا ہے۔ مگر جہاں اہل کتاب کے ساتھ یہ رواداری برتی گئی ہے۔ وہاں بت پرستی اور بت پرست فرقے کی مذمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ اس لئے مسلمانوں کے تعلقات ہندؤں یا بدھ مذہب کے پیروؤں سے قبل از تحریک جدید بہت اچھے نہ تھے۔

اس نئے رنگ کی اولیں علامات دوران جنگ روس و جاپان میں نمودار ہوئیں۔ مسلمانو کا جذبہ نفرت یورپ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ حالانکہ جاپانی کسی کتابی مذہب کے پیرو نہ تھے۔ پھر بھی ان کی فتوحات پر بے حد خوشی کا اظہار کیا گیا۔ مشرق اقصےٰ کی ممتاز ترین قوم میں اسلامی اصولوں کی تبلیغ مدعیان پان اسلامزم کا قدرتی مقصد قرار پا گیا۔ چنانچہ جاپانیوں سے رابطہ بڑھانے کی کوشش بھی کی گئی۔ تبلیغی لٹریچر کی اشاعت کی گئی۔ مبلغ منتخب کئے گئے اور سلطان عبدالحمید نے ایک جنگی جہاز پہ ایک سرکاری وفد کو جاپان روانہ کیا اور دنیائے اسلام جاپان میں ترقی اسلام کے خواب دیکھنے لگی۔ ایک مصری اخبار نویس نے لکھا ہے انگریز جاپانیوں کے قبول اسلام سے بے حد مخالف ہیں۔ اگر جاپان مسلمان ہو جائے۔ تو اسلامی پالیسی میں ایک غائر تبدیلی واقعہ ہوگی۔ اس طرح ایک چینی مسلمان شیخ نے فرمایا تھا

اگر جاپان کو ایک بہت بڑی طاقت بننے اور براعظم ایشیا کو دنیا کی سیادت بخشنے کا شوق ہے۔
تو وہ اس پرعظمت مقصد کو اپنی قبولیت دین برحق سے ہی پورا کر سکتا ہے +

ہاں "مسلم جاپان" کا خواب دیکھنے والوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ داعیان اسلام کے ساتھ جاپانیوں کا حسن اخلاق ان کے ارادہ قبولیت اسلام کی دلیل نہیں۔ اس بحث سے میرا مقصد یہ واضح کرنا تھا۔ کہ مسلمانوں کے غیر مسلم ایشیائیوں کے ساتھ تعلقات دوستی پیدا کرنے کا خیال ہو چلا تھا۔ اور جنگ بلقان نے اس کوشش کے لئے تازیانے کا کام دیا۔ اس حقیقت کا مزید ثبوت ان بے شمار اپیلوں سے ملتا ہے جو مسلمانان ہندوستان نے اپنے ہندو ہموطنوں سے کی ہیں۔ اس قسم کے خیالات کی اشاعت ایک تحریر موسومہ "پیغام مشرق" سے ہوتی ہے۔ اس میں ایک مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔ "اے روح مشرق بیدار ہو اور مغربی اقتدار کا خاتمہ کر دے۔ اے مادر ہندوستان کے فرزندو۔ آؤ۔ اور اپنے قدیمی تمدن۔ دوست اور فراست سے ہماری مدد کرو۔ ہمیں اپنی حمایت سے قوت دو۔ اور اپنے ازلی حقوق کا ہمیں شریک بناؤ۔ آؤ ہمالیہ کے خدائے قادر سے ہم مل کر برکت ملتجی ہوں۔ اپنے میدان جنگ کے دیوتاؤں سے منت کرو کہ وہ آج اپنی روحانی امداد ہمیں بخشیں اور اس میں اپنے دشمنوں پر فتحمند کریں" +

وہ لوگ جو مسلمانوں کے تعصب پرستی سے واقف ہیں۔ ان بیانات کو تعجب سے پڑھینگے۔ اور ان سے اس انقلاب انگیز تغیر ذہنی کا پتہ چلتا ہے جس کا اثر دنیا کی آئندہ تاریخ میں محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ جذبات ہندوستانی مسلمانوں کا مخصوص حصہ نہیں۔ چینی مسلمان بھی اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ چینی ترکستان کے ایک اسلامی اخبار میں لکھا گیا تھا۔ "اے اہل چین دنیائے مغرب کے مقابلے میں سارے ایشیا کا اتحاد ایک امر ضروری ہے۔ یورپ کی رعونت اب انتہائی درجہ سے بڑھ چلی ہے۔ اور اگر اقوام مشرق آج بیدار نہ ہوئیں اور یورپی خطرے سے غافل رہیں۔ تو اس کی رہی سہی آزادی کا خدا حافظ" انقلاب چین اور قیام حکومت جمہوری کی ابتدائی منزلوں میں مسلمانان چین نے پرانی کاوشوں کو بھولجانے اور اپنے جذبہ حب الوطنی کا نہایت اعلیٰ

ثبوت دیا۔ ڈاکٹر سن یٹ سن صدر جمہوریہ چین نے اس کا اعتراف ذیل کے الفاظ میں کیا ہے۔ اہل چین اپنے مسلمان ہموطنوں کی امداد کو جو انہوں نے مادر وطن کی سیاسی فلاح کے باب میں کی ہے۔ ہمیشہ کے لئے احسانمندی کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

جب جنگ یورپ کے شعلے بلند ہوئے۔ تو اس وقت اسلامی جذبات کی یہ کیفیت تھی۔ ہر جگہ مسلمان یورپی قوموں کی تعدیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی یکجہتی کا پورا پورا علم تھا۔ اور وہ ہر طرح ایشیائی قوموں کو مغربی امپیریل ازم کے مقابلے میں متحد کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

یہ امر موجب حیرت ہوا ہوگا۔ کہ ایسے حالات کے ہوتے ہوئے ترکی کے اعلان جنگ پر کیوں کسی قسم کا ہنگامہ اسلامی دنیا میں برپا نہیں ہوا خصوصاً جبکہ سلطان المعظم نے اعلانِ جہاد بھی کر دیا تھا۔ میری دانست میں یہ اعلان بالکل بے اثر ثابت نہیں ہوا حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ہر ایک گوشے میں مغربی سلطنتوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مصر میں مسلمانوں نے انگریزی قوت کو خطرے میں ڈال دیا جس کا ازالہ کثیر التعداد انگریزی سپاہ کی موجودگی سے ہوا طرابلس میں عربوں نے اطالویوں کا یہاں تک ناطقہ بند کیا کہ ان کو اپنی بیڑے کی توپوں کے نیچے پناہ لیتے بن پڑی۔ ایران ترکوں کی امداد کیا ہی چاہتا تھا۔ کہ روسیوں اور انگریزوں کی بروقت مداخلت نے اس کو اس فعل سے روک لیا۔ اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر اہل قبائل کی روک تھام کے لئے کم وبیش اڑھائی لاکھ انگریزی فوج چھاؤنی ڈالے پڑی رہی۔ انگریزی حکومت نے اس امر کا سرکاری طور پر اعتراف کیا ہے۔ کہ ۱۹۱۵ء نے اتحادی اپنے ایشیائی اور افریقی مقبوضات کے نقصان سے بال بال بچے۔

ان اسلامی ممالک میں بغاوت ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ اگر اسلامی لیڈر ذرہ سا بھی اشارہ کر دیتے۔ مگر وہ اشارہ نہیں کیا گیا۔ برعکس اس کے زیرک لیڈرانِ اسلام نے نہ صرف انجمن اتحاد وترقی کے خلافِ تدبر فعل کی حمایت نہ کی بلکہ مسلمان عوام کو ان کے جذبہ تعصب سے باز رکھا۔

ان لیڈروں کی روش ان کی معاملہ فہمی کی دلیل ہے۔ انہوں نے بھانپ لیا۔

ؔمغرب کے ساتھ آخری جنگ کا ابھی وقت نہیں آیا۔ اِس وقت تک مسلمانوں کے پاس نہ صرف مادی مصالحہ کی کمی تھی۔ بلکہ اِن کا آپس میں کا نظام ابھی تک پختہ نہیں ہو چکا تھا۔ اور نہ ہی اپنے بعض غیر مسلم حلفا کے ساتھ صورت اتحاد کسی صحیح منزل تک پہنچ چکی تھی۔ اور اِن تمام امور سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے۔ کہ مسلمانوں میں اخلاقی قوت کی بھی کمی تھی۔ اِن کا بلا شبہ یہ قیاس تھا۔ کہ خلیفۃ المسلمین کا اعلانِ جہاد فی الحقیقت برلن میں تیار کیا گیا ہے۔ اور اِن میں سے بعض یہ بھی جانتے تھے۔ کہ جمعیت نوجوانانِ ترک کے افراد نہ صرف نسلاً غیر ترک ہیں۔ بلکہ اِن کا جزوِ قوی محد یہودیوں پر مشتمل ہے۔ دور اندیش مسلمان محض جرمن کے ذریعہ اقتدار بننے سے محترز تھے۔ اور وہ اِس امر کا یقین رکھتے تھے۔ کہ جرمن کے ساتھ اتحاد محض ایک مغربی حاکم کی بجائے دوسرے کی قبولیت کا اظہار ہے۔ اور انہوں نے اپنے دلوں میں یہ طے کر لیا۔ کہ یورپی طاقتوں کی خانہ جنگی میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔ اور بعد از جنگ ان کے ارادوں کا انتظار کرنا چاہیئے۔

صلح ورسائی نے یورپی منصوبوں کا راز افشا کر دیا اور بقول لیڈران اتحاد اسلام مسلمانوں کو اخلاقی قوت استوار کرنے کا موقع دیا۔ ورسائی کے بعد یہ صاف اِس طور پر معلوم ہونے لگا۔ کہ یورپی طاقتیں مشرقِ وسطےٰ اور مشرقِ قریبہ میں اپنی مستبدانہ روش سے باز نہیں رہ سکتیں۔ دورانِ جنگ اتحادیوں نے کئی ایک خفیہ عہد ناموں کے رو سے باقی ماندہ سلطنت ترکی کو آپس میں بانٹ لیا گیا تھا۔ اور یہ خفیہ عہد نامے فی الحقیقت عہد نامہ ورسائی کی جان تھے۔ علاوہ بریں انگریزوں نے جنگ کے شروع ہوتے ہی مصر پر "اعلانِ حفاظت" کر دیا اور کانفرنس ورسائی کے خاتمے پر انگلستان نے ایک عہد نامے کا اعلان کیا۔ جس کے رو سے ایرانی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اِن تمام واقعات کا ماحصل یہ نکلا کہ مشرقِ قریب و وسطےٰ کے مسلمان پہلے سے کہیں زیادہ محکم یورپی قبضے میں جکڑ لئے گئے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔ ہر ایک شخص اِس امر کو روزِ روشن کی طرح جانتا ہے کہ یورپی طاقتوں نے دورانِ جنگ میں ایک نہیں صدہا مرتبہ اِس وعدے کا اعادہ کیا تھا۔ کہ جنگ عظیم کی اصلی غرض و غایت ضعیف قوموں کی بحالی آزادی ہے۔ مشرق میں یہ تمام وعدے زبان زد ہو چکے تھے۔ مگر جب قرار دادہائے بعد از جنگ کی حقیقت منکشف ہوئی تو تمام

اسلامی دنیا میں غصے کی اور مایوسی کی ایک لہر پھر گئی اور جذبات حمیت قومی کی تندی آنے والے طوفان کا پتہ دینے لگی۔ صورت حالات اس قدر مخدوش ہوگئی۔ کہ بعض نبض شناسان مشرق نے تبدیلی پالیسی کی پرزور سفارش کی۔ لیون کیتانی ڈیوک آف سرمونیتا نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کہ مراقش الجزائر و تیونس کے فسادات۔ طرابلس کی شورشیں مصر۔ عراق اور شام کے ہنگامے محض اس بنیادی جذبہ حمیت ملی کا پتہ دیتے ہیں۔ جو آج کل سارے عالم اسلام میں رونما اور مسلمانوں کو یورپی پنجہ استبداد سے آزاد کرانے کا محرک ہے ۔

یہ بیانات ان واقعات کی سچی پیشین گوئی ثابت ہوئی۔ جو ان کے بعد ظہور میں آئے۔ یہ واقعات مسلمانوں کے جذبۂ وطنیت سے اس قدر الجھے ہوئے ہیں۔ کہ میں ان کی بحث میں اس باب میں پڑنا نہیں چاہتا۔ فی الحال صرف پان اسلامک مظاہرات تک اپنے بیان کو محدود رکھوں گا۔ یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئیے۔ کہ اسلام کی تحریک وطنیت اور تحریک اتحاد مسلمین کے درمیان خواہ کیسا ہی اختلاف ہو۔ ان دونوں کی اصلی غرض و غایت یورپی اقتدار کی بربادی ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اب پان اسلامزم کی موجودہ حالت پر ایک نظر دوڑائیں گے۔

یہ امر واقعہ ہے۔ کہ جنگ سے اور اس کے بعد کے یورپی منصوبوں نے پان اسلامزم کو بہت ترقی دی ہے۔ اور اس پان اسلامزم کا مدعا صرف یورپی اثر کی مدافعت ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک رشتہ اخوت میں منسلک کرنا اس کی اولین غرض ہے۔ رشتہ اخوت صرف مذہبی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ غرضیکہ ہر ایک پہلو کو لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ اسلامی دنیا میں چین سے لیکر مغرب تک تمام قوموں کے رسم و رواج اور دستور زندگی ایک ہی سا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام علاوہ مذہب ہونے کے ایک سوشل سسٹم بھی ہے۔ جس میں جماعت کے مختلف افراد کے لئے دینی اور دنیوی اصلاح کے بہترین اصول مرتب کئے گئے ہیں۔ اس میں فلسفہ بھی ہے اور تکمیل علوم و فنون بھی۔ گویا من حیث المجموع اسلامی دنیا ایک ہی قوم کہلائی جا سکتی ہے۔

اس اسلامی سسٹم کے تمام مسلمان دلدادہ ہیں۔ مسلمان خواہ لبرل ہوں یا متعصب

تمام اسلامی اخوت کے مرکزی اصول پر یکدل ہیں۔ بطورِ مثال میں یہاں مشہور و معروف مسلمان لبرل یعنی آغا خان کی رائے کا اقتباس درج کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔ پان اسلامزم کی ایک صحیح اور معتدل صورت ہے۔ جس پر سب قسم کے مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں یہ اصول اخوت بین المسلمین ہے۔ یہ چیز ہمیشہ مسلمانوں کی روحانی اور تمدنی اتحاد کا موجب ہوگا اور پیروان دین برحق کے لئے یہی چیز اِن کی زندگی اور اِن کے ایمان کی بنیاد ہے ✦

اِن خیالات سے جو ایک نہایت ہی منتخب اسلامی شخصیت کے خیالات ہیں۔ دنیا کے کروڑوں غیر تعلیم یافتہ متعصب مسلمان کے خیالات کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اور اس گروہ کا تعصب محض یورپی ظلم و تعدی کا نتیجہ ہی نہیں۔ بلکہ اِن کی اسلامی خلقت کا جس کے رو سے وہ کسی غیر اسلامی اصول یا سسٹم کو ایک نظر نہیں دیکھ سکتے۔ بدقسمتی سے یورپی استبداد نے اِس تعصب کو وہ چند زیادہ کردیا ہے۔ اور اِن حالات کے قدرتی نتائج کو مدِنظر رکھتے ہوئے میرا قیاس ہے۔ دنیائے مستقبل کے لئے شاید خطرات پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اِن کی تحقیر دلیل ہوشمندی نہیں۔ بعض مغربی لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ نوجوانانِ ترک کے اعلانِ جہاد کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا جہاد ایک ناممکن العمل صورت ہے۔ برخلاف اِس کے ایک جرمن سٹاف افسر نے مجھ سے کہا۔ کہ ترکوں کا جہاد اِس لئے کامیاب نہیں ہوا۔ کہ وہ فی الحقیقت جہاد نہ تھا۔ اور میری رائے میں بھی یہی بات اِس نقلی جہاد کی ناکامی کا باعث ہوئی ✦

یورپی چیرہ دستیوں کا سلسلہ جس سے تمام دنیائے اسلام ایک ایک کر کے اپنی آزادی سے محروم کیجا رہی ہے۔ آخر اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہیگا۔ آج ایک حقیقی جہاد کے تمام مصالحہ جمع ہو رہے ہیں۔ آرمینیس ڈیمبیری جیسے دور بین اہل الرائے کے خیال کے مطابق یورپی قوموں کو اپنی امپیریل ازم کے حد بندی کرنی چاہیئے۔ اِس نے تو ۱۸۹۸ء ہی میں کہہ دیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اسلامی خطرہ ہر لحظہ ترقی پر ہے۔ اور حال کے واقعات نے مسلمانوں کی قوتِ مدافعت کو دہ چند بڑھا دیا ہے۔ اِس بیان سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ اسلامی جذبات میں سالہائے سابقہ کے حالات نے نمایاں تغیر پیدا کر دیا ہے۔ اور زمانِ حال کے سریع الرفتار

ذرائع پیغام رسانی کے ہوتے ہوئے یورپی پولیٹیکل منصوبوں میں اس کا جائز لحاظ رکھنا چاہیئے +

بیسویں صدی کے یورپی مجاہدانِ صلیب کو یہ ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ دُنیا میں ایک نئی طاقت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کا نام اسلامی پریس ہے۔ اور اس کے ادارہ ہائے اشاعت دنیاء اسلام کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ترکی ہندوستان۔ ایران۔ وسط ایشیا۔ جاوا۔ مصر۔ الجزائر میں مقامی اخبارات روز افزوں تعداد میں چھپکر تقسیم ہوتے ہیں۔ اور نہایت غور سے مطالعہ کئے جاتے ہیں۔ ہر ایک وار کی رپورٹ جو اسلامی دنیا کے وجود پر کیا جاتا رفتار برقی سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل جاتی ہے۔ تجارتی قافلے اِن خبروں کو صحرائے افریقہ اور بیابانہائے چین کے دور دراز مقامات تک پہنچا دیتے ہیں۔ جہاں کے لوگ اِن پر اپنے اپنے طریقوں سے بحث کرتے ہیں۔ یورپی دیوانوں کی سیاسی چنگاریاں اسلامی دنیا میں شعلے بن کر چمکتی ہے۔ فرمیسہ کے "ترجمانِ حقیقت" کے کلمات پر قسطنطنیہ کا "اقدام" ریویو کرتا ہے اور اِن ہر دو کے اقتباسات لندن کے مسلم سٹینڈرڈ" اور لاہور کے "زمیندار" میں نشر پاتے ہیں +

اِس میں کلام نہیں کی فی الحال اسلامی مدافعت کی تاریں غیر مربوط صورت میں ہیں مگر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ایک ہی واقعہ اِن تاروں کو ایک ایک مضبوط رسے کی شکل میں یکجا نہ کر دیگا"

پروفیسر وہمبیری نے یہ جملہ کم و بیش بیس سال ہوئے لکھا تھا۔ اور آج تو حالت ہی دگرگوں ہیں۔ اسلامی تحریکات اپنے زمانہ طفولیت سے نکل کر آج کل اپنے عہد شباب میں قدم رکھ چکی ہیں۔ اور ایک ہمہ گیر پروپاغندا ہر گھڑی دن کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ پان اسلامک پریس نے گذشتہ بیس سالوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ۱۹۰۰ء میں ساری دنیائے اسلام میں اخبارات کی تعداد ۲۰۰ سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ۵۰۰ ہوگئی اور ۱۹۱۵ء میں تو کچھ نہیں ۱۰۰۰ سے اوپر ہی ہوگی۔ ریل تار اور اِس قسم کے اور رسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ایک فرانسیسی سیاح ایم۔ رین کہتا ہے۔ آج کل ہر ایک اسلامی خطۂ دنیا دوسرے

کے حالات سے آگاہ ہے۔ اور آگاہی کا باعث سیاح۔ تاجر۔ زائر اور نامہ نگار ہیں۔ مصر کے اخبارات۔ بغداد۔ طہران اور پشاور میں لوگوں کو پڑھتے ہوئے دیکھا ہے قسطنطنیہ کے اخبارات بصرہ اور بمبئی میں۔ اور کلکتے کے اخبارات مکہ۔ کربلا اور پورٹ سعید میں دیکھے ہیں۔ علاوہ اِن کے داعیان اتحاد مسلمین جو سوداگروں۔ طبیبوں۔ فقیروں اور واعظوں اور بعض دفعہ پاگلوں کے بھیس میں ہوتے ہیں۔ ہر جگہ دعوت تحریک پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور اِن کے اسلامی بھائی ہر جگہ اِن کو مقامی یورپی حکام کی نظر احتساب سے بچاتے رہتے ہیں۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ جس میں لبرل اور غیر لبرل دونو طبقوں کے افراد شامل ہیں۔ جو یہ سمجھتا ہے۔ کہ اسلام ایک نئے دور فلاح میں داخل ہو رہا ہے۔ تھیوڈور ماریسن سابق پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کہتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ خیال ہرگز نہیں۔ کہ اسلام اب مر چکا ہے۔ اور اِس میں احساس ترقی نہیں رہا۔ وہ یہ ضرور سمجھتے ہیں۔ کہ ان پر آج کل حالات ناساعد کا سایہ ہے۔ جو ان کی دورِ سابقہ کی تنگ دلی اور رجعت پسندی کا نتیجہ ہے۔ بعینہٖ جیسے قرون وسطےٰ کے عیسائی اسی حالات میں مبتلا رہ چکے ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ ہمارا زمانۂ احیاء اب آنے والا ہے۔ جس کی علامات سنین جاریہ کے صدمات سے دن بدن سرعت سے ظاہر ہو رہی ہیں۔

تھیوڈور ماریسن کی رائے لبرل مسلمانوں کی رائے ہے۔ اور یورپ سے متنفر ایک مصری پان اسلامی خیال کے مسلمان شیخ یحییٰ صدیق اپنی مشہور و معروف تصنیف چودھویں صدی کا احیا المسلمین میں اِس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شیخ موصوف فرانسیسی یونیورسٹی ہولوس کے قانونی سند یافتہ ہیں اور محکمہ عدل مصر میں جج کے رتبے پر ممتاز ہیں اور مندرجہ ذیل بیان میں جس میں انہوں نے جنگ عظیم کی دس سال پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی۔ فرماتے ہیں۔ ان مدعیان تہذیب یعنی اقوام مغرب کی حالت ذرہ ملاحظہ ہو۔ جو آئے دن نئی نئی اختراعات اور نئے نئے سامان سے اپنی جنگی طاقت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اِن کا کوئی عہد نامہ دیرپا نہیں۔ اور اِن کو اپنے کسی قول و فعل پر ثبات نہیں۔ یہ آج اِن تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جو کبھی آنے والے زمانے میں دنیا کو قتل و غارت کے گڑھے میں

میں دھکیل دیں گی۔ اور انسانی کوششوں کے ثمرات کو سیاہ کھنڈر بنا کر چھوڑ دیں گی۔ مستقبل خدائے قہار کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور اس کی ذات غیر فانی ہے۔ یہ میری رائے میں یورپ کی روح خشک اور بوسیدہ ہو گئی ہے۔ یورپی قومیں جو اپنے آپ کو ہمارا "رہنما" تصور کرتی ہیں۔ اپنے اپنے انتہائی مدارج تک پہنچ چکی ہیں۔ گذشتہ تین صدیوں کی فوق العادت جد وجہد نے ان کے قوائے چور کر دئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ان کی زندگی کے آخری مدارج آ پہنچے ہیں۔ اور مناسب ہے۔ کہ اب یہ اپنی جگہ کسی ایسی قوم کے سپرد کریں۔ جو ان سے قوی تر اور بہترین روحانی مصالحہ سے آراستہ ہو۔ آج ان قوموں کو ایک دوسرے کے وعدوں اور پیمانوں پر ایک منٹ کا بھروسہ نہیں۔ اور یہ اپنی باہمی کدورتوں اور کاوشوں کو بھزار کوشش مٹانے سے معذور ہیں

مشرقی اور مغربی باہمی تعلقات نے مشرقی قوموں کے لئے دونوں ہی طرح کے نتائج پیدا کئے ہیں۔ یعنی مفید بھی ہیں۔ اور مضر بھی۔ وہ مادی نقطہ نظر سے تو وہ مفید ثابت ہوئے ہیں۔ مگر اخلاقی اور ذہنی نقطہ نگاہ سے ان کا اثر نہایت ہی برا واقعہ ہوا ہے۔ زمانہ دراز کی جنگوں اور اپنے عہد اقتدار کی آسائش پسندی سے مسلمانوں پر بے حرکتی سے طاری ہو گئی تھی۔ مگر اسے ان کی موت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مادی بے بسی مغربی توپوں کے گولوں کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ ان کے اتحاد کے عدم وجود کا۔ سالوں سے مغربی استبداد نے ان کی معنوی یکجہتی کو متزلزل نہیں کیا ہو

اور ان تعلقات کے مفید نتائج مسلمانوں کی زمانہ حال کی تحریک ترقی سے عیاں ہیں۔ ان مغربی اثرات کے ہوتے ہوئے مصلحین اسلام کی کوششوں کو چند ہی سالوں میں چار چاند لگ گئے۔ گذشتہ پچیس سالوں کی اسلامی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا قیاس ہے۔ کہ ہم پچاس سال میں مغربی طاقتوں کے ہمدوش ہو جائینگے۔

اس چودھویں صدی میں ہم ایک نئے اور نہایت خوش آئند مستقبل کی دہلیز پر کھڑے ہوئے ہیں۔ مسلمانان عالم ایک نئی روح سے متحرک ہو رہے ہیں۔ اور ہر جگہ عمل اور تربیت کی ضروریات پر [illegible] ہا ہے۔ ہم سب سیاحت کے خواہشمند ہیں۔ تجارتی تعلقات

پیدا کرنے اور دنیاوی جدوجہد اور مشکلات کا سامنا کرنے سے نہیں گھبراتے۔ فضائے مشرق سے ایک نئی قوت کا وجود پیدا ہو رہا ہے۔ جس کا نام رائے عامہ ہے۔

اے اخوان المسلمین۔ آؤ!! اُٹھو! جاگو! ایک دوسرے کی دستگیری کرو۔ ایک دوسرے کا سہارا بن جاؤ۔ یورپ کا استبداد ہی ہمارا موجب فلاح ہوگا۔ اور یورپ کا تعلق خواہ وہ آج کیسا ہی تلخ معلوم ہو۔ ہماری ترقی اور احیا کی بنیاد ہوگا۔ یہی تاریخ کی شہادت ہے۔ شدید مخالفت کے باوجود خدائے برحق کے اٹل قوانین کی تکمیل ہو رہی ہے۔ دن بدن یورپی اقتدار گھٹتا جا رہا ہے۔ ایشیا کے دروازے یورپی احتلال پر تنگ ہو رہے ہیں۔ کیا یہ علامات آنیوالے انقلابات کا پتہ نہیں دیتیں۔ خوش آمدید اے عہد جدید۔

اگر یہ بیانات ایک سربرآوردہ پان اسلامی لیڈر کے ہیں۔ تو جنگ یورپ نے تو واقعی ان کی تصدیق کی ہے۔ اس میں کیسے شبہ ہے۔ کہ جنگ نے یورپی طاقتوں کو کمزور اور بے حال کر دیا ہے اور بعد از جنگ یورپی ڈپلومیسی نے ان کے منصوبوں کی قلعی کھول کر ایک دنیا کو ان کا دشمن بنا دیا ہے۔ اطالوی۔ انگریزی فرانسیسی باہمی مناقشات نے مسلمانوں کو ان کے باہمی تعلقات کو مطالعہ کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ اس امر کا اظہار کئی یورپی مدبر کر چکے ہیں۔ ایک فرانسیسی اہل الرائے مسنیوں نے تو حال میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مسلمان ہماری پولیٹیکل حد بندیوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ اسلامی دنیا ایک مربوط اور مخلوط وجود ہے۔ جسے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس طور سے آج بھی شیخ جمال الدین افغانی کے مشن کی تکمیل ہو رہی ہے۔

موجودہ اسلامی ہیجان کی جیتی جاگتی تصویر مسلمانانِ ہند کی جدوجہد خلاف عہدنامہ ترکی تھی۔ اور یہ احتجاج ہندوستان تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ کل دنیائے اسلام میں پھیلی ہوئی تھی۔ تھیوڈور ماریسن کا یہ کہنا۔ کہ حکومت انگریزی کو اس کے خطرات سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ بے معنی بیان نہیں ہے۔ اسلامی دنیا میں عہدنامہ سیورے نے اک آگ سی لگا دی تھی۔ اور اس کا ثبوت کابل اور قاہرہ ایسے دور افتادہ مقامات کے ایک ہی وقت کے فسادات تھے۔ میرا تعلق مسلمانانِ ہندوستان سے تیس سال تک رہا ہے۔ اور میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ

حکومت انگریزی تک مسلمانوں کے جذبات کو پہنچا دوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے درسائی اور سیورے کے معاہدے تیار کئے تھے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے۔ کہ ٹرکی کے باہر ترکوں کا پُرسان حال کوئی ہے ہی نہیں یہ سمجھ لینا ایک مہلک غلطی ہے۔ ایسے لوگوں کو لندن کے مسلمانوں سے ملکر اپنے خیالات کی حقیقت کھلوانی چاہیئے۔ خود ہندوستان میں تمام مسلمان کشمیر سے آرکاٹ تک اسی جذبہ سے مشتعل ہیں۔ عورتیں گھروں کے اندر ترکوں کا ماتم کررہی ہیں اور تجارت پیشہ مسلمان جو عموماً پالیٹکس میں کم دلچسپی لیتے ہیں۔ اپنی دکانیں اور دفتر چھوڑ چھوڑ کر جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ریزولیوشنوں پر دستخط کرواتے پھرتے ہیں۔ ندوۃ العلما اور دیوبند کے علما جو سیاسیات سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے۔ اب اپنی گوشہ نشینی سے نکل عام احتجاج میں ہم آہنگ ہو رہے ہیں +

میری دانست میں سب سے بڑا خطرہ لبرل مسلمانوں کے پان اسلامی گروہ میں شریک ہو جانے کا ہے۔ لبرل گروہ خوب جانتا ہے۔ کہ پان اسلامی گروہ رجعت پسند اور صحیح ترقی کا مانع ہے۔ اور یہ کہ اگر مسلمانوں اور یورپ میں اس وقت جنگ کی ٹھن جائے۔ تو اس سے خود مسلمانوں کو ہی صدمہ پہنچیگا اور ان کی ترقی ہمیشہ کے لئے رُک جائیگی۔ مگر وہ یورپی رعونت استبداد اور سختی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور انتہا پسند گروہ کے ساتھ ایک عارضی اتحاد پیدا کرنے پر مجبور ہونگے +

"اخوان" اور "صلافیہ" فرقوں کا قیام شاید بعض مسلمانوں کی جنگجویانہ روش کا نتیجہ ہوا ہے تحریک اخوان کی ابتدا دس سال ہوئے اندرون عرب ستان نجد میں ہوئی۔ اس کا تعلق براہ راست وہابیت سے ہے۔ دونوں میں چنداں اختلاف نہیں۔ فرقہ اخوان کی ترقی اس قدر سرعت سے ہوئی ہے۔ کہ سال جاریہ میں سارے نجد پر اس کے عقائد کا غلبہ ہے۔ اور خود بن سعود جو امیر سعود جانشین شیخ عبد الوہاب مرحوم کی اولاد ہے۔ اس کا زبردست حامی ہے۔ صلافیہ گروہ کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی اور اس نے ایسی رفتار سے ترقی کی کہ آج کل وسیع حلقوں میں اس کا اثر ہے۔ یہ تحریکات امن مشرق کی حامی نہیں ہو سکتیں +

اب تک میں نے پان اسلامزم کے مذہبی اور سیاسی پہلو پر بحث کی ہے۔ اب اس کے تجارتی اور صنعتی پہلو کو دیکھنا چاہیئے جسے میں اقتصادی پان اسلامزم کہونگا +

تحریک اتحاد مسلمین کا یہ پہلو مغربی تاثرات کا نہایت ہی بدیہی نتیجہ ہے۔ صرف پچاس سال گذرے

ہیں کہ مسلمان تجارتی لحاظ سے قرون وسطیٰ کے حالات کے ماتحت تھے۔ امتناع سود خواری بروئے قوانین شریعت تجارتی گرم بازاری کی دشمن تھی۔ اور جو کچھ معمولی تجارت ہوتی بھی تھی وہ زیادہ تر یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ علاوہ ازیں مشرق کی اقتصادی زندگی مغربی مقابلہ اور کاروباری مسابقت کی وجہ سے شدید مشکلات میں اُلجھی ہوئی تھی۔ یورپی تجارتی کامرانی اس کی سیاسی کامیابی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مشینوں کا بنا ہوا سستا مال ایشیا کی منڈیوں میں کثرت سے بکنے لگا۔ اور اپنی ثروت کے بل پر یورپی سرمایہ داروں نے بے شمار تجارتی رعائتیں حاصل کر کے اپنے کاروباری مقاصد کو مغربی پولیٹیکل اقتدار کا پیش خیمہ بنا دیا۔

مگر اس کا نتیجہ بھی ٹھیک وہی ہوا۔ جو پولیٹیکل اثر کی تکمیل کا تقاضا یعنی مشرق کی تجارتی روح کی بیداری۔ مغربی تجارتی نفع اندوزی سے متاثر ہو کر اب مسلمان بھی ہاتھ پیر مارنے لگے انہوں نے مغربی طریق تجارت کے گر سیکھنے شروع کر دئے اور اگر کوئی احکام شریعت ان کی راہ میں بظاہر حائل ہوئے۔ تو انہوں نے ان کی تدقیق کی۔

اس جد وجہد کا نتیجہ مسلمانوں کی کامیاب تجارتی زندگی ہے۔ گو اس قسم کے مغربی تاثرات زیادہ تر ہندوستان۔ مصر اور الجزائر میں نمایاں ہیں۔ مگر پھر بھی اور ممالک اسلامیہ ان سے کچھ کم متاثر نہیں ہوئے۔ میں اقتصادی تغیرات کی باب اقتصادیات میں چل کر وضاحت کرونگا۔ اور فی الحال اس کے پان اسلامک اصول پر بیانات درج کئے جائیں گے۔ میری رائے میں مسلمانوں کی تجارتی سرگرمی ایک نہایت تحیر خیز واقعہ ہے۔ اب آپ مسلمانوں میں نہ صرف کامیاب معمولی دکاندار دیکھیںگا۔ بلکہ معاملہ فہم کوٹھی دار۔ دوربین۔ سرمایہ دار۔ ہوشمند مالکان کارخانہ۔ چلتے ہوئے آڑھتی اور زمانۂ جدید کی تجارتی کل کے وہ چلتے ہوئے پرزے ہیں۔ جن کا وجود سو سال تو پہلے عالم خیال میں بھی موجود نہ تھا۔

علاوہ ازیں مسلمان تجارت پیشہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ خوب نباہ کرتے ہیں۔ ان کا اسلامی رشتہ ان کے کاروباری تعلقات کے لئے سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ کیونکہ تجارت کی منڈی ایسی جگہ ہے۔ جہاں مختلف الخیال لوگ مل کر باہم معاملہ کر سکتے ہیں۔ یہاں پولیٹکس۔ مفسدے اور تمام اس قسم کے شر انگیز خیالات کا دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی بجائے خاموش باہمی تعاون جس کا مقصد

جلبِ منفعت جائز ہے۔

اب سوال یہ ہے۔ اِس اقتصادی پان اسلامزم کی غرض و غایت کیا ہے۔ میری رائے میں اِس کی غائیت مسلمانوں کی ثروتی ترقی ہے۔ تاکہ اسلام آسودہ اور خوشحال ہو۔ اور تجارتی کاروبار بجائے عیسائیوں کے مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے۔ اسلامی سرمایہ بجائے اجنبی سرمائے کے اسلامی کاروبار کی جان ہو۔ اور یہ کہ تمام طریقِ عمل اس زمانہ خوش آئندہ کے ضامن ہو۔ جبکہ اسلامی ممالک کی دولت کے مالک مسلمان ہی ہوں نہ کہ غیر +

یہ امیدیں مسلمانانِ جدید کی ہیں۔ اور کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ ہر صورت میں مغربی تاثرات کا نتیجہ نہیں۔ اب میں ذیل کے باب میں بالخصوص اِن تاثرات پر بحث کرونگا +

باب سوم

تاثرات مغرب

احیائے مشرق میں مغربی تحریکِ ترقی کا نمایاں حصہ ہے۔ مغربیت کی رو جو آجکل دنیا کے چپے چپے سے پھر گئی ہے۔ نہ صرف ایشیا بلکہ افریقہ کے ہر ایک حصے میں نئے نئے تغیرات کی روح رواں ہے۔ اِس سے یہ مراد نہیں کہ احیاءِ اسلام کا سہرا صرف مغربی تاثرات کے سر بندھتا ہے۔ کیونکہ ناظرین کو یہ یاد ہوگا۔ کہ گذشتہ صدی کے دوران میں دنیا کے مختلف مقامات سے اسلامی انقلاب کی لہریں اُٹھیں۔ جن کا تعلق براہ راست یورپ سے کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ محض اسلامی دنیا کی اندرونی اصلاح سے چنانچہ اسلامی دنیا کی بیداری صرف اِس کے یورپی تعلقات کا ہی نتیجہ نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے اندر نئے جذبات کے پیدا ہو جانے کا جس کا اظہار وہ بالکل مشرقی طور پر کر رہے ہیں۔ یورپ کو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ایشیائی قومیں ایسے وحشیوں اور غیر متمدن [illegible] قوں کے گروہ نہیں جیسے کہ افریقہ میں رہتے ہیں۔ بلکہ وہ قومیں زمانہ قدیم سے مختلف قسم کے اعلےٰ درجہ [illegible] کی تمدنوں کا ماخذ ہوئی ہیں۔ اور اب بھی انہیں اپنے معاشرت اور تمدن پر ناز ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے پُرعظمت ماضی کو دل میں رکھتے ہوئے اِن کا دورِ جدید کچھ ناممکن العمل مسئلہ معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اک ایسا امر متیقن ہے۔ جس کی شہادت اِس قسم کے کئی گذشتہ دوروں سے ملتی ہے۔

دنیائے مشرق پر جو جو مغربی تاثرات ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی وسعت اور شدت میں نمایا طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ روم اور یونان کے اثرات جو ایک حد تک مقامی تھے۔ اِس حقیقت کی مثال ہرگز نہیں ہو سکتے۔ نیز اِس تعلق کا آغاز زمانہ حال یعنی انیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے۔ اور اب تو وہ معنوی تعلق اور بھی پختہ ہو چکا ہے۔ پختہ سڑکیں۔ ریلیں۔ تار۔ ٹیلیفون۔ اخبارات کتابیں غرضیکہ

ہر ایک ذریعہ سے مغربی اثر مشرق کے رگ و ریشہ میں نفوذ کر رہا ہے۔ دُخانی جہاز سات سمندروں پار مغربی مصنوعات کو تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ قومیں جو آج سے پچاس سال پیشتر اپنے اجداد کی قدیم طریق معاشرت پر کاربند تھے۔ آج اِن کے افراد شب و روز اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں اور برقی تراموں میں بیٹھ کر اپنے کاروبار کو جاتے ہیں۔ مشرق کے اسلامی ممالک اِس لاتغیر سے مستثنیٰ نہیں۔ آئندہ ابواب میں دنیائے اسلام پر مغربی تاثرات کا ذکر ہو گا۔ اور اِن کے ہر ایک پہلو پر علیحدہ علیحدہ نظر ڈالی جائیگی۔ فی الحال اِس مسئلے کی سطحی اور عام حقیقت پر بحث کی جائیگی۔

مغربی تاثرات اِن ممالک اسلامیہ میں زیادہ نمایاں ہیں۔ جہاں جہاں مغربی پولیٹیکل اثر عرصے سے قائم ہے۔ ہندوستان کے دور افتادہ مقامات میں انگریزی حکومت کے نفوذ نے غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کیئے ہیں۔ اور وہ حالتیں رونما ہو رہی ہیں۔ جو عمومیت تعلیم، حفظ امن اور کاروباری سرگرمی کی لازم ملزوم ہیں۔ مگر یہ نتائج ہندوستان تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ جہاں کہیں مغربی پولیٹیکل اقتدار نہیں پہنچا۔ یا محض برائے نام ہے۔ وہاں بھی یہی عمل نفوذِ مغربیت زور و شور سے جاری ہے۔ لوگوں کی عادات اور رواج میں گہری تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اور مادی سامان تعیش مثلاً مٹی کا تیل۔ کپڑا سینے کی مشین۔ اب ہر کہ ومہ کی زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ نئے نئے معاشرتی معیار قائم ہو رہے ہیں۔ اور عام مذاق میں نمایاں تغیرات ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

علیٰ ہٰذا ذہنی اور روحانی پہلوؤں سے مغربیت اپنا کام کرتی چلی جا رہی ہے۔ ممتاز اسلامی لیڈروں کی اصلاحی جدوجہد پر مغربی روح ترقی کے اثر کا ذکر ہو ہی چکا ہے۔ مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ معاملات روحانی میں یہ مغربی کوششیں چنداں کامیاب نہیں ہوئیں۔ جو غالباً کسی قدر اس امر کا نتیجہ ہیں۔ کہ قوم کے روحانی طبائع عموماً زمانہ دراز کی روحانی تعلیم اور اعتقاد کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اِن کو دوسری قسم کی ایسی ہی طاقت سے کمزور کرنا کچھ آسان نہیں۔ مادی اسباب کے حالات البتہ اِس سے مختلف ہیں۔ سامانِ تعیش مثلاً ملبوسات وغیرہ میں آج کل کے مغربی رسم و رواج کا اتباع ایک معمولی بات ہو گئی ہے۔ گھر کا آرائشی سامان اب مغربی

وضع کا ہوا جارہا ہے۔ دور دور مقامات میں لیمپ۔ بتی فانوس وغیرہ جیسا سامان استعمال کیا جاتا ہے اور اصول و طریق تعلیم روز بروز متغیر ہو رہا ہے۔ گو مشرقی ممالک میں مغربی قوت کی برتری کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مغرب سے نفرت اور حقارت بھی ترقی پر ہے +

ان مغربی تاثرات سے اثر پذیر ہونے والا گروہ مشرقی ملکوں کا متوسط اور تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو آجکل ہر ایک ملک میں پایا جاتا ہے۔ ان کی تعداد ہر جگہ ایک سی نہیں۔ مگر اس گروہ کے افراد میں مغربی اصولوں کو قبول کرنے کی اعلے صلاحیت ہے۔ پھر اس طبقے کے کئی حصے ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے لوگ ہیں۔ جو اپنی زندگی کے مشرقی رنگ کے فلسفہ کو محفوظ رکھے ہوئے محض جزویات زندگی کو اختیار کرتے ہیں اور ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ جو مشرقیت کو خیرباد کہہ سراسر مغربی وضع اور مغربی خصال بن جاتا ہے۔ اور بعض ایسے بھی ہیں۔ جو بظاہر تو مغربیت پسند ہیں۔ مگر دل میں اس سے بیزار اور متنفر ہیں +

مگر پھر بھی ہم یہی کہیں گے۔ کہ مغربی رسم و رواج کی قبولیت کی دلیل ان اہل مشرق کی زندگی کے بیرونی اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض ہندوستانی یا ترک روشن خیال نوجوان یا بزرگ جنہوں نے مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے۔ اور یورپ کی کئی زبانیں روانی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ ہر سال یورپی صحت بخش مقامات کی سیر کرتے ہیں۔ گھوڑدوڑ کے گھوڑوں کے شائق ہیں بظاہر واقعی "یورپی" معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کی زندگی کے ان بیرونجات علامات کے نیچے ہر درجہ کی مشرقیت پنہاں ہے۔ ان میں سے بعض تو نہایت ہی پرجوش دلدادگان مغرب ہیں اور بعض پورے پورے ایشیائی +

اگر کوئی یہ خیال کرنے لگ جائے۔ کہ یہ ہر دو گروہ جن کے اصول اس قدر متضاد سے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے حلقوں میں رہتے ہیں۔ تو میرے نزدیک یہ قطعی غلط ہوگا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے ان ہر دو طبقات کے نمائندے ایک ہی وقت میں ایک ہم مقام پر اور ایک ہی حلقہ جماعت میں ملیں گے۔ ایشیا بھر میں آجکل ایک ایسا وسیع انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ جیسا کہ مغرب میں کبھی نہیں ہوا۔ مغربی تمدن ایک تدریجی اور ارتقائی ترقی مدارج کا نتیجہ ہے۔ جس کی نشوونما کے کوئی بیرونی مصالحہ یا اسباب معاون نہیں ہوئے۔ اور اس ترقی کو تمام تکمیل تک پہنچانے کے لئے کئی صدیاں صرف ہوگئیں

برخلاف اِس کے مشرقی ترقی فی الحقیقت مغربی اصولوں کی کورانہ تقلید ہے۔ جو اِس سرعت سے سر انجام پا رہی ہے۔ کہ برسوں کا کام گھنٹوں میں ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اِس عمل کا نام ارتقا نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ انقلاب کہنا صحیح ہوگا۔ اور ایسے انقلاب کا نتیجہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وہ کیا؟ افراط تفریط۔ معاملات کا غیر متیقن ہونا۔ اور اجتماع ضدین۔ اِن انقلابی حالات کے ماتحت ایک ہی پشت کے افراد کے درمیان صدیوں کے اختلاف حائل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ مغربی اصولہائے معاشرت کی ایک ہی پلستر سے بیٹا باپ کا نقطہ نگاہ نہیں سمجھ سکتا۔ اور باپ کے لئے بیٹے کے خیالات عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک ہی شخص کا دماغ اس کی آبائی سرشت اور اِس کے تاثرات جدید کی باہمی کشمکش کا اکھاڑہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ ولنٹائن چرل نے اِس کشمکش ضدین کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ملک ہندوستان آج کل ایک عجیب حالت میں مبتلا ہے۔ اِس کے قدیمی مگر زنگ آلودہ تمدن پر جنرہائے جدید کی سان پھیری جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ایک طرف تو نیم مغربی تربیت یافتہ نوجوان اپنا رنگ جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اِن کے مقابلے پر پرانی وضع کے بزرگ اِن کی جدت طرازی سے خائف اور متنفر نظر آتے ہیں۔ پرانے مذہبی اعتقادات کی شکست و ریخت اور پھر ان کا یکایک احیا۔ روحانیات کا عدم وجود اور تعلیم بے روح کی ترویج۔ زمانہ کی غیر متغیر اور جمودی نظام حکومت کی چٹانوں پر زمانہ جدید کی جمہوری مشروطیت کا احساس تمنائے قیام مقامی اور محدود حیثیت کی تجارتی زندگی اور زمانہ حال کی کاروباری ہمہ گیری کا تصادم۔ افراد محکوم اور ذی اقتدار اقوام اجنبیہ کی لازمی ناتاپائی۔ مشرقی اور مغربی قوموں کے محاربات کی صدائے بازگشت اور ایک مشرقی قوموں کے ہاتھوں ایک پر ہیبت مغربی قوت کی تباہی۔ یہ تمام آج کل کے مشرقی انقلاب کے بین نتیجے ہیں۔ ولنٹائن چرل نے اِن بیانات میں بالخصوص ہندوستانی حالات کی تصویر کھینچی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ حقائق دیگر بلاد مشرقیہ پر یکساں طور پر عائد ہو سکتے ہیں۔ ایک فرانسیسی اہل قلم اسی طور مشرق قریبہ کے متعلق لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ ترکوں کے طریق تخیل میں ایک تغیر واقعہ ہو رہا ہے۔ گویا اِس درجہ نہیں جہاں تک اسے ہونا چاہیئے۔ ہر جگہ قدیم اور جدید میں جنگ ہو رہی ہے اور عہد سابق کے انسٹی ٹیوشن زمانہ حال کے تاثرات سے اثر پذیر ہو کر ایک عجیب دو رنگی ہیئت اختیار کرتے جا رہے ہیں ؀

اِس دورنگی کی مظہر ہندوستانی بابوؤں کی پلستری رنگریزیت ہے۔ اور نوجوانانِ ترک کی جعلی فرانسیت ہے۔ اِس میں شبہ نہیں۔ کہ ہر قسم کے دیرپا نفوذِ مغربیت کی تکمیل پر بھی کئی ایک آدھے تیتر آدھے بٹیر نظر آئیں گے۔ مگر میرا یقین ہے۔ کہ اِس کے اچھے پہلو بھی ہیں۔ بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ تکمیل تغیر کے عین درمیان بعض اوقات شدید وضع کی رجعت پسندی رونما ہو جاتی ہے۔ لارڈ کرومر کہتا ہے مشرقی افراد اِس گراں قیمت کا کبھی اندازہ نہیں لگاتے۔ جو انہیں جدید تمدن کے بدل میں دینی پڑتی ہے اِس میں شبہ نہیں۔ کہ اس تمدن کے مادی فوائد بے شمار ہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا۔ یہ فوائد اِس اخلاقی ضلالت کا جو مغربی تمدن کا لازم ملزوم ہیں۔ کہاں تک تلافی کر سکتے ہیں۔

نفوذِ مغربیت کے فوائد و مضرات کی مثالیں سوسائٹی کے ہر ایک طبقہ میں ملتی ہیں۔ بعض حالتوں میں یہ مثالیں نہایت ہی مسرت انگیز ہیں۔ مگر بحالاتِ دگر بعض لوگ "نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے" کے مصداق ہو کر طرزِ عمل قدیم و جدید کے درمیانی پل صراط پر سے گر کر قعرِ بربادی میں جا پڑتے ہیں۔ لارڈ کرومر کے نزدیک ایسے دلدادگانِ مغرب یورپینیت پسند مصری تو ہیں ہی مگر ساتھ ہی اس نے اُن کو "اسلام فراموش مسلمان" اور "بے ریڑھ کے یورپین" قرار دیا ہے۔ ایک اور مغربی اہلِ قلم نے بعض ہندوستانیوں کی نیم یورپینیت کی تصویر یوں کھینچی ہے۔ میں نے ہندوستان کے محلہائے مرمر کو لندن کی ایک معمولی کارخانے کے بھونڈے سامان آرائش سے آراستہ دیکھا۔ یہ نتیجہ ہندوستان میں ہماری مغرب طرازی کا ہے۔ اِس نیم ایشیائی نیم مغربی اختلاط نے ہندوستانیوں کو دھوبی کا کتا بنا دیا ہے۔ وہ اب ہندوستانی تمدن کے نام لیوا تو ہے نہیں اور مغربی تمدن کا ان پر محض ملمع ہی ہے۔ ان کی زندگی اپنی معنوی حقیقت سے عاری ہو چکی ہے۔ ان کے اپنے اصول سابقہ تو بوجہ خشکی قلب مردہ ہو چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوغلے اور بے رنگے خیالات نے لے لی ہے۔ آفرین ہے۔ انگریزی پولیٹیکل تتار پر کہ اِس نے نہ صرف ایشیائی ذہنی امتیاز کا بلکہ اخلاقی پاکیزگی کا بھی خاتمہ کر دیا ہے۔

نفوذِ مغربیت کے متذکرہ بالا نتائج بالخصوص اِس انتہائی درجہ کے تنفر کا باعث ہوئے ہیں۔ جو بعض یورپی اصولوں سے باخبر ایشیائیوں میں پایا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کا وجود متعصب رجعت پسند جہلا اور مغربی پولیٹیکل افتاد سے بیزار غیور مسلمانوں کے لئے

نعمت غیر مترقبہ ہے۔

مغربی پولیٹیکل اقتدار خواہ اس کا کوئی سا پہلو لیا جائے مسئلہ مشرق و مغرب کے سارے قصہ کی بنیاد ہے۔ گذشتہ ابواب میں ہم نے مغربی پولیٹیکل فتوحات کا ذکر کیا تھا۔ اور ان میں یہ دکھایا گیا تھا۔ کہ کس طرح مشرق مغرب کے اقتصادی اور جنگی حملوں سے پامال ہوتا رہا ہے۔ میری دانست میں اس ضمن میں یورپ کی اقتصادی کامیابی سب سے اہم ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ بعض اوقات یورپی حکومتوں نے بلاوجہ و بغیر اشتعال مشرقی ممالک کی سیاسی آزادی کا خاتمہ کر دیا جیسے فرانس نے الجزائر میں۔ روس نے وسط ایشیا میں اور اطالیہ نے طرابلس میں کیا۔ مگر یورپ نے ایک اور طریق سے بھی ایشیا پر اقتدار حاصل کیا ہے۔ اور اس طریق کا نام احتلال پرامن ہے۔ جس کی صورت یہ ہے۔ کہ سب سے پہلے ان ملکوں میں اقتصادی رعائتیں حاصل کی گئیں۔ اور اس کے بعد سیاسی اثر کا نفوذ کیا گیا۔ یہ طریق مراقش۔ ایران اور مصر میں برتا گیا اور ہندوستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارنامے تو اب زبان زدِ عوام ہیں۔ اس "احتلال پُرامن" کی قوت کا پورا پورا اندازہ کسی نے بھی نہیں لگایا۔ اس کا ایک ذریعہ ریلوے لائنوں کی تعمیر ہے۔ ڈاکٹر ڈِین ماہر سیاسیات کہتا ہے۔ ریلیں ایک طرح کا آہنی پنجہ ہیں پہلے پہلے ان کے نتائج بہت ہی مفید ثابت ہوتے ہیں۔ مگر جب زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ تو ان کی حقیقت کا راز کھلتا ہے اور کمزور فریق ایک دن اپنے آپ کو ان کے مہیب اور نہ چھوٹنے والی گرفت میں جکڑا ہوا پاتا ہے۔

میں یہاں ان مغربی حملوں کی اخلاقی حقیقت پر بحث کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ابواب سابقہ میں فریقین کے نقطہ نگاہ کو وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اور ناظرین خود ہی ان دعاوی کی جانچ کر سکتے ہیں۔ جو دونو طرف سے پیش کئے گئے ہیں۔ میں صرف واقعات کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہیں کہ انیسویں صدی کے آغاز میں ایشیا و یورپ میں بُعد المشرقین تھا۔ یورپ توانائی اور کوشش کے میدان میں گام زن تھا۔ اور اقوام مشرق پستی اور ضلالت میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ یورپ ایشیا پر قابض ہو۔

میرا مقصد یہاں یہ دکھانا ہے۔ کہ پولیٹیکل اقتدار نفوذ مشرق پر کیا اثر ہوا۔ یہ قدرتی امر تھا۔ کہ تسخیر ممالک ایشیا کے بعد یورپ کی قومیں اپنا غیر سیاسی اثر بھی ان ملکوں میں ڈالیں

اور مشرق کو مغربیت کا جامہ پہنائیں۔ اس کی ایک ضرورت قیام امن تھا جس کے بغیر ان ملکوں کے مادی سامان سے فائدہ اُٹھانا غیر ممکن تھا۔ اس خود غرضانہ مقصد کے لئے مغربی عمالانِ حکومت نے جہاں ان کا بس چلا مشرقی استبداد اور سیاسی افراط تفریط کا خاتمہ کر کے ان جگہ پرامن حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں۔ اور ریل۔ تار۔ مصنوعات وغیرہ کے لئے راستہ صاف کیا۔ اس کے علاوہ مغربی حکومتوں نے محکوموں کی دماغی اور معاشرتی اصلاح بھی شروع کر دی۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ انیسویں صدی کی یورپی حکومتیں سالہائے سابقہ کے یورپی نظام سے کہیں بہتر تھیں۔ کیونکہ جو سلطنتیں سپین پرتگال نے امریکہ اور بلاد شرقیہ میں قائم کیں۔ اور جو کچھ اثر انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پیدا کیا۔ وہ تمام تر تسخیر شدہ ممالک کو بے رحمی سے لوٹنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں۔ انیسویں صدی کے مغربی لیڈر "سفید آدمی کا بارِ منصبی" ایسے کلمات کی تکمیل کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے۔ اور جہاں یہ لوگ مشرقی متاع سے اپنے اپنے ملکوں کو مالا مال کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ بھی چاہتے تھے۔ کہ مشرقی اقوام کی تمدنی اور ذہنی اصلاح ہو۔ اور ان کا ایمان تھا کہ مشرق کی پس ماندگی کا علاج صرف یورپی مصالحہ ترقی کے نفوذ ہی سے ہو سکتا ہے +

اس یورپی نصب العین کی وضاحت ایک "لبرل امپیریلسٹ" پروفیسر ریمزے میور نے قابلیت کے ساتھ کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ یورپی امپیریل ازم ہی یورپی تہذیب کے پھیلانے کا موجب ہوئی ہے۔ اور اس لئے ساری دنیا آج ایک ہی پولیٹیکل سسٹم میں مربوط نظر آتی ہے۔ میرا قیاس ہے۔ اس ابتدا سے آئندہ کی دنیا ایک واحد نظام سیاست و معاشرت کے اس طور سے تابع کی جا سکتی۔ کہ جیسا پہلے کبھی عمل میں نہیں آیا یورپی قوموں کی امپیریل ازم کے بغیر شمالی اور جنوبی امریکہ۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے باشندے وحشی رہتے۔ اور اس کے بغیر ہندوستان اور دیگر ممالک مشرق اپنے قدیمی تمدن کے باوجود آئے دن کی اندرونی خانہ جنگی اور استبداد جس پر ان کی تاریخ شاہد ہے اور جس میں یورپی رنگ کی پولیٹیکل آزادی کا دخل نہیں۔ میں مبتلا رہتے۔ اس امپیریل ازم کے بغیر دنیا کی پست اقوام کبھی بھی اپنی ضلالت سے نہ نکلتیں۔ اور مشرق اقوام کے جمہوریت اور مشروطیت کے مظاہرات جن کی صدائیں آج کل ہر چہار اطراف سے آ رہی ہیں۔ اس مغربی امپیریل ازم

کا نتیجہ ہیں۔

لارڈ کرومر نے اِس امپیریل ازم کی اخلاقی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امپیریل پالیسی خواہ وہ کسی محکوم قوم کے متعلق ہو۔ اقتصادی اور سیاسی نقطہ نگاہ سے ہمیشہ استوار ہوا۔ مگر اِس کے ساتھ ایسی ہو۔ کہ اِس کا اخلاقی دفاع بھی ہو سکے۔ یہ گویا ہر ایک امپیریل سسٹم کی کی محراب کی چوٹی کا پتھر ہے۔ امپیریل ازم کی دلیل خود اسکا اپنا وجود کبھی نہ ہو۔ بلکہ اِس کا طریق استعمال۔ اگر ہم اپنی طاقت کا جائز استعمال کریں۔ تو ہم واقعی اِس انجام سے بچ سکتے ہیں۔ جو روحی تشدد حکومت کا ہوا۔ اگر انگریز اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کریں گے۔ تو یہ بہتر ہے کہ اس طاقت کا خاتمہ ہو جائے اور یقیناً خاتمہ ہوگا۔

مغربی امپیریل ازم کی مندرجہ بالا تعریف انیسویں صدی کے طریق استدلال کا نتیجہ ہے۔ یہ کہنا آیا مغربی اقوام ہمیشہ اِس تعریف پر کاربند رہینگی یا نہیں۔ میرے امکان سے باہر ہے۔ مگر یہ امر کافی طور سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ مغربی فتوحات نے مشرقی ممالک میں مغربی تمدنی ترقی کا راستہ صرف کر دیا۔ گو یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ مغربی پولیٹیکل اقتدار کی عدم موجودگی میں بھی مشرقی اقوام اِن اصولوں کو اختیار کر لیتیں۔ لیکن اگر مغربی طاقت مشرق پر حاوی نہ ہوتی۔ تو یہ بھی ممکن تھا۔ کہ مشرقی قومیں صرف بعض مغربی اصول اختیار کرتیں اور بعض کو رد کر دیتیں۔ مغربی قوموں سے لین دین کرتیں۔ مگر بد دیانتی سے اور یورپی لوگوں کو اپنے ملکوں میں آنے کی ترغیب دیکر پھر اِن کو تہ تیغ کر دیتیں۔ اور یہ امر تاریخ کی سپرٹ اور خصائل انسانی کے برخلاف ہوتا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ نفوذ مغربیت ٹھیک اِس طریقے سے ہوا۔ جیسا کہ فطرتی طور پر ممکن تھا۔ اور اِس عمل نے مشرق کے جذبہ تعصب و رجعت پسندی کی دیوار کو گرا کر مشرقیوں کو اپنے قدیمی اصولوں کی کینچلیوں سے باہر نکلنے اور حالات پس و پیش زمانہ حال کو مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا آیندہ ابواب میں ہم اِس تغیر عظیم کا ذکر کریں گے۔ جو مندرجہ بالا واقعہ سے پیدا ہوا ہے اور فی الحال تاثرات مغرب اور اِس کے مشرقی نتائج تک سلسلہ بیان محدود رکھیں گے۔

میری رائے میں مغربی اقتدار سے مشرقی تنفر زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدیوں کی پولیٹی حکمت عملیوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ انیسویں صدی کی امپیریل ازم ایک اٹل

امر تھا اور عام طور پر مفید ثابت ہوا۔ مگر بیسویں صدی کی مغربی پالیسی ایسا خوش آئندہ قیاس نہیں کہا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء صدی میں ایشیائی ایسے کور دماغ اور کند ذہن نہ تھے۔ کہ ہر قسم کی تمدنی آسائشوں اور انسانی فلاح کے اصولوں سے منہ پھیرے رکھتے۔ اور کوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے دقیانوسی خیالات پر کاربند رہتے۔ مشرق اس ایک صدی میں نئی معلومات اخذ کرتا رہا۔ اور اپنے مسلمہ قوائے ذہنی وعقلانی کی تجدید کرتا رہا۔ یہ ضروری تھا۔ کہ اس زمانے میں زمانہ قدیم سے متمدن اور اہل ترقی قوموں کے ساتھ سلوک ایسا نہ ہوتا۔ جو ان سے پہلے کیا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اب ایک لبرل مغربی پالیسی کی ضرورت لابدی ہو چکی تھی +

مگر اس اشد ضرورت پر توجہ نہیں کی گئی۔ اور مغربی پالیسی میں کوئی تغیر واقعہ نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف خود یورپ میں انیسویں صدی کے لبرل اصولوں کی بیخ کنی ہو کر شدید تجارتی اور سیاسی مقابلہ بازی کا یہاں تک دور دورہ ہو گیا تھا۔ کہ جنگ یورپ ایسا مہیب حادثہ رونما ہوا جوع الارضی اور چیرہ دستی کی شدید صورت جس میں یورپ آج کل مبتلا ہے۔ اس سے پہلے شاید ہی کسی زمانے میں پیدا ہوئی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مغربی دندان آز مشرقی گوشت پر پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو گئے۔ اور بیدار شدہ مشرق بجائے اس کے کہ کسی دوستانہ اور مخلصانہ طرز عمل کا مورد ہو۔ روز بروز شدید قیود میں جکڑا جانے لگا۔ جس طریق سے ترکی اور ایران جیسی نوخیز قوموں کے جذبہ احیا کو آج پامال کیا جا رہا ہے۔ دور سابقہ کے لبرل مدبرین کو نہایت صدمہ پہنچتا۔ اور زمانہ حال کا لبرل گروہ بھی اس سے بیزار ہے۔ مشہور انگریز اہل الرائے سٹانلی لو ڈران ل سنہ ۱۹۱۲ء میں لکھتا ہے۔ جو طریق عمل آج کل یورپ میں ہو رہا ہے۔ اس کی مثال ڈاکوؤں کی اس کاروائی سے دی جا سکتی ہے جبکہ وہ بے ہتھیار اور بے بس دہقانوں کے مال و املاک کے متعلق کرتے ہیں۔ غیر قوموں کے حقوق کی پاسداری تو درکنار ان کی پامالی تو آج کل کا مقصد اولیں ہے۔ فریق قوی کی ستم ظرازی اور کمزور کی جانبازی جس میں اصول ہائے اخلاق کی ہمہ تن شامل دستبرد نے لی ہے۔ زمانہ حال میں تو سے زن کا کھیل ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ اس کا جواب تو کسی بدتریں ایشیائی جنگی لیڈر کے کارناموں میں بھی نہ ملیگا +

اِس ربع صدی کا درخشندہ تاریخی کارنامہ احیائے اقوام مشرق ہے۔ آج مشرق اپنی صدیوں کی غفلت سے بیدار ہو کر شاہراہ ترقی پر بڑی سُرعت سے گامزن ہے۔ سب سے پہلے جاپان نے قدم اٹھایا اور اس کی خوش قسمتی سے اس نے اپنے مہتمم بالشان عہد جدید کا آغاز ایسے وقت میں کیا۔ جبکہ حقوقِ اقوام اور حرمت پیمان کے ستارے آسمان مغرب میں کچھ کچھ ٹمٹما رہے تھے۔ جب جاپان کے مدبروں نے اپنے عہد جدید کی بنیاد رکھی تھی۔ تو یورپی قوموں کے دلوں میں اِس امر کے روکنے کا خیال نہ آیا۔ بلکہ ان کے اِس فعل کو بنظر استحسان و اُمید دیکھا گیا اور اُنہیں اپنی مشکلات سے نپٹ لینے کا موقعہ دیا گیا۔ اگر یہ جاپانی انقلاب تیس سال بعد میں شروع ہوتا۔ تو آج صورت حالات کچھ اور ہی ہوتی۔ اور نوخیز جاپانی قوم کے گہوارے کے گرد و پیش یورپ کے ڈاکو آن موجود ہوتے۔ تاکہ اس کی اٹھان ہونے سے پہلے جو کچھ بن پڑے۔ لے بھاگیں۔ مشرق کی اور قوموں کا حال جنہوں نے اپنے مستقبل کی بنیاد ذرہ دیر سے رکھی دیکھ لیجیے۔ گذشتہ دس سال میں مادیت اور پیمان شکنی کی ایک مہلک رو یورپ کے نظام تعلقات خارجہ پر پھر گئی۔ اور اس کا اثر ہم مشرقی قوموں کی اِس عظیم جدوجہد میں جو انہیں شروطی حکومتوں کے قیام میں کی ہے۔ پاتے ہیں۔ وہ آج ٹھیک انہیں اُصولوں پر کاربند ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کا وعظ مغرب نے ایک صدی تک سنایا تھا۔

اور آج جب کہ وہ بعد ہزار دقت ان اصولہائے ترقی سے متمتع ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ تو یہ ضروری تھا۔ کہ ان کے حوصلوں کی تائید ممالک یورپ سے کی جاتی اور بلا امداد تو خیر۔ کم از کم ان کو اپنے ارادوں میں بلا مداخلت کامیاب ہونے کا موقعہ دیا جاتا۔ بجائے اس کے جہاں کہیں کسی مشرقی قوم نے اپنی پستی سے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ یورپی طاقتوں نے ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور فوراً ان کے ملکوں پر قابض ہونے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

جس سُرعت سے تسخیر ممالک مشرق جس میں واحد باقی ماندہ اسلامی سلطنت کی تباہی بھی شامل ہوئی ہے اُس کا ذکر ابواب سابقہ میں ہو چکا ہے۔ اب ہمیں یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ اِس چالیس برسوں میں کیسے بڑے نتائج تعلقات مشرق و مغرب کے لئے پیدا کئے۔ یہ

معلوم ہوگا۔ کہ مشرق اور مغرب کے مراسم اس سے پہلے بھی کچھ بہت مخلصانہ نہ تھے۔ باب گذشتہ میں ہم نے احیائے تحریک اتحاد مسلمین پر بحث کی تھی۔ اور اب ہم جذبۂ وطنیت پر بحث کریں گے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ مشرق کے مظاہرات صرف تحریک مذہب و تحریک وطنیت ہی نہیں۔ بلکہ اور بھی کئی ایک ہیں۔ مثلاً اقتصادی۔ معاشرتی اور نسبی۔ اب ہم مشرقی ردِ فعل یورپ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کریں گے +

گذشتہ صدی کے دوران میں بعض مقامات میں ردِ فعل یورپ ترقی پر تھا۔ اور بعض جگہ کمزور ہو چکا تھا۔ بعض مشرقی طبعاً مغربی تاثرات کے دشمن ہیں۔ اور بعض کا تنفر حالات اور واقعات کے مطابق تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ابتدا میں لبرل اسلامی طبقہ نے مغربی تاثرات کا جوش سے خیر مقدم کیا۔ باب سابقہ میں لبرل گروہ کی خواہش ترقی مطابق اصولہائے مغرب پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اور یہ کہ کس طرح انہوں نے ان اصولوں کو اپنے مذہبی احیا کی جان قرار دیا دنیوی معاملات میں ان کی پالیسی یہی رہی۔ انیسویں صدی کے آخری نصف میں بعض ترکی مدبروں نے حکومت عثمانیہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایسا ہی ہوا اس امر کی دلچسپ مثال جنرل خیر الدین کی ان کوششوں سے ملیگا جو انہوں نے تیونس کے احیا کے لئے کیں۔ خیر الدین چرکس قومیت کے تھے۔ اور اپنے تدبر سے وزارت کے عہدے تک ترقی کرتے گئے ۱۸۶۰ء میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا۔ اور اپنے مشاہدات و تجارب سفر کا ان پر بہت اثر پڑا۔ تیونس میں مغربی اصولوں کی ترویج کی کوشش شروع کی۔ خیر الدین مغرب کے دشمن نہ تھے۔ بلکہ وہ اس امر کے متمنی تھے۔ کہ اہل اسلام اپنی موجودہ درماندگی سے نکل کر شاہراہ فلاح پر پڑ جائیں۔ اور یورپی حملے سے بچ جائیں جس کی دلیل ان کی کمزوری تھی +

بے تیونس خیر الدین کی رپورٹ سے اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ انہوں نے وزیر موصوف کو ہر قسم کی اصلاحات کا اختیار کلی دے دیا۔ رجعت پسند علما گروہ کی مخالفتوں کے باوجود انہوں نے نہایت حوصلہ مندی سے اپنی کوشش کو جاری رکھا۔ جو اُن کی نہایت ہی بے وقت موت سے رُک گئی۔ اور تیونس کی ناتکمیل یافتہ قوت کا خاتمہ بیس سال بعد فرانسیسیوں نے کر دیا۔ مگر خیر الدین مرحوم کے احساسات کا اثر آئندہ زمانے پر بھی پڑا۔

انہوں نے اپنے تمام خیالات کو ایک کتاب میں جمع کیا جس کا نام "تحقیق الامم" ہے۔ اس نے سارے مشرق بالخصوص الجزائر و تیونس پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کتاب میں خیر الدین مرحوم نے مسلمانوں کی اپنے اسلاف کی لفظی مدح سرائی اور استخوان فروشی پر لعنت ملامت کی اور انہیں زمانہ حاضرہ کے حالات مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس نے پکار کر کہا۔ کہ یورپ کی ترقی جدید اس کے مذہب یا مصالحہ قدرتی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس کے استعمال ذرائعہ سائنس کا جس سے وہ دنیا کی پیداوار سے بذریعہ صنعت و تجارت مالا مال ہوتا ہے۔ اور یہ تمام عدل اور آزادی کے صریح نتائج ہیں۔ جو آج کل یورپ کی خصلت ثانیہ ہو چکے ہیں۔ سنین اولین میں مسلمانوں کی بھی یہی حالت تھی۔ اور وہ اس لئے کہ وہ اس قسم کے ذرائع کو کام میں لاتے۔ اُن کا موجودہ انحطاط ان کی سستی اور دماغی جمود کا نتیجہ ہے۔ اور وہ ان کے عہد اولین کے اصولوں کی تجدید سے اس گئے گذرے وقت میں بھی دور ہو سکتا ہے +

میں نے مشہور ترکی مصلحان قوم کے مقابلے میں خیر الدین مرحوم کے کارناموں پر یہ ثابت کرنے کے لئے زور دیا ہے۔ کہ اصلاح اور مغربی اصولوں کو قبول کرنے کی خواہش انیسویں صدی کے مسلمانوں میں سرایت کر گئی تھی۔ اور ان کے جذبات تنفر مغربی مر چکے تھے۔ مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ خود ان مصلحین میں سے کئی ایک مغربی عصبیت اور جوع الارضی سے متاثر ہو کر سرے سے مغربی تہذیب کے دشمن ہو بیٹھے +

اس تنفر میں صدی حال کے واقعات نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ایک سربر آوردہ مسلمان جنگ یورپ کے قبل فرماتے ہیں۔ گذشتہ دس سالوں کے واقعات نے تمام افراد مشرق کو اس قدر متفق اور یکجان کر دیا ہے جس کی مثال کسی دور سابقہ میں نہیں ملتی۔ اور یہی اتفاق ان کے تنفر و استبداد کا باعث ہے۔ جنگ بلقان کے خاتمہ پر اس قسم کے خیالات کا ایک ترک اہل قلم نے اظہار کیا۔ وہ فرماتے ہیں۔ ہم کو آج شکست ہوئی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ہم نے روح صداقت کا پاس کیا۔ حقوق رعیت کا احترام کیا۔ اور انسانیت اور تہذیب کے اصولوں پر کاربند ہوئے بلغاری فوج کے طریق جنگ نے ہم پر واضح کر دیا ہے۔ کہ ہر ایک سپاہی جب وہ اپنے دشمن کے مقابلے پر کھڑا ہو۔ تو انسانیت اور رحم کے تمام جذبات اپنے دل سے نکال ڈالے۔ خونخوار درندوں کی طرح

لڑے اور عورتوں بچوں اور اپاہجوں کو بے دریغ تہ تیغ کر دے۔ آج اگر ہم قتل و غارت اور سفاکی کے مدعی ہو جائیں۔ تو فوراً ہی یورپ ہمارا دلدادہ ہو جائے۔ جیسا کہ وہ فرڈینینڈ کی فوج کا ہے +

خود جنگ یورپ مسلمانوں کی نظر میں یورپی رعونت کی سزا قرار دی گئی تھی۔ ایک ممتاز ترکی اخبار نے یورپی طاقتوں کے متعلق لکھا تھا۔ یورپی قومیں اپنے گریبان میں تو منہ ڈالنا نہیں چاہتیں۔ مگر ہمارے خفیف نقص پر مداخلتِ بے جا کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ آئے دن وہ ہمارے جسم پر عمل جراحی کرتی ہیں۔ اور ہمارے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نوچتی رہیں۔ اور ہم بجالت بے بسی اپنے غم و غصے میں غلطاں رہے۔ ہمارے دل کی یہ آرزو تھی۔ کہ کاش ان کو بھی کوئی اسی طرح کاٹے۔ وہ گھڑی آن پہنچی۔ آج وہ ایک دوسرے کے گوشت کو اپنے دانتوں سے نوچ رہی ہیں +

مگر یہ خیالات کسی طبقہ قوم کا حصہ ہی نہیں بلکہ تمام قوم کے افراد کے ہیں۔ اور ہر ایک بجاعت یورپ سے نفرت کرنے کی اپنی اپنی دلیلیں رکھتی ہے۔ مشرقی شہزادے حالانکہ جب ان کی سیادت کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اپنے عہد استبداد کو یاد کر کر کے یورپی عاملان سیاست کے دشمن ہوتے جاتے ہیں۔ ایک ہندوستانی راجے نے نہایت غصے کے لہجے میں کہا۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں بغیر اجازت ریذیڈنٹ ایک تلوار یا قلم نہیں خرید کر سکتا۔ اور اسی طرح توفیق پاشا مرحوم خدیو مصر نے انگریزی فوج متعینہ مصر کے ریویو پر اپنے ایک رفیق سے کہا۔ تم سمجھتے ہو۔ میں اس انگریزی ریویو کو پسند کرتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ جتنی دفعہ میں کسی انگریز سپاہی کو مصر کے بازاروں میں دیکھتا ہوں اتنی دفعہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ گاڑی سے نکل کر اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبا ڈالوں۔ امرا اور اعلےٰ طبقے کا یہی حال ہے۔ بالخصوص اس گروہ کا جو بوجہ اپنی اعلےٰ تعلیم کے بڑی بڑی تنخواہیں پانے اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے متمنی ہیں۔ اور جو بات صرف اجنبیوں کو حاصل ہے۔ ہاں بعض روشن خیال لبرل فی الحال اس عارضی محکومیت سے ٹھنڈے دل سے متحمل ہیں اور اس دن کے منتظر ہیں۔ جب مشرق کی قومیں اپنی ترقی کے مدارج طے کر کے بلا خوف رجعت یا ناکامی قومی حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لے سکیں گی۔ مگر یہ تعداد میں محدود اور آزادی پسندوں کی نظروں میں ابن الوقتانہ اور مردودانہ خصائل سمجھا جاتا ہے۔ اور دوسرا امر یہ ہے۔ کہ ان کا عوام پر کچھ اثر نہیں +

ابتداءً یہ خیال قدرتی طور سے دل میں پیدا ہوگا۔ کہ عوام الناس اجنبی مغربی اقتدار کے حامی ہوں گے۔ کئی ایک مشکلات کے باوجود جو مغربی اقتصادی اقتدار کا نتیجہ ہیں۔ عوام طبقہ غیر ملکی حکومت کی طرف مائل ہے۔ جہاں پہلے مزارع اور مزدوری پیشہ لوگ ہندوستانی راجاؤں اور اہل ثروت لوگوں کے غلام تھے۔ آج وہ انصاف اور حفظ امن کی بدولت اپنی محنت کے پھل سے متمتع ہو رہے ہیں۔ اور ان کو اس حقیقت کا احساس ہے۔ اور وہ مغربی حکومت کی خوبیوں سے بے بہرہ نہیں۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ وہ انصاف پسند طریق حکومت کے محاسن کو بھولتے جاتے ہیں۔ یا انہیں معمولی بات سمجھ کر اپنے اجنبی حاکموں کے نقائص پر نکتہ چینی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے اہل وطن تعلیم یافتہ طبقے کے کہنے سننے پر خواہش آزادی میں ان کے ہم آہنگ ہو رہے ہیں +

اس خیال کی وجہ زیادہ تر یہ ہے۔ کہ اہل مشرق اپنی قدیمی طرز حکومت کے دلدادہ ہیں ایک اسلامی ضرب المثل کا ماحصل یہ ہے۔ میرا حاکم خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ کافر تو نہیں اس لئے ہر ایک مغربی طاقت اپنی مسلمان رعایا کی فطری نفرت اپنے برخلاف پاتی ہے۔ ایک روسی عامل جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وسط ایشیا کے مسلمانوں میں رہ کر گذارا ہے۔ کہتا ہے مومن مسلمان غیر اسلامی حکومت کے کبھی بھی حقیقی طور پر ہوا خواہ نہیں ہو سکتے۔ اور میری رائے میں یہ بات اور سب مغربی حکومتوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے +

علاوہ ازیں مشرقیوں کو مغربی حکومتوں کے فوائد کے باوجود خاص اپنی ذات کے لئے چنداں فائدہ نظر نہیں آتا اور وہ اس کی قیود قواعد و ضوابط سے بہت پریشان ہوتے ہیں کیونکہ مشرق میں قانون۔ رواداری وغیرہ کی اس درجہ جیسا کہ یورپ میں ہے۔ پرواہ نہیں کیجاتی۔ مشرق میں یہ باتیں پسند تو کی جاتی ہیں۔ مگر ہندوستانی حاکم کے نصفت حسن عمل کو اس پر ترجیح دیجاتی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ اس مشرقی حاکم کے احساسات وہی ہیں۔ جو ان کے اپنے۔ ایک انگریز اہل قلم کا بیان ہے۔ ایشیائی لوگ اصول عدل کو محض معدلت گستری نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک بہترین طرز عمل ہمدردی ہے۔ اس لئے وہ بسا اوقات اپنی قوم کے حاکم کے افعال کو بہ نظر غور پر سمجھ سکتا ہے۔ خواہ وہ افعال کیسی قدر بھدے اور ہر دلعزیز

ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ جب اس کے قومی اہلکار اس کے افعال ممنوع کا جائزہ لیتے ہیں۔ اور اس کی شدید سزا دیتے ہیں۔ تو محکوم کو اتنا علم ضرور ہوتا ہے۔ کہ حاکم یا قاضی اس کا ابن وطن ہے اور اس کے نقطۂ نگاہ سے واقف ہے۔

حفظِ امن کا مسئلہ لیجئے۔ کسی ایشیائی نظر میں حفظِ امن کی وہ حقیقت نہیں جو ہونی چاہیئے بلکہ اس کو یورپی طریق کی شدید پابندی ضوابط سے ایک گونہ بیزاری ہے۔ صدیوں کے سہل انگاری اور قیود سے آزاد طریق حکومت کا عادی ہونے کی وجہ سے وہ قواعد پولیس اور انتظامات حفظ صحت کی کلی پابندی سے گھبراتا ہے۔ اس کی فطرت اس طریق کی ذاتی آزادی سے مانوس ہو چکی ہے جس میں اسے دوسروں کی آسائش کا مطلق خیال نہیں۔ وہ حرکات و سکنات کو افادہ عام کی خاطر محدود کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور اس کی اصلی خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ کوئی شخص اس کے افعال میں مخل نہ ہو۔ خواہ اسے اس طریق عمل سے بعض مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اور وہ ان مشکلات کا حل رشوت۔ ناجائز رعایت۔ اور زبردستی سے کر لیتا ہے۔ ایک امریکن نے ایک باشندہ فلپائین کے دعوے آزادی کے جواب میں اس سے پوچھا۔ اچھا اگر تم خود مختار ہو جاؤ۔ تو کیا کرو جو تم اب نہیں کر سکتے فلپائین نے جواب کہا۔ تو میں اپنا گھر اس بازار کے عین بیچ میں تعمیر کر دوں۔ اگر یہ میرے دل کی خواہش ہو۔ امریکن نے کہا۔ اگر تمہارا پڑوسی معترض ہو۔ اور تمہیں ایسا کرنے سے باز رکھے۔ تو پھر فلپائین نے جواب دیا۔ تو میں اس سے اچھی طرح سمجھ لونگا۔ لیکن تمہارے ایسا کرنے سے پہلے وہی تم سے سمجھ لے۔ تو پھر اس کا جواب فلپائین نے محض شانہ ہلانے سے دیا۔ یعنی کچھ بھی نہیں۔

حقیقت امر یہ ہے۔ کہ باوجود ایک صدی کے تعلقات یورپ ایشیائی لوگ ابھی تک لکیر کا فقیر ہونا نہیں کھوتے اور جو انہیں ایسا کرنے سے باز رکھے۔ اس کے وہ متحمل نہیں وہ جانتے ہیں۔ کہ مغربی حکومت کا اثر صرف سیاسی معاملات تک ہی نہیں رہتا۔ بلکہ ان کے معاشرتی اور ان کے قدیمی رسم و رواج پر بھی پڑتا ہے۔ اور اس لئے اس کے مدافعہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک انتظامی جدت کا زور شور سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مثلاً الجزائر کے عربوں نے چیچک کے جبری ٹیکے کی کئی سالوں تک شدید مخالفت کی فرانسیسیوں

نے اِن کو سمجھایا۔ کہ اعدادِ ٹیکہ چیچک کی بیماری کے دفاع کو ثابت کرتے ہیں۔ عربوں نے اِس کا جواب دیا۔ نہیں یہ ٹیکا محض قوتِ مردمیت کو سلب کرنے کے لئے نافذ کیا جاتا ہے تا کہ عرب نسل ختم ہو جائے۔ اور اِن کی جگہ فرانسیسی لوگ لے لیں۔ مگر جب فرانسیسی اہلکاروں نے عربوں کا نسلی ترقی کے اعداد دکھائے۔ تو اِس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک تجربہ کار فرانسیسی اہلِ قلم نے اِس سارے عمل کا لب لباب مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ فی الحقیقت تمام ایشیائی لوگ ہمارے قواعد اور ہماری پابندیوں کے دل سے متنفر ہیں۔ کیونکہ وہ اِس قسم کی جکڑی ہوئی زندگی کو ایک نظر پسند نہیں کر سکتے۔ جو مغربی قوموں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور جس سے خواہ کسی قسم کے عام فوائد مترتب ہوں۔ بار بار شمالی افریقہ کے عربوں کے ذہن نشین کیا گیا ہے۔ کہ وہ فرانسیسی حفاظت میں ترک ظالموں کے ظلم اور اپنی آئے دِن کی اندرونی شورشوں سے محفوظ ہیں۔ مگر یہ دلیل اِن کو قطعاً قائل نہیں کرتی۔ اگر کوئی بات اِن کی سمجھ میں آتی ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ کہ فرانسیسی حکومت اب اِن سے ایسے معاملات کے لئے ٹیکس وصول کرتی ہے۔ جس کی ضرورت وہ سمجھ نہیں سکتے۔ الجزائر کے عربوں کے غصے کا کوئی یورپی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جب اِنہیں یہ کہا جائے۔ کہ ایک مقررہ وقت پر اپنے اپنے گھروں کا کوڑا محکمہ صفائی کی گاڑیوں میں ڈال دو۔ قاہرہ کے گاڑی بانوں اور قاطر جیوں کی بیزاری از قوانین پولیس کی بھی یہی وجہ ہے۔

مگر ضوابط بلدیہ ہی مشرقی مخالفت کا سبب نہیں۔ بلکہ حفظ امن و باقاعدگی کا ہر ایک پہلو جو یورپی تمدن کی جان ہے۔ یافہ اور یروشلیم کے درمیان ایک چھوٹے سے ریل کے سٹیشن کے قریب ایک بزرگ کا مزار ہے۔ پر دستِ قواعد ریل یہاں گاڑی ایک منٹ تک رکنی چاہیئے۔ جو بات میری نظر سے گزری تھی۔ وہ یہ تھی۔ جونہی ریل رُکی تمام مسلمان مسافر گاڑی سے اُتر اپنی اپنی جائے نمازیں بچھا آدائیگی فاتحہ میں مصروف ہو گئے۔ سٹیشن ماسٹر گارڈ چلایا ایک منٹ ہو چکا۔ گاڑی چلنے والی ہے۔ سب لوگ سوار ہو جائیں۔ مگر اِن پر سے گارڈ مسلمانوں کے جو سب لائن مصروف ورد و وظیفہ تھے۔ اِس چیخ پکار کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انجن کی سیٹیوں اور گاڑی کے حرکت کی دھمکی نے بھی کام نہ کیا۔ آخر کار سٹیشن ماسٹر نے عملہ ریلوے دس بارہ مضبوط لوگوں

کی مدد سے دھینگا مشتی کر کے اِن وظیفہ گزاروں کو اٹھوا اٹھوا کر گاڑی میں لادا۔ اور جو نمازگزار ہاتھ پیر کے توانا تھے۔ وہ تو اچھی خاصی کشتی کے بعد گاڑی میں دھکیلے گئے۔ اور مقررہ وقت سے کئی منٹوں بعد گاڑی روانہ ہو سکی +

بات یہ ہے۔ کہ ایشیائی جبلت مغربی ضبط وقت و پابندی قواعد سے پوری آشنا نہیں ہوئی +

مندرجہ بالا بیانات کے مصداق زیادہ تر جاہل عوام ہیں۔ مگر پھر بھی اِن خصائل کا اثر جماعت کے ہر ایک طبقہ میں پایا جاتا ہے۔ جو صدیوں سے ایشیا میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ اِس امر کا کافی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ کہ اعلیٰ طبقہ کے ایشیائی جو زمانہ دراز سے اقتدار اور حکومت مطلق العنان کے مزے چکھتے رہے ہیں۔ مغربی پابندیوں کے اختیار کرنے سے اِس اقتدار کو کھو بیٹھنے کا یقین بھی رکھتے ہیں +

فی الحقیقت تمام ایشیائی کھتری یا مہنترا اپنے عہد سابق کی یاد کو آج تک دہرا رہے ہیں۔ کیونکہ ایک ایشیائی شہزادے۔ پاشا یا مصاحب کے لئے اگر کوئی فردوس بر روئے زمین تھا۔ تو ان کی حاکمانہ زندگی تھی۔ رقیبوں کی سازشوں اور دشمنوں کے داہیائے فریب کا دغدغہ تو لگا ہی رہتا تھا۔ مگر پھر بھی جب تک اقبال قائم رہتا تھا۔ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ لطف شباب مع بسالہ کا مزہ دیتا تھا۔ اس اختیار کلی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ جو ایک ایشیائی رئیس یا حاکم کو حاصل تھا اِس کے متعلق صرف اِس قدر کہا جا سکتا تھا۔ کہ بغیر اِس کے کہ اِس کے عملوں کا حسن و قبیح پر نکتہ چینی کی جاتی۔ اِس صاحب منصب کے گرد و پیش کے لوگ اس کو خوشامد اور چاپلوسی سے اس قدر اندھا کر دیتے تھے۔ کہ خود اپنی حقیقت کو بھول جاتا تھا۔ اور یہ حال صرف ایشیائی تاجداروں ہی کا نہ تھا بلکہ اِن کے مصاحبین اور مقربین میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک حاکم ہوتا تھا۔ اِس کے اپنے حوالی موالی اور حاشیہ نشیں ہوتے تھے۔ جو اسے شب و روز شراب تملق کے شیریں جاموں سے خود فراموشی کی حالت میں مبتلا رکھتے تھے۔ اور اس کی خوشی کو ہر لحظہ دوبالا کرتے رہتے تھے۔ اِس خوشی کے مظاہر کیا تھے۔ اختیار کُشتی سامان عیاشی کی کثرت اور عوام کی مخلصانہ اطاعت شعاری جو بسا اوقات عقیدتمندی کے درجے تک پہنچ جاتی تھی۔ +

ایسے حالات کے ہوتے ہوئے یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ کہ بھلا غریب اور طبقہ عوام کو

اِس ازل ترین طریق اطاعت شعاری سے کس فائدے کی امید تھی۔ اور اسے ایسے متلون مزاج اور زود رنج جابر حاکموں کی خوشامد سے کیا ملتا تھا۔ اِس کا جواب یہ ہے۔ کہ کثیر حالتوں میں اِس کا فائدہ واقعی کچھ بھی نہ تھا۔ مگر اِس کے ساتھ ہی چھپر پھٹ کر ملنے کی اُس بندھی رہتی تھی۔ ممالک مشرق میں زندگی ایک لاٹری تھی جس میں ایک فقیر محتاج ایک ہی رات میں وزارت کے درجے تک جا پہنچتا تھا اور وزیر چشم زدن میں افلاس و نکبت کے آخری درجے میں آگرتا تھا۔ اِس وجہ سے مشرق میں قسمت اور تقدیر پر ایمان زیادہ تھا۔ اور اِس کے مقابلے پر مغربی حفظ ما تقدم کا خیال قدرتی طور پر ضعیف تھا گو ایسی زندگی میں دیانت اور حسنِ کار کی گنجائش بہت کم ہے۔ مگر اِس میں شبہ نہیں۔ سست اور راسخ الاعتقاد دماغوں کے لئے قسمت آزمائی کے مواقع دیتی رہتی ہے۔ اور یہی ایک بات ہے جبکہ کہ مشرق اور مغرب کے خصوصی امتیازات اپنا اصلی رنگ لاتے ہیں۔ ایک انگریز کہتا ہے ہماری حکومت مصر میں عدالت پر مبنی ہو۔ مگر وہ بہت ہی بھدی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اِس میں قسمت کے نشیب و فراز کے سنسنی خیز واقعات کی اب گنجائش نہیں رہی۔ خود واقعات کا غیر متیقن ہونا ہی ایک دلفریب اثر رکھتا ہے۔ جس کے لطف کا اندازہ ایک گھڑی میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونے والا فقیر ہی لگا سکتا ہے۔ اہل مصر کو یہ بات ایک دل نہ بھاتی کہ مصر عہد جدید کے ہارون رشید اسمٰعیل پاشا جیسے اسپ تازی پر زمانہ جدید کی قانونی جکڑبندیوں اور ضابطہ کی پابندیوں کا پالان خر ڈال دیا جائے ✦

مغرب سے ایشیائی تنفر کا بڑا باعث مذکورہ بالا طریق استدلال ہے۔ اور نہ صرف رجعت پسند گروہ بلکہ روشن خیال لبرل گروہ کے پیشتر افراد آج کل کی مغربی ستم ظریفیوں سے خائف ہو کر اب عہد زرین کے مدح خواں بن گئے ہیں۔ ایک فرانسیسی اہل الرائے لوئیس برٹران کہتا ہے۔ میں قاہرہ میں ایک عرب خطیب کا لکچر سننے گیا۔ خطیب صاحب نے فرمایا فرانس کی موجودہ خوشحالی زیادہ تر عربی اثر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب قرون وسطیٰ کا فرانس خواب جہالت میں مدہوش تھا۔ تو ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے فرانسیسی محرک یا تو عربی تمدن کے کمالات پہ پرورش پائے ہوئے تھے۔ اور یا خود عربی الاصل تھے۔ دوسری وجہ انہوں نے یہ بتائی۔ کہ کم و بیش ۸۰ فیصدی فرانسیسی الفاظ کا مخرج عربی لغت ہے۔ گویا فاضل عرب خطیب نے باضابطہ

طور پر فرانس کا الحاق مراقش سے کر دیا۔ بعض مسلمانوں کا اشبیلیہ کے القصر یا غرناطہ کے الحمرا میں جاکر اپنے عہد ماضی کی چہل پہل یاد کرکے دست افسوس ملنا اسی طریق استدلال کا نتیجہ ہے +

اور جو بات اِس سے بڑھ کر تحیر خیز ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے ہندو بھی اپنے زمانہ قدیم کے کارناموں کو درد بھرے الفاظ میں دھراتے ہیں۔ ہندو حضرات نہایت صدق دل سے کہتے ہیں۔ کہ ہندوستانِ قدیم بتمدن۔ سائنس۔ جدت و اختراعات کا منبع اور اگر سنین حال کے ہندوستان پر سے وہ گرہن جس کی ذمہ وار انگریزی حکومت ہے۔ دور ہو جائے۔ تو اِن کا ملک پھر اپنے درخشندہ ماضی کے کارناموں سے دمک اٹھیگا۔ اور اس فلاح کا پرتو ساری دنیا پر پڑیگا۔ ایک مثل ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ زیرِ آفتاب کوئی چیز نئی نہیں۔ بنا بریں ہندو حضرات فرماتے ہیں۔ کہ ہنود قدیم کو تمام جدید بدعات و اختراعات معلوم تھیں حتٰی کہ بمب بازی ہوائی جہاز اور انجمن اقوام ایسی تحریکات پر عمل درآمد ہو چکا تھا +

یہ کہنا چنداں ضروری نہیں۔ کہ اِس قصیدہ خوانی میں کچھ نہیں رکھا۔ میرا یقین ہے کہ مثل مغرب کے مشرق میں بھی خوبیاں ہیں۔ مگر گذشتہ دس صدیوں کی نکبت نے اِن خوبیوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ ایک زمانہ دراز سے ترقی معکوس کی رو جاری رہی ہے۔ مگر آج یہ حالت نہیں۔ برخلاف اِس کے مشرق پھر آگے کی طرف بڑھنے پر آمادہ ہے۔ مگر یہ احیا کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچیگا۔ تاوقتیکہ مشرق تمام مغربی محاسن کو اچھی طرح قبول نہ کرے۔ مگر یہ واضح رہے۔ کہ یہ عمل محض نقل ہوگی۔ مگر پھر بھی مشرق ایک نئی جون میں آ گیا ہوگا۔ اور یورپ سے متنفر رجعت پسند مشرقی گروہ کا عمل اِس احیا کی تکمیل کو معرض التوا میں ڈالیگا اور مشرق کی کمزوری اور کمتری کو قائم رکھیگا +

اِس رجعت پسند گروہ کے خیالات گو مترتب بہ ہوشمندی نہ ہوں۔ مگر وہ عام فہم ضرور ہیں اِس بات کی اُمید رکھنی۔ کہ مغربی تاثرات بلا روک ٹوک نفوذ کرتے جائیں۔ اور رسومات قدیم کے مفید پہلوؤں سے متمتع ہونے والے جماعتی اجزا اِس عمل کے مخالف نہ ہوں۔ ایک امر محال ہے۔ بلکہ میں یہ کہونگا۔ کہ اگر بفرض محال مغربی تاثرات تمامتر مفید ہی ہوں۔ اور مغربی

قوموں کے افراد صداقت و خلوص کے فرشتے ہوں۔ پھر بھی یہ مخالفت رونما ہوئے بغیر نہ رہیگی۔ اور مجھے یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ مغربی اثر اور مغربی اقتدار کے نام لیوا جن کا واسطہ مشرق سے ہوا ہے بالکل بے غرضانہ صفات سے متصف نہیں ہیں۔ یہ امر تمامتر مشرقی رجعت پسند گروہ کی تقویت اور ان کے دعاوی کی تائید کا باعث ہے۔ اقتصادی اور تمدنی تعلقات کے بعض نہایت ہی تکلیف دہ حالات کے علاوہ اس رجعت پسندی کے ذمہ وار کئی ایک ایسے آئے دن کے واقعات اور حادثات ہیں۔ جن کا علم اور تجربہ کسی انسان کو تکلیف دئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

سب سے پہلے محض یہی بات کیا کم ہے کہ یورپی لوگ جو ہر جگہ صاحب اقتدار اور افراد طبقہ بالا ہیں مشنریوں کی بے عزتی اور سینہ سوزی کا موجب ہوتی ہے۔ ایشیائی قوموں کی موجودہ پستی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ کہونگا۔ کہ ایشیائی ممالک میں یورپی لوگوں کی ذاتی موجودگی ان ممالک کی فلاح کے لئے لابدی ہے۔ پھر بھی یہ امر ایشیائیوں کے لئے موجب تذلیل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یورپی لوگ جہاں جاتے ہیں۔ اُس جگہ نظامِ حکومت تو خیر تہ و بالا ہو ہی جاتا ہے۔ مگر جو بات زیادہ تکلیف دہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ان ممالک کے معاشرتی اور رواجی معیاروں میں بھی تغیر پیدا کئے بغیر نہیں رہتے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ہر جگہ اپنے لئے ایک علیحدہ شہر قائم کر لیتے ہیں جہاں مقامی قانون اور مقامی ضوابط کی زد سے وہ بچے رہتے ہیں۔ بنابریں ایک انگریزی شہر اس وقت قاہرہ کے عین وسط میں آباد ہے۔ ایک چھوٹا پیرس الجزائر کے عربی بلدے کے اندر قائم ہو چکا ہے۔ اور استنبول اسلامی کے عین مقابل ایک پیرہ آباد ہے۔ جو ترکی آبادی سے الگ ایک یورپی بستی بن گیا ہے۔ اور بنتا چلا جا رہا ہے۔

یہی حالت ہندوستان کی ہے۔ کلکتہ بمبئی۔ اور مدراس جیسے بڑے بڑے شہر گویا ایک حیثیت سے یورپی شہر ہیں۔ جو مشرق کی سرزمین پر گاڑ دئے گئے ہیں۔ تمام بڑی بڑی عمارات مغربی وضع کی ہیں۔ گو حال میں جدید عمارات کو ہندو۔ عربی طرز تعمیر پر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر پھر بھی تمام بڑے بازاروں کے نام انگریزی ہیں۔ جو سالہائے سابقہ کے وائسرائوں گورنروں اور فوجی کپتانوں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کی تسخیر میں نمایاں حصہ لیا یا بغاوتیں فرو کیں۔ دکانیں بتعداد کثیر انگریزی ہیں۔ جہاں انگریز

اور یورپین ملازم انگریزی مال کو فروخت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انگریزی وضع کی گاڑیاں اور انگریزی موٹر کاریں پکی سڑکوں پر ادھر سے اُدھر پھرتی رہتی ہیں اور ہر سمت میں جہاں کہیں موسمی حالات اجازت دیتے ہیں۔ انگریزی ادارات اور انگریزی انسٹیٹیوشن قائم ہیں۔ اور ہو رہے ہیں۔ ہندوستانی آبادی اُن شہروں کے ناخوش آئیندہ حصوں میں دبی ہوئی ہے۔ اور مدراس میں اس حصہ شہر کا نام تو (بلیک ٹون) یعنی شہر سیاہ ہے۔ ایسی جگہ یا ایسے مقامات جیسے کہ کلبیں یا کھیل گھر جو خاص کر ہندوستانی اور انگریزی نسل کے مرد و زن آپس میں ملنے جلنے کے لئے بنائے گئے ہوں۔ نہایت ہی خال خال ہیں۔ اور ایسے مقامات کے انگریزی و ہندوستانی حصہ ہائے شہر کے درمیان تعلقات پیدا کرنے کے ذرائع نہایت ہی محدود ہیں۔ ہاں بعض بعض مقامات پر مشنری یا ملٹی فوج کے پادری یا کہیں کہیں دیسی ساخت کی عجیب عجیب اشیا کے متلاشی مغربی بازاروں میں چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ مگر مجموعی طور پر ایسے شہروں کی انگریزی بستی کا وجود اپنے گرد و پیش کی ہندوستانی مخلوق کے درمیان ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے کہ کسی جزیرہ کے باشندوں کا سمندر کی لاکھوں مچھلیوں کے درمیان اور یہی حالات ان چھوٹے چھوٹے شہروں میں ملیں گے۔ جو ان مندرجہ بالا بڑے بڑے شہروں سے دور اندرون ملک میں واقع ہیں۔

ایشیا بھر میں یورپی گروہ اور مقامی آبادی کے درمیان اجنبیت کی دیوار قائم ہے۔ اور یورپی عنصر نہ صرف اجنبی ہی ہے۔ بلکہ وہ حکمران اجنبی ہے۔ اس کا برتاؤ ہمیشہ تحکمانہ ہے۔ گو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ کسی ظالمانہ یا رعونانہ طرز خیال کا نتیجہ ہے۔ بلکہ محض ایسے حالات کا۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ کئی ایک یورپیوں کا اخلاق نہایت ہی پست ہے۔ مگر اس سے امر واقع کی حیثیت نہیں بدلتی۔ اور امر واقع یہ ہے۔ کہ مغرب نے مشرق پر اس وقت اپنا تسلط جمایا۔ جبکہ اس کے لوگ اہل مغرب سے ترقی میں بہت پیچھے تھے۔ جہاں وہ اب بھی ہیں۔ بنا بریں یورپی جب تک مشرق میں ہیں۔ حکمران ہی رہیں گے۔ وہ اہل مشرق کی ترقی کے ساتھ انہیں اختیار حکومت بھی شاید دیئے جائیں۔ مگر خود ان کی حیثیت ہمیشہ حاکمانہ ہو گی۔ جہاں کہیں مغربیوں نے اپنا اقتدار قائم کر لیا ہے۔ وہاں ان کیلئے صرف دو ہی راہیں

کھلی ہیں۔ یا وہ ملک سے نکل جائیں۔ اور اگر رہیں تو صرف حاکمانہ حیثیت سے۔ علاوہ ازیں طرز حکومت بھی ہمیشہ مغربی ہوگی نہ کہ مشرقی۔ مقامی آبادی کے احساسات کا بھی خیال رکھا جائے۔ تو بھی نظامِ حکومت مغربی ہوگا نہ کہ مشرقی۔ لارڈ کرومر کے نزدیک تمام وضع کی کولونیل گورنمنٹ کی اصلی غرض وغایت مندرجہ ذیل فقرے میں مضمر ہے۔ مشرقی اقوام پر حکومت کرنے کا راز اِس عمل میں پنہاں ہے۔ جس میں حکمران جماعت کے خیال کے مطابق محکوم کی بہتری متصور ہو نہ کہ محکوم کے اپنے خیال کے مطابق +

ایسے حالات کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ جو خواہ کچھ ہی ہوں ہر ایک روشن خیال مشرقی اس قسم کی اجنبی حکومت کو نہایت تلخ گو کیسی قدر مفید۔ اور اکثر ایشیائی اسے موجب تذلیل سمجھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خود یورپی لوگوں کی خوبیاں ایشیائیوں کو ان متعلق بدظن کرتی ہیں۔ بقول میرڈتھ ٹونزنڈ۔ بھلا ایشیائی ایسے نظامِ حکومت کو کیسے پسند کر سکتے ہیں۔ جب انہیں آرام کرنے کے وقت کام کرنے کو اور کھانا کھانے کے فوراً بعد دفتر میں حاضر ہونے کی اور شدت سے پابندی اوقات کرنے کے لئے کہا جائے +

مگر ایشیائی لوگ یورپیوں سے محض بطور حکمرانِ اجنبی کے متنفر نہیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ وہ بالکل غیر نسل کے افراد ہیں۔ معاملات نسل انسانی بہت پیچیدہ ہیں۔ مگر ان کا اثر افراد کے آپس کے تعلقات پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ مشرق قریب و بعید کی اکثر قوموں کا رنگ گندمی ہے نسل انسانی کی مجموعی بحث میں یہ رنگ کا امتیاز بالکل صحیح نہیں۔ کیونکہ فی الحقیقت کوئی ایسا معیار موجود نہیں جس کے رو سے "زرد" قومیں صرف "زرد" کہلائی جا سکیں یا "سفید" اور گندمی رنگ کی قوموں کے متعلق یہ کلیت برتی جا سکے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مشرق قریب عرصہ دراز سے انسانی بھٹی بنا رہا ہے۔ جس میں کئی ایک مختلف قومیں مثلاً ایرانی اور ترک سفید رنگ کے ہیں اور جنوبی ہندوستان اور یمن کے لوگ زیادہ تر سیاہ فام ہیں۔ اور ہمالیہ کے اردگرد کے لوگ زرد ہیں۔ نیز زرد اور سفید رنگ کی قوموں کی طرح گندمی رنگ کی قومیں کسی مخصوص حصہ دنیا میں آباد نہیں۔ بلکہ ان کے رنگ کے لوگ مختلف قوموں میں ملے ہوئے ملیں گے۔ اور ان تمام کو ایک قومیت کے خصائص سے آراستہ کرنے میں اسلام نے

نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ جو اسلام کا پیرو ہے۔ کم وبیش گندمی رنگ کا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں۔ کہ گندمی رنگ کی دنیا کا بیشتر حصہ مسلمان ہے۔ مگر پھر بھی اِس دنیا کی حدود محض گندمی رنگ کی قوموں کے حدود تک نہیں رہیں۔ بلکہ اِس کے پیرو یورپ کی سفید رنگ کی قوموں میں اتنی ہی کثرت سے ملیں گے۔ جتنے کہ افریقہ کی سیاہ فام یا مشرق اقصےٰ کی زرد فام قوموں میں +

اِن مستثنیات کو چھوڑ کر گندمی رنگ کی قوم کا اب ایک مسلمہ وجود دنیا میں قائم ہو چکا ہے۔ اور اِس قوم کے افراد کے درمیان معاشرتی اور روحانی رابطہ بھی قائم ہے۔ اِس رابطے کے مظاہرات کی تعریف کسی خاص الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ مگر اِس کے موجود ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور بحالت تحریک اِس کے امکانات کا کوئی اندازہ نہیں لگاسکتا۔ اِس کا اولیں مظہر یہ ہے۔ کہ تمام ایشیائی اپنے آپ کو بھائی بھائی سمجھتے ہیں۔ خواہ اِن کے اندرونی تفرقات کیسے ہی شدید کیوں نہ ہوں۔ اِس بھائی چارے کی تصدیق ۲۰۰۰ سال سابقہ کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ اور آج بھی اِس میں کسی کو شبہ نہیں +

نسل انسانی کی تقسیم دنیا کے نہایت ہی پائدار حالات میں سے ایک ہے۔ اور اِس کی بنا صرف رنگ ہی پر نہیں۔ بلکہ بالوں کی بناوٹ جسمانی قطع اخلاقی اور روحانی وابستگی اور معاشرتی معیارات اور روایات کی باہمی بافتگی اور اسی قسم کے اور دلائل جو آئے دن ایک نسل کو دوسری نسل سے نمایاں طور پر متمیز کرتے ہیں +

اور اِس بنیادی نسلی امتیاز کا وجود اِس تفرقہ کی جڑ ہے۔ جو سفید رنگ اور گندمی رنگ کی دنیا کے درمیان قائم ہے۔ بحیثیت مجموعی مشرق قریب وبعید کی گندمی رنگ کی قوموں اور یورپ کی سفید قوموں کی تفریق کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اور اِس کا مٹانا ایک شدید حماقت ہوگی میرے رائے میں مشرق اور مغرب کا یہ بُعد ہی ایک دوسرے کی ترقی اور فلاح کا موجب ہو سکتا ہے۔ اور نسلی اختلاط اِن امکانات کو تباہ کر دیگا۔ مشرق اور مغرب ہر دو سے دنیائے سابقہ مختلف قسم کے فیوض سے مستفید ہوتی رہی ہے۔ اور ہوتی رہے گی۔ مگر اِس امر کی شرط یہ ہے۔ کہ وہ کلیتاً مشرق اور مغرب رہیں۔ نسلی اختلاط کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ نہ مغرب رہیگا۔ اور نہ

مشرق مشرق اور ان کی خصوصی ذاتیت نیست و نابود ہو جائیگی ۔

ایشیائی اور مغربی اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں ۔ اور اس کا ثبوت ان ہر دو کے اس تنفر سے پیدا ہوتا ہے ۔ جس سے وہ یوریشین یعنی "دوغلے" طبقہ کو دیکھتے ہیں ۔ میرڈیتھ ٹونزنڈ کہتا ہے ۔ بعد المشرق والمغرب ہمیشہ سے رہا ہے ۔ اور رہیگا ۔ کوئی سفید آدمی گندمی رنگ کی عورت سے شادی نہیں کرتا ۔ اور اگر خال خال ایسا ہو بھی جاتا ہے ۔ تو ہر دو کے دل میں ایک پنہاں افسوس اپنے اس فعل کا قائم رہتا ہے ۔

مندکرہ بالا سیاسی ۔ اقتصادی اور معاشرتی اختلافات سے اُن تحریکاتِ مخالفانہ کا پتہ چلیگا جو فریقوں کے درمیان ظاہر ہوتی رہتی ہیں ۔ اور جو عملی نفوذ مغربیت کی مانع ہیں ۔ مگر کسی حد تک تاثراتِ مغرب اپنا کام کئے جا رہے ہیں ۔ اور مندرجہ بالا اختلاف اس لابدی ردِ فعل کا ثبوت ہے جو آئے دن مشرق میں ظاہر ہوتا رہتا ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکیگا ۔ کہ کہاں تک مشرق میں مغربیت اپنا اثر ڈال سکیگی ۔

ایک امر تو بالکل تیقن ہے ۔ اور وہ یہ ہے ۔ کہ مغرب کا تسلط خواہ کتنی ہی دیر تک اور کیسا ہی کیوں نہ ہو ۔ ہمیشہ ضعیف بنیادوں پر قائم ہوگا ۔ مغربی حکمران ہمیشہ اجنبی رہیں گے ۔ ایشیائی شاید ان کے متحمل تو ہونگے ۔ مگر ان سے کسی قسم کا التفات نہ رکھیں گے ۔ اور انہیں ہمیشہ غیر ملکی سمجھتے رہیں گے ۔ بنا بریں مغربی حکومت کا قیام نہایت ہی غیر تیقن ہوگا ۔ اور آنے والی نسلوں کی روز افزوں ترقی اس کی متحمل نہ ہوگی ۔ یہ حالت کسی طرح سے بھی استحکام طاقت بالادست کی ممد و معاون نہیں ہو سکتی ۔ اور اس کی بربادی کا دغدغہ ہر وقت لگا رہیگا ۔

مغربی اقتدار کی ناپائیداری کا ثبوت جنگ روس و جاپان کے واقعات نے اچھی طرح سے دے دیا ۔ اس ہولناک جنگ کے زمانے تک یہ خیال کیا جاتا تھا ۔ کہ مغربی اقتدار مشرق پر سے کبھی نہ ہٹیگا ۔ مگر ایک پرہیبت مغربی طاقت کی تباہی نے یہ واضح کر دیا ۔ کہ مغربی طاقت کا قیام جاوید محض ایک وہم تھا ۔ اس امر سے مسرت کی ایک لہر ایشیا اور افریقہ میں سے پھر گئی ۔ ایک سکاچ مشنری شمالی ہندوستان میں جاپانی فتوحات کا اثر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ۔ شمالی ہندوستان میں ایک سنسنی سی پھیل گئی ۔ دور دراز دیہات میں ان پڑھ دہقان راتوں کو

الاؤ تاپتے ہوئے جاپانی فتوحات کا ذکر کرتے تھے۔ ایک بوڑھے دہقان نے کہا۔ کہ غدر کے بعد سے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اور ایک ترک اہلکار جس نے مغربی ایشیا میں ایک زمانہ گذرا تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاہل مزارع روزانہ جنگی خبروں کو سنتے تھے۔ اور دوسرے لوگوں سے بصد شوق اِن کا ذکر کرتے تھے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشرق متحرک ہو چکا تھا۔ اور صدیوں کی غفلت ختم ہو رہی تھی۔ اور ایشیا کے عہدِ جدید کا آغاز ہو چکا تھا۔

مگر جنگ روس و جاپان ہی صرف اِس جوشِ ترقی کی بانی نہ تھی۔ بلکہ گذشتہ صدی کے کئی ایک اہم واقعات بھی اِس کا موجب ہوئے تھے۔ ہاں ان واقعات کے نتائج اور جاپانیوں کی عظیم الشان فتوحات ایک ہی وقت میں واقع ہوئیں۔ اور اِس نئے ہیجان نے کروڑہا ایشیاؤں کی امیدوں میں اک نئی روح پھونک دی۔

اِس صدی کے سنین اولیٰ کی یورپی غضبیت کے کارناموں سے اِن نئے احساسات کو اور بھی تقویت پہنچی۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ جس وقت مشرقِ اقصےٰ میں جاپانیوں نے ایک مغربی طاقت کے ایشیائی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اُسی وقت اہلِ مشرق پر مغربی حملے پہلے سے کہیں بڑھ کر ہونے شروع ہو گئے۔ اِن حملوں کی مخالفت جو کچھ اسلامی دنیا میں رُونما ہوئی۔ اُس کا ذکر ہم پہلے ابواب میں کر آئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہاں تک یہ مخالفت جاپانی فتوحات کا نتیجہ تھی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ مغربی امپیریلزم ۱۹۰۴ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی دس سالوں میں ایک خطرناک طریق عمل کا اظہار کر رہی تھی۔ آرمینیس ومبیری نے جنگ طرابلس کے دوران میں کہا۔ جوں جوں مغربی تعصبیت ترقی کرتی چلی جا رہی ہے۔ توں توں مشرقی اتحاد بین الملل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور مغرب کے خلاف جذبہ تعصب تقویت حاصل کر رہا ہے۔ اِس قسم کی کورانہ یورپی بدافعالیاں جنگ مشرق مغرب کے امکان کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور اگر یہ واقعہ اٹل ہو گیا۔ تو پھر خدا جانے ایشیا میں نفوذ غربیت کا کیا حشر ہو گا۔

جنگ یورپ نے اِن بدافعالیوں کو بجائے کم کرنے کے اور بھی زیادہ کر دیا۔ اِس جنگ عظیم کے واقعات نے ایشیا پر صاف طور سے واضح کر دیا۔ کہ مغرب میں کسی قسم کی یک جہتی تو درکنار معمولی رواداری بھی مفقود ہے۔ اور خود یورپی قومیں اپنے اختلافات پر نہایت زور سے قائم رہنے

کی منتمنی میں۔ اگر کوئی امید کی کرن اِس صحت میں نظر آتی تھی۔ تو وہ یہ تھی۔ کہ اتحادی مدبرین ایک اعلےٰ درجے کے لبرل پروگرام کے دعادی کر رہے تھے۔ مگر جونہی جنگ ختم ہوئی۔ تو یہ معاملہ روز روشن کی طرح ظاہر ہوگیا کہ اتحادیوں کا اصلی مقصد اِس لبرل پروگرام کی تکمیل نہ تھی۔ بلکہ سارے مشرق کی تسخیر جس کا پیمان وہ اپنے خفیہ عہد ناموں میں باندھ چکے تھے۔ اور اِن عہد ناموں کا انکشاف ہوتے ہی ایشیا بھر میں ایک شور احتجاج بلند ہوا۔ اور بغاوت اور سرکشی کے آثار ہر طرف سے نظر آنے لگے۔ اِن واقعات کا اتنا اثر تو ضرور ہوا۔ کہ اتحادی طاقتیں اپنے منتہائی ارادوں سے باز آئیں۔ اور امید کی جاتی ہے کہ اسی طرح وہ اپنے دوسرے ارادوں سے بھی باز رہیں گی۔ اِس ہیجان بعد از جنگ کا بیان باب آئندہ میں کیا جائیگا۔ اِس مقام پر ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں گے۔ کہ زمانہ حال کے یورپی منصوبوں نے یورپ کی سیاسی رعب کا خاتمہ کر دیا۔ اور مشرقیوں کی آنکھ کھول دی۔ اِس کے علاوہ اِسی جنگ سے کئی ایک اور نتائج پیدا ہوئے۔ مثلاً ایک یہ کہ افریقہ اور ایشیا کے دور دراز مقامات سے حبشی اور ایشیائی مغربی سپاہیوں کے ہمدوش ہو کر مغربیوں کے خلاف لڑے۔ گو ایسی فوجوں کا کثیر حصہ ایشیا اور افریقہ کے میدانہائے جنگ میں بھیجا گیا۔ مگر پھر بھی کم و بیش دس لاکھ جوان تو یورپ میں بھی آئے۔ یہاں انہوں نے سفید سپاہیوں کو ہلاک کیا۔ سفید عورتوں سے بدفعلیاں کیں۔ اور سفید اقوام کی کمزوریوں کے نقشے اپنے اپنے ملکوں میں لے گئے۔ آج افریقہ اور ایشیا یورپ کی حقیقت سے ایسے واقف ہیں۔ جیسے کہ وہ پہلے کبھی نہ تھے۔ سب سے زیادہ پرخطر یہ حقیقت ہے۔ کہ عہد نامہ ورسائی جس سے اتحادیوں کا دعوےٰ تھا کہ سیاسی بدعنوانیاں سرے سے معدوم ہو جائیں گی۔ نہ صرف اِن بدعنوانیوں کا موید ہے۔ بلکہ دنیا کے پولیٹکل نظام میں کئی ایک اور رخنے پیدا کرتا ہے۔ یورپ آج مجروح اور شکستہ حالت میں ہے۔ اور اِس بات کا علم ایشیا اور یورپ میں بدنتائج پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ ہیں حالات حاضرہ۔ مشرق میں اس کی روایات قدیم و احساسات جدید کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ اور مغرب اپنی بداعمالیوں کے ہاتھوں درماندہ پڑا ہوا ہے۔ اور مجھے خوف ہے۔ یہ دو باتیں نہایت ہی شدید اور پرخطر امکانات کا موجب نہ ہوں۔ امر واقع یہ ہے۔ کہ مشرق جدید کے حالات حاضرہ خود یورپی

تاثرات کے نتائج ہیں۔ جو ایک سو سال سے ایشیا پر وارد ہو رہے ہیں
اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ کن کن صورتوں سے یہ حالات پیدا ہوئے۔

باب چہارم
تغیرات سیاسی

ایشیائی درماندگی کی بڑی وجہ نظام سیاست کی بے ترتیبی تھی۔ آغاز روزگار سے لیکر آج تک مشرق میں صرف ایک ہی قسم کے نظام حکومت پر عمل ہوا ہے۔ اور وہ حکومت استبداد ہے۔ جس میں رعایا کی حیثیت محض غلامانہ اور جس میں ان کی آبرو ان کے املاک بلکہ اُن کی جان کا مالک مستبد حاکم ہوتا تھا۔ اگر کوئی چیز اس استبداد کی مانع ہے تو وہ مذہب ہے۔ بعض اہل الرائے کہیں گے کہ رسم ورواج بھی اس استبداد کا مانع ہو سکتا ہے۔ مگر میری رائے میں وہ بھی مذہب کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ مشرق میں مذہب فی الحقیقت رسم ورواج کے مجموعے کا نام ہے۔ اس مذاہب کے زیر حمایت مشرقی عامل اور مشرقی فرقۂ علما اپنے احکامات کا اجرا کرتے ہیں۔ لیکن اس امر سے ان علما اور ان حکام کے افعال پر کچھ نمایاں اثر نہیں پڑتا کیونکہ یہ مصدقہ بات ہے کہ اہل دیں کو خوش کر کے عمالان حکومت جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں۔ مشرقی تاریخ کا بھی ایک واقعہ کہ فرعون مصر نے تمام اہل مصر کو اہرام مخروطی کی تعمیر پر لگا دیا اور وہ لوگ بغیر چون وچرا اس بیگار میں لگ گئے۔ ایشیائی استبداد کی بین دلیل ہے۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" کی معنی خیز مشرقی ضرب المثل ایشیائی نظام حکومت کی کامل تفسیر ہے۔

صدیوں کے انسانی تجارب نے یہ امر ثابت کر دیا ہے کہ حکومت استبداد انجام کار فوائد انسانی کے منافی ہے۔ ہاں ایسے جملات بھی ایک حقیقت رکھتے ہیں۔ جیسے "استبداد سعد" جس کے رو سے ایک پدرانہ شفقت کا اہل حاکم ہمدرد اور دانش مند وزرا کی مدد سے اپنی رعیت کی فلاح میں شب وروز لگا رہتا ہے۔ مگر ایسے پدرانہ خصال تاجداروں کے

اولاد عموماً نااہل اور ظالم بھی ہوتی ہے۔ جو اپنی بدعملیوں سے ہوشمند اجداد کے کارناموں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ رحبعام بن سلیمان بن داؤد ایسے اجداد و جانشین صفحۂ تاریخ میں ہما بجا مل گئے

مگر مستبدین فیاض کی حکومت بھی کلیتہً نقائص سے پاک نہیں ہو سکتی۔ سب سے بڑا نقص یہی ہے۔ کہ ان کی حکومت تمام تر شخصی ہوتی ہے۔ اور ان کے ہر ایک قول اور فعل کی بھلائی یا برائی کا معیار ان کی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ اس لئے ایک مطلق العنان مستبد حاکم کی نیک حکمت عملی کا اس کی حرم یا اس کی اپنی غفلت کے اثر سے مبدل بہ لعنت ہو جانا ناممکن نہیں۔

ایشیائی استبداد نظام حکومت یورپ کے کسی زمانے میں تو کیا رومی سلطنت کے بدترین عہد میں بھی کبھی رونما نہیں ہوا۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا مستبد کے ایشیائی مفہوم کا مماثل یورپ کی تاریخ میں کوئی بھی مغربی تاجدار نہ ملیگا۔ فریڈرک اعظم کے طریق حکومت کو فیاض استبداد سے یاد کیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی اس میں اور ایک ایشیائی مستبد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے کہ فریڈرک مطلق العنان تو تھا۔ مگر اس کی رعیت کے افراد اس کے غلام نہ تھے۔ اس کے متمرد پرشین۔ سرکشیدہ عمالان حکومت۔ اور ضدی جرمن زمیندار نہ صرف صاحب آبرو تھے۔ بلکہ اپنے حقوق کی پوری پوری حفاظت کرتے تھے۔ عوام کی بے چون و چرا اطاعت کا بڑا باعث ان کا یہ علم تھا۔ کہ فریڈرک نہ صرف نہایت تندہی سے کام کرتا تھا۔ بلکہ ملک کی فلاح کا بہترین حامی تھا۔ اگر فریڈرک اپنے عہد کے کسی زمانے میں کور دماغ متلون مزاج جابر بن جاتا۔ تو وہی پرشین اس کو سیدھا کر دیتے۔

ایشیا میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مشرقی نظام حکومت کا سب سے بڑا اصول یہ ہے۔ رعیت اپنے بادشاہ کی جسے خدا نے ان کے اوپر حاکم کیا ہے۔ دل سے اطاعت کرے اگر وہ مہربان اور عادل ہو۔ تو اس کی اطاعت اور اس سے محبت فرض ہے۔ اور اگر جابر ہو۔ پھر بھی اس کی اطاعت فرض ہے۔ اگر ایک ایشیائی تاجدار اپنی زندگی حرم میں گذارے۔ اور اپنے فرائض منصبی کا بار وزیر سلطنت پر ڈالدے۔ تو اس کے لئے یہ سب کچھ جائز ہے اب یہ وزیر سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اور ہر ایک فرد رعایا کی جان اس کی مٹھی میں ہے مگر یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اسی وزیر کی گردن بادشاہ کے اشارے سے چشم زدن میں اڑا دی جائے

وزیر کی مجال نہیں۔ کہ وہ اپنی ہلاکت سے بچنے کی تدبیر کرے۔ یہ ٹھیک مثال اِس استبداد کی ہے۔ جس کا رواج مشرق میں صدیوں سے رہا ہے۔

ایسے حالات کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے۔ کہ کسی قسم کی تدریجی ترقی نظام سلطنت میں یا حالت رعایا میں ہو سکے۔ تاریخ مشرق میں ترقی و تنزل کے دور جس ناگہانی طریق سے آئے۔ اُسی طرح سے رخصت ہو گئے۔ اور ایسی مثالیں تو کثرت سے ملیں گی۔ جبکہ وقتی افراط تفریط سے فائدہ اٹھا کر ایک حوصلہ مند سردار صاحب تخت و تاج بن بیٹھا۔ اُس نے اپنی مستعدی سے دوسروں میں جان ڈال دی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے حسنِ انتظام اور دوسروں سے کام لینے کی اہلیت سے سلطنت کی درہم برہم حالت کو منظم کر دیا۔ لیکن لیسا اوقات یہ نتائج اِس حاکم اعلےٰ کی انتہا درجے کی سختی سے پیدا ہوتے تھے۔

مگر ایسے موقعوں پر حالات کی یہ صورت اُسی وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب تک حاکم اعلےٰ کی جرأت اور مستعدی میں کمی نہ ہونے پائے۔ مگر جونہی اِس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اُس کی جگہ پر عموماً ایک ایسا نااہل ظالم جانشین آموجود ہوتا ہے۔ جس کی تربیت اطاعت شعار غلاموں اور منصوبہ باز حرم کی بیگمات کے درمیان ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارے کا سارا ملک پھر اسی ڈھنگ میں جا گرتا ہے۔ جہاں سے وہ عہد سابق میں نکالا گیا تھا اُس کی وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ انتظام سلطنت کا ایک واحد وجود پر انحصار اور اُصولہائے تنظیم معاملات کا عدم وجود۔ جب جانشین ثانی کی باری آتی ہے۔ تو عاملان و والیان صوبجات سلطنت کی مرکزی طاقت کی درہمی برہمی دیکھکر اپنی اپنی جگہ کے مطلق العنان صاحب اختیار بن بیٹھتے ہیں۔ اور چند سالوں کے اندر اندر ایک مہتم بالشان سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ پھر جب کبھی قسمت سے کوئی صاحب فراست صاحب منصب معاملات کو اپنے اختیار میں کر لیتا ہے۔ تو وہ صرف متذکرہ بالا قسم کے دورِ ثانی کی بنیاد رکھتا ہے۔

ساری مشرقی تاریخ کا یہ لب لباب ہے۔ ہاں بعض موقعوں پر مغربی تاثرات کے تحت یہ افراط تفریط ختم ہو جاتی ہے۔ اور عام حالات پر یورپی تحریکات یا خاص قسم کی لبرل مشرقی تحریکات کا اثر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لئے استبداد سارے مشرق پر حاوی نہیں

ہمیں آئے دن ایسی قوموں کی مثالیں بھی ملیں گی۔ جو قومیں حکومت کی جانی دشمن تھیں۔ ایسی قوموں میں سے ایک قوم عربوں کی ہے۔ یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ اسلامی تحریک سے متاثر ہو کر عربوں نے ایک ایسے نظامِ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جو ایک قسم کی الٰہیہ جمہوریہ تھی۔ اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ یہی خلفائے عرب بغداد پہنچکر ایرانی جابر تاجداروں کے مماثل ہوگئے اور ان کے حریت پسند عرب ہمقوم اس رجعت سے برانگیختہ ہو کر اپنے صحرائے آزادی میں آرہے۔ گو ایک زمانے کے لئے یہ ابتدائی اسلامی سیاسی مساوات دب گئی۔ لیکن مسلمانوں کے دل حریت اور عدل کے فوائد سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اور جہاں کہیں حالات ان دبے ہوئے جذبات کی تجدید کے موید ہوتے تھے۔ تو نظامِ جمہوریت پھر سے رونما ہو جاتا تھا۔ علاوہ بریں جنگجو اہل عرب اپنے ملک کو آزاد رکھنے کے خیال سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ اسلامی اخوت و مساوات کی سنہری تعلیم نے اس جذبہ کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ اور کسی درباری مولوی کو جرأت نہ ہوئی۔ کہ رسول اکرم کی تعلیم اخوت یا جذبہ حریت کے رد کی دلیل پیدا کر سکے۔ بھلا ممکن ہے۔ کہ اسلام کے دورِ سعادت کی یاد کسی جابر سے جابر مسلم حاکم کے دل سے محو ہو سکے۔ جبکہ حضرت ابوبکرؓ جیسی شخصیت نے کھڑے ہو کر کہا۔ اے قوم مومنین تم نے مجھ ایسے احقر ترین ممبر جماعت کو اپنا امیر منتخب کیا ہے۔ جب تک میرے افعال صحیح ہوں۔ میری اطاعت کرو۔ اگر وہ غلط ہوں۔ تو مجھے اپنی فرض شناسی کی تنبیہ کرو۔ نیکی صرف صداقت میں ہے۔ اور کذب قابل ملامت ہے۔ میں کمزوروں کا محافظ ہوں۔ تم میری اطاعت اس وقت تک کرو۔ جب تک تم مجھے شریعت کا حامی پاؤ۔ اس کے خلاف جاتے دیکھکر میرے حکموں کی پرواہ نہ کرو۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ سنین اولی کا اسلام ایک حریت پسند اور آزاد جماعت انسانی کا مذہب تھا۔ اور ایسے لوگوں کا لبرل اصولوں سے عاری ہونا ممکن نہیں۔ پروفیسر لیبر کہتا ہے۔ کہ شریعت محمدیہ سراسر مساوات کی حامی ہے۔ اور استبداد کی دشمنی۔ آرمینیس وَمبیری کہتا ہے۔ یہ اسلام کا قصور نہیں۔ کہ مسلمان آج فلاکت میں مبتلا ہیں۔ بلکہ اس فلاکت کے ذمہ وار ان کے جابر اور ظالم مسلمان فرمانروا ہیں۔ جنہوں نے اسلامی تعلیم اخوت حلال

و مساوات کو پس پشت ڈال کر قرآن حکیم میں سے اپنے استبداد کے موید کلمات تراش لئے۔ اور مذہب کو پتھر کی لکیر بنا کر مسلمانوں کو اِس لکیر کا اندھا فقیر بنا دیا۔ یہ امر فی الحقیقت تاخیر احیا اسلام کا موجب ہوا ہے ؛

اٹھارہویں صدی کے اسلامی انحطاط پر ابتدائی ابواب میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اور یہ بھی دکھایا گیا ہے۔ کہ اسلامی تحریک جاریہ نہ صرف اسلام کو غلط بدعات سے پاک کرنا تھا بلکہ اسلامی حکومتوں کے استبداد کے خلاف ایک طرح کی صدائے احتجاج تھی۔ مسلمانوں کے اِس اندرونی جذبۂ اصلاح سے بیرونی یعنی مغربی لبرل سپرٹ متصادم ہوئی۔ اسلامی ممالک کی گری ہوئی حالت کو دیکھ کر روشن خیال مسلمان لیڈر اور بعض مسلمان تاجدار بھی اِس فکر میں تھے۔ کہ بڑھتے ہوئے مغربی خطرات کا مقابلہ اسلامی حکومتوں کے اندرونی انتظام کی اصلاح سے کیا جائے۔ اِس جدید نصب العین کے نام لیوا سلطان محمود ثانی سلطان ترکی اور محمد علی خدیو مصر تھے۔ جو دونو انیسویں صدی کی ابتدا میں مسند حکومت پر متمکن ہوئے ؛

اِن فرمانرواؤں میں سے کسی کا یہ خیال ہرگز نہ تھا۔ کہ وہ نظام مشروطہ کی بنیاد ڈالیں اور اپنے آپ کو سلاطین مشروطہ قرار دیں۔ مگر نصب العین اب تک شخصی حکومت تھا۔ یورپی وضع کی شخصی حکومت نہ کہ ایشیائی طریق کی۔ قیام صیغہ ہائے۔ حربی۔ انتظامی و عدلی اِن کا مقصد خاص تھا۔ اور وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ اِن ہر سہ نظامت ہائے کے عمال اپنے اپنے فرائض اپنے دستور العمل کے مطابق بغیر مداخلت بالا کر سکیں اور کریں ؛

محمود ثانی اور محمد علی اور دیگر اسلامی فرمانرواؤں نے اِس باب میں کافی جرأت کا ثبوت دیا مگر مسلمانوں کی بدقسمتی سے اِس کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ وجہ یہ تھی۔ کہ انہوں نے مغربی وضع کے دفاتر پیدا کئے۔ اور اِن میں مغربی لباس میں ملبوس ایسے اہلکار بٹھا دئے۔ جن کو مغربی طریق حکومت کا کچھ علم یا تجربہ نہ تھا۔ اِن میں سے بعض اِس تغیر نظام کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ بنا بریں اِن کی تائید و شرکتِ اصلاح محض احکام بالا کی تعمیل تھی۔ نہ کہ اپنا منتہائے خیال۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ ملکی محکموں کی ناکامی کا ثبوت ملتا رہا۔ گو کسی حد تک محکمہ جنگ کی کارگذاری نے نئے اصولوں کی کامیابی کا ثبوت دیا۔ قصہ مختصر اِن نئے محکموں نے اسی قسم کے مغربی محکموں کے نقص

تو اختیار کر لیتے۔ مگر خدیو نے ایسا بھی نہ کیا۔

مگر اصلاح کا خیال بعض افراد کے دل و دماغ میں گھر کر چکا تھا۔ اب ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا۔ جو ہر قسم کی مغربی جدتوں کا متمنی ہو بیٹھا۔ اس کا نصب العین حکومت پارلیمنٹ نظام مشروطہ تھا۔ ممالک یورپ کے مطبوعات کے پڑھنے سے اس گروہ کی تعداد اور طاقت میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ اور انہوں نے خود اپنے اخبارات جاری کئے۔ اور جدید وضع کے سکول اور مدرسے قائم کئے۔ اور انیسویں صدی کے تیسرے ربع یعنی ۱۸۷۶ء میں انہوں نے سلطان عبدالحمید مرحوم سے فرمان پارلیمنٹ لیکر ہی چھوڑا۔

اس زمانہ جوش و خروش کے بعد کچھ دن مایوسی اور رجعت کے بھی آئے۔ مسلمان فرمانروا اپنی رعایا کی بڑھتی ہوئی لبرل ازم سے خائف ہو گئے۔ اور سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ کا خاتمہ کر دیا۔ اور عہد جدید کی پر جوش شخصیتوں کی چھانٹ چھانٹ کر بیخ کنی کی۔ ایران میں شاہ نے نوزائیدہ آزادی ایران کی حامی پارٹی کو نہایت غضب سے دبا دیا۔ اور خدیو اسمعیل نے اہل مصر کی جمہوریت کو اجنبی فوجی طاقت کی مدد سے نیست و نابود کر کے انگریزی قبضہ مصر کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۰۸ء کے عثمانی انقلاب تک باقی ماندہ آزاد اسلامی سلطنتوں میں کہیں کہیں کوشش آزادی رونما ہوئی۔ مگر نہ اسقدر کہ جسے عام کہا جا سکے۔ صدہا داعیان حریت ترکی اور ایران سے بھاگ سوئٹزرلینڈ وغیرہ جیسے ممالک میں پناہ گزین ہوئے اور وہاں وہ اپنے اپنے ملکوں کی فلاح کے لئے مطبوعات شائع کرنے لگے۔ جو کسی نہ کسی طرح سے ان کے وطنوں میں پہنچ کر ان کے ہمخیال اہل وطن کی بیداری کا باعث ہوئیں۔

ان تحریکات کی اب تو ان کے اپنے ملکوں میں تائید ہونے لگی۔ ایک نوجوان ترک شاعر نے اس زمانے میں لکھا۔ جو چیز آج کل یورپ میں ہمارے لئے ستائش خیز ہے۔ وہ ترقی علوم و فنون ہے۔ اور وہ محض آزادی کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک اچھی چیز ستارہ آزادی سے تنویر حاصل کرتی ہے۔ بغیر حریت زندگی خواب ہے۔ سراب ہے۔ موت ہے۔ اور آزاد زندگی۔ خوشی کی زندگی ہے۔ ترقی کی زندگی اور زندگی جاوید ہے۔ انیسویں صدی کے آخری زمانے تک مغربی اہل بصیرت نے مشرق کے سیاسی استبداد کے نیچے ایک پرزور آزادی کی رو کو بہتے ہوئے

دیکھا۔ جب آرمینیس وامبیری ۱۸۹۶ء میں ترکی میں واپس آیا۔ تو اُس نے ملک کے ہر طبقے کی حالت میں ایک غائر تبدیلی پائی۔ وہ کہتا ہے۔ لوگ یورپ میں تمام دن۔ "نوجوانِ ترک" "حکومت مشروطہ" "مطبوعات" "انقلاب انگیز" ایسے کلمات سنتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ معلوم ہی نہیں۔ کہ دولت عثمانیہ کے ہر گوشے میں اب ایک نہایت ہی قوی جذبہ آزادی پیدا ہو چکا ہے۔ اور قوم اب سلطان وقت کے ہاتھوں میں موم کی ناک بنے رہنے سے عاجز آگئی ہے۔ ترکی میں یہ جماعت "نوجوانانِ ترک" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اور ہر ایک متمدن اور پڑھا لکھا ترک اس پارٹی کا ممبر ہے۔

اس کے ساتھ ہی مغربی قوموں کے مشرقی مقبوضات میں بھی اسی قسم کے جذبات موجزن تھے۔ انیسویں صدی کے اخیر تک صرف چار اسلامی سلطنتیں یعنی افغانستان۔ ترکی۔ ایران اور مراقش کم و بیش خود مختار رہ گئی تھیں۔ افغانستان اور مراقش بوجہ اپنی غیر متمدن حالت اعلیٰ درجے کی طاقتیں کہلانے کی مستحق نہ تھیں۔ اس لئے صرف ایران اور ترکی میں لبرل تحریکات نے نشوونما پانی شروع کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان۔ مصر اور الجزائر جیسے ممالک میں بھی ترقی اور آزادی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ کیونکہ یہ ممالک معاشرتی لحاظ سے اور اسلامی ممالک سے بہت آگے تھے۔ اور ترقی اور آزادی کی خواہش نہ صرف متمدن بلکہ ایک وحشی کے دل میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ترکی اور ایران کے اندرونی انقلابات نے ان ممالک کی لبرل ازم کو اور بھی تقویت بخشی۔ مگر ان دو لبرل گروہوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ ایران اور ترکی میں جذبہ جمہور استبداد کا استیصال کرنا چاہتا تھا۔ مگر مصر۔ ہندوستان اور الجزائر میں آزادی کے جذبات عوام کے باعث تحریک ہو رہے تھے۔ اور اس خواہش آزادی کا کوئی مستقل پروگرام موجود نہ تھا۔ اور نہ اس کو کی تکمیل پر آزادی سے فائدہ اُٹھانے کی صورت موجود تھی۔ بنا بریں اس تحریک کو ہم تحریکِ وطنیت کہیں گے۔ وطنیت کے ابواب میں اس مسئلہ پہ بحث کریں گے۔ اس مقام پر قابل لحاظ امر یہ ہے۔ کہ ان تحریک ہائے وطنیت و آزادی کے بانیوں میں نہ صرف روشن خیال لبرل ہیں بلکہ ایسے متعصب رجعت پسند۔ اور منصوبہ باز افراد جو اپنے اپنے ملکوں کو آزاد کر کے اسیر شدید وضع کے استبداد کا قیام چاہتے ہیں۔ ہاں ان کی تقریروں اور خطبوں کے عنوان تو

آزادی "حُریت" وغیرہ ہوتے ہیں۔ مگر یاس سے اِن کا صحیح مفہوم آزادی از جبر اغیار ہے۔ اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے۔ کہ لبرل ازم اور حب الوطنی ضروری طور پر ایک دوسرے کی معاون نہیں۔ ہسپانوی دہقانوں نے نپولین کی فوج کے خلاف پُر زور احتجاجیں توکیں۔ مگر انہوں نے اپنے مستبد بادشاہ کا بھی نہایت جوش سے خیر مقدم کیا۔ اور جب وہ قومی غلامی کی ہتھکڑیاں لے کر پھر اِن کے ملک میں وارد ہوا تو انہوں نے ایسے جلوں سے اسے مرحبا کہا "زندہ باد زنجیر استبداد"

ایران اور ترکی کی مستبدانہ رجعت پسندی کا خاتمہ ۱۹۰۸ء میں ہوگیا۔ دونو ممالک نے اپنے اپنے تاجداروں کو برطرف کر دیا۔ ترکی نے عبدالحمید مرحوم کو اور ایران نے محمد علی کو جو بقول مسٹر شوسٹر نہایت ہی خبیث اور بدباطن شاہِ ایران تھا۔ اِن حادثات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دونو ممالک میں نظام مشروطہ۔ پارلیمنٹ اور ایسے ہی اور انسٹی ٹیوشن قائم ہوگئے

اگر حالات موافق ہوتے تو ان تحریکات کا نتیجہ کیا ہوتا۔ اب یہ امر بحث طلب [illegible] بدقسمتی سے اِس مشرقی سیاسی نظم کا [illegible] وقت تھا جبکہ دنیا ان بواعث کی آگ لگ چکی تھی۔ جس سے جنگ عظیم جیسا ہولناک حادثہ پیدا ہوا۔ نہ ترکی اور نہ ایران کو مہلت دی گئی۔ کہ وہ سالہا سال کی بدعنوانیوں کی بیخ کنی کرکے اِن کی جگہ ایک آزاد نظام سلطنت کی بنیاد ڈال سکیں۔ خباثت مآب نظارتہائے یورپ اِن ہر دو کی ضعیف حالت کو دیکھ رہی تھیں۔ اور موقعہ پاکر فوراً ہی اِن پر قابض ہو بیٹھیں۔ اور جنگ عظیم نے اِس دستبرد کی پالیسی کو اور بھی تقویت بخشی

مشرق قریب کے سیاسی اقتصادی اور دیگر ہر قسم کے حالات و معلومات کا ہم وجوہ مکمل خاکہ نہ ہونے ہوتے یہ کہنا واقعی مشکل ہے۔ کہ آیا یہ ممالک نظام مشروطہ اور اسی قسم کے اور مغربی سیاسی انسٹی ٹیوشن کو کامیابی کے ساتھ اختیار کرنے کے اہل ہیں یا نہیں۔ کیونکہ کوئی بھی طبقہ آرا اس مسئلہ پر قطعی طور پر متفق نہیں ہے۔ اِس کو نظر انداز کرتا ہوں۔ بالخصوص جبکہ میری اپنی رائے بھی اِس معاملے پر قائم نہیں ہوسکی۔ اور اس کی جگہ میں محض اِن آرا کو یہاں جمع کرونگا تاکہ ناظرین اِن کے مطالعہ سے اپنے لئے نتائج اخذ کریں۔ سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرلینا

چاہئے کہ مسلمان جو اپنے ہندو اہل وطن سے متمیز ہیں۔ اپنے مذہب اور اپنی تاریخ میں بارہا مشروطیت اور لبرل اصولوں پر کامیابی سے کاربند ہونے کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان کے ہندو ابدالآباد سے ایک مستبد طریق حکومت کے عادی رہے ہیں ہاں کہیں کہیں چھوٹے پیمانے پر مختصر جماعتی افراد نے ایک محدود وضع کے جمہوری نظام کی تکمیل کی ہے۔ مگر اس کا اثر ملک کے بیشتر حصے پر کبھی نہیں پڑا۔ خود ہندو مذہب اس استبداد کا نہایت ہی زبردست حامی ہے۔ اس کے اصول یہ ہیں۔ کہ ساری مخلوق مختلف طبقات میں تقسیم ہونی چاہیئے۔ اور ان میں سے ایک طبقہ ایسا اذل ترین قرار دیا گیا ہے۔ کہ اس کی اور بہائم کی حیثیت میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔ یہ قدرتی امر ہے۔ کہ ایسی روایات کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کو قیام نظام آزادی میں کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ اور مندرجہ ذیل مباحثات میں اس امر کا کافی لحاظ رکھنا چاہیئے +

لارڈ کرومر اس یورپی گروہ کا نمائندہ ہے۔ جس کا یہ ایمان ہے۔ کہ اہل مشرق نہ آج اور نہ آئندہ کبھی نظام مشروط کے اہل ہو سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ ہمیں زنہار اس غلطی میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ کہ صدیوں کی مستبدانہ اور شخصی حکومت کی روایات اک چشم زدن ہی میں مبدل بہ لبرل ازم ہو سکتی ہیں۔ اگر ایسا کوئی تغیر اس قسم کے مشرقیوں کے سیاسی دماغ میں ہو سکتا ہے۔ تو اس کو ظاہر ہونے کے لئے ابھی صدیاں درکار ہیں۔ ہمارا فرض اولیں یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے ممالک میں فوری تغیرات کی تکمیل اور قیام حکومت ذمہ وار سے اجتناب کریں کیونکہ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا۔ کہ کثیر مخلوق خدا کے معاملات کی باگ چند غیر ذمہ وار افراد کے ہاتھ میں آجائیگی۔ اور یہ بدترین قسم کا استبداد ہوگا۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم ایسے ممالک پر حکومت عیسائیانہ اخلاق کے اصولوں کے مطابق کریں۔ مجھے کامل یقین ہے۔ کہ آزادانہ طریق سے انتخاب شدہ مصری پارلیمنٹ غلامی کی تجدید کر دیگی۔ اور راجپوتانہ کے لوگ ایسی حالت میں ستی جیسی قبیح رسم کو از سر نو قائم کر دیں گے۔ ایک اچھے نظام حکومت کی خوبی کم از کم اتنی تو ہے۔ کہ اس کے اصول ممکن العمل ہیں۔ اور اگر مشرقی قومیں یورپی قوموں کے نظام حکومت کی اہل بننا چاہتی ہیں۔ تو انہیں سب سے پہلے ایسا دل و دماغ پیدا کرنا چاہیئے

جو ایسے طریق حکومت کی کامیابی کا ضامن ہو۔ اور آخر میں لارڈ کرومر نہایت ہی تنگدلی سے کہتا ہے۔ یہ کبھی ممکن نہ ہوگا۔ کہ ایک یورپی ریشمی تھیلہ ایشیائی سور کی کھال سے تیار ہو سکے۔

ترکی اور ایرانی انقلاب کے بعد ڈاکٹر ڈلن نے بھی ایسے ہی الفاظ میں مشرقی اُمیدوں کا ذکر کیا۔ وہ کہتا ہے۔ اب تک کوئی ایسا کاغذ جرم یا ایسا کوئی نظام تیار نہیں کیا جا سکا جس میں قومی خصائص کو مطلق کوئی دخل نہ ہو۔ ستھری رو پہلی فقرات اور چکنی چپڑی کہاوتیں افراد کو خواہ کیسی ہی بھلی کیوں نہ معلوم ہوں۔ مگر وہ واقعات کو واقعات ہونے سے باز نہیں رکھ سکتیں اور ایران کے متعلق تو میں یہ کہونگا۔ کہ وہ ذمہ دار گورنمنٹ کے قطعی ناقابل ہے۔ ایک اور موقعہ پر یہی آدمی کہتا ہے۔ فی الحقیقت ایران میں چند لوگوں میں تغیر ہوا ہے۔ اور ایرانی حکومت میں چند افراد کا تقرر اور تنزل ہوا ہے۔ مگر دراصل سلطنت اور قوم کا شیرازہ وہی ہے۔ جو پہلے تھا۔ اور در آنحالانکہ کسی قسم کی مالی امداد ایران کو نہیں دی جا سکتی۔ وہ کونسا اجنبی سرمایہ دار ہوگا۔ جو اپنا روپیہ ایسی غلامانہ حکومت کو دے۔ جو اپنی بادشاہی کے ہر روز میں کچھ شور کچھ واویلا کرواتے ہیں۔ اور سیاسی مطلع آسمان ہے جس پر جا بجا رخصت ہو جاتے ہیں۔

ایک اعلےٰ فرانسیسی اہلکار اہل الجزائر و مسلمانان افریقہ شمالی کے متعلق کہتا ہے۔ ہمیں چاہیئے۔ ہم اپنی رعایا پر حکومت کریں۔ اور ان کی شعبدہ بازی کا سختی سے مقابلہ کریں۔ یہ ہو اور آزادی پسند طبقے کا سر ڈنڈے سے توڑیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں چاہیئے۔ کہ ہم ان پر مثل پدر شفیق مہربانی کریں۔ اور ہمیشہ ان پر اپنی اخلاقی برتری کا ثبوت دیتے رہیں۔ اس کا ہمیشہ لحاظ رہے۔ کہ کسی قسم کے بے معنی انسانیت کے اُصولوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیں۔

یورپی کونسل افسروں کو یہ دیکھکر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ کہ جہاں کہیں محکوم قوم کو جلسہا ے واضع قوانین یا اُسی قسم کے آزادی کے انسٹی ٹیوشن عطا کئے گئے ہیں۔ تو انہوں نے ان کو ذریعہ طاقت بنا لیا ہے۔ اور ان کے دماغ آزادی کے خواب دیکھنے لگے۔ سنہ ۱۹۱۳ء معاملات مصر پر رائے زنی کرتا ہوا لارڈ کچنر کہتا ہے۔ ذمہ وار نیابت صرف اُسی وقت تک مفید سمجھی جا سکتی ہے۔ جس وقت تک ممبر اپنے مشاغل کو اپنی موجودہ حیثیت تک ہی محدود رکھے۔ اور اسے مزید اختیارات کا ذریعہ قرار نہ دے۔ اگر نہایت ہی ادنےٰ اور سادہ وضع کے نیابتی نظام

پر کامیابی سے عمل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تو زیادہ اہم معاملات کی تکمیل کے لئے اِس کے خواہشمند اُور بھی نااہل ثابت ہونگے۔ وہ کونسی حکومت ہوگی۔ جو چھوٹے چھوٹے معاملات میں نیابتی انجمن کی ناکامی کو دیکھتے ہوئے اسے مزید اختیارات کا مستحق قرار دے +

جذباتِ وطنیت و آزادی اکثر اوقات ملک کے اعلےٰ اُور تعلیم یافتہ طبقہ میں پیدا ہوتے ہَیں۔ اُور عوام اِس اعلےٰ طبقہ کے زیر اثر ہونے کے باوجود یورپی حکومت سے مانوس معلوم ہوتے ہَیں۔ ایک سربرآوردہ امریکن مشنری نے اِس معاملہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ہندوستان کے عوام آج کل کی حکومت سے ایسے مانوس ہَیں جیسے کہ وہ پہلے کسی حکومت سے مانوس نہ تھے۔ موجودہ ایجیٹیشن کا ذمہ وار متوسط اُور اعلےٰ طبقہ ہے اُور اگر عوام کو اپنے حال پر رہنے دیا جائے۔ تو ان سے بڑھ کر اطاعت شعار جماعت دنیا کے شاید ہی کسی اُور گوشے میں ملیگی۔ مگر تعلیم یافتہ گروہ کی اُمیدیں اُور تمنائیں بہت بڑھ گئی ہَیں۔ اُور اب وہ اپنی ادنےٰ اُور ذلیل حیثیت اُور کم پایہ اسامیوں سے مطمئن نہیں۔ اُن لوگوں کو اس پالیسی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ جس کے ماتحت اِن کو کہیں کہیں نیابتی حقوق دئے جا رہے ہَیں۔ اِن کا منتہا محض نیابتی حقوق نہیں۔ بلکہ اختیار تام ہے۔ برہمن طبقہ جو ملک کا پانچ فیصدی حصہ ہے۔ اپنے آپ کو مظہر الوہیت اُور غیر برہمنوں پر حکومت کرنا اپنا موروثی حق سمجھتا ہے۔ اِسی طرح مسودہ جو ہندوستان کی شہری اور متوسط حیثیت کی آبادی ہَیں۔ ادنےٰ ذات سے لین دین رکھنا تو درکنار اپنا ووٹ کُتّے کو تو شاید دے دیں۔ مگر اس ذات کو نہ دیں گے۔ یہ انگریزی حکومت کی برکت ہے۔ کہ آج جو حقوق اُور رعائتیں ادنےٰ ذاتوں کو حاصل ہَیں۔ وہی اعلےٰ کو بھی +

مگر ادنےٰ ذاتوں پر اعلےٰ ذاتوں کی بے جا تکبر و احتمال کا علم نہ صرف مغربی لوگوں کو ہے بلکہ اِن ادنےٰ ذاتوں کے بعض تعلیم یافتہ اُور باخبر افراد کو بھی ہے۔ یہ لوگ اعلےٰ ہندوستانی طبقہ کی ایجیٹیشن کی مخالفت اِس لئے کرتے ہَیں۔ کہ اِن کو جو حقوق آج حکومت انگریزی کے زیر سایہ مل رہے ہَیں۔ وہ آزاد قومی حکومت کے ہوتے ہوئے پامال ہو جائیں گے۔ اِن کا ایمان ہے کہ ہندوستان کو ابھی ذمہ وار حکومت کے لئے تیار ہونے میں بہت دن چاہئیں۔ اُور

انہوں نے اپنے آپ کو ایک انجمن میں جس کا نام نسودرا انجمن ہے۔ مربوط کر لیا ہے۔ اس انجمن کے مقاصد اعلےٰ ذاتوں کے دعاوی کا رد عمل اور حکومت انگریزی کی معاونت ہیں +

ڈاکٹر نائر نمائندہ انجمن نسودرا اپنے طبقہ کے نقطہ نگاہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ "اختیار جمہور" اک ایسا جملہ ہے۔ جو ہندوستان میں بار بار دہرایا تو جاتا ہے۔ مگر اس کے عمل کا ثبوت اب تک سویز کے اس پار دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایسے ملک میں جہاں ذات پات کے اختلافات کی سدا اب تک برقرار ہے۔ ادنےٰ ذاتوں کی تذلیل کا الزام کسی خاص ذات کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ ہر ایک ذات اس امر کی ذمہ وار ہے۔ برہمنوں کی دستبرد غیر برہمنوں پر ہوتی ہے۔ اور غیر برہمن ذاتیں ادنےٰ ذاتوں پر ہاتھ صاف کرتی رہتی ہیں ہمارا نصب العین "اختیار جمہور" بلا تفریق ہے۔ نہ کہ ایسا نظام جس میں معاملات کی سرکردگی چند منتخب صاحب اقتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور اگر آج ایسے منتخب لوگوں کے قبضہ میں حکومت آجائے۔ تو یہ یاد رہے۔ کہ ایسی حکومت دائمی ہوگی۔ بنا بریں بجائے اس کے کہ ایک لعنت سے چھوٹ کر دوسری میں گرفتار ہوں۔ ہم اس وقت کے منتظر رہیں گے۔ جب ذاتوں اور جماعتوں کے امتیازات کلیتاً نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اور ہم اپنے حقوق سے متمتع ہو سکیں۔ جیسے ہم زیر سیادت انگریزی متمتع ہو رہے ہیں۔ ہم صرف ایک اعلےٰ اخلاقی نصب العین ہی نہیں رکھتے بلکہ ہمارا مقصد حفظ ذات بھی ہے +

کئی ایک مسلمان ایسے بھی ہیں۔ جن کا یہ ایمان ہے۔ کہ فی زمانہ اہل ہند حکومت خود اختیاری کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر عنان حکومت کلیتاً ان کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ تو اس کا مہلک اثر سارے ملک پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایس۔ خدا بخش صاحب جو ایک ممتاز مسلمان اہل قلم ہیں۔ اپنے ہم مذہب الحکیمیوں کے خیالات کا رد ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے میں سیاسیات سے ہمیشہ الگ رہا ہوں۔ کیونکہ میرا یہ نصب العین ہے۔ کہ مسلمانوں کا تعلیمی اور معاشرتی حالت کی درستی مقدم فرض ہے۔ کیونکہ تغیر نظام حکومت جیسا اہم مسئلہ ایسا نہیں۔ کہ دو چار یورپ کے تعلیم یافتہ افراد کی کوششوں سے پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔ بلکہ یہ معاملہ سارے ملک کا ہے۔ اور جب تک ہر فرد قوم اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ مسئلہ

مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ یہ مسلمہ امر ہے۔ کہ تعلیم یافتہ گروہ ملک کا نہایت ہی قلیل حصہ ہے۔ اور پیشتر اس کے کہ نیابتی اور ذمہ وار حکومت جیسے نظام کو عملی صورت دی جا سکے۔ طبقہ عوام کی دماغی حالت سدھارنے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اس مقصد کی تکمیل کو برسوں چاہئیں۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا۔ ہماری تمنائیں باطل اور ہماری آرزوئیں اوہام ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ بھی ابھی تک سیاسی تجربات کے ابتدائی مراحل سے نکلنے نہیں پایا۔ اور یہ اب تک صرف پولیٹیکل طاقت اور اعلےٰ مناصب ملنے کی امیدوں کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ جب تک ہم ذاتی اغراض اور مقاصد کو قومی اور ملکی مصالحہ پر ترجیح دیتے رہیں گے۔ اُس وقت تک بالیقین سیاسی اخلاق عامہ کے معیار اونے اور ہماری کوششوں کے نتائج امید موہوم بنے رہیں گے۔

کثیر طبقہ آبادی کے ان خیالات کے اظہار نے جن کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ کئی ایک روشن خیال انگریز اہل الرائے جو ہندوستانی حکومت خود اختیاری کے امکان پر یقین رکھتے ہیں حالت تذبذب میں ڈال دیا ہے۔ ایسی جماعت کا ایک ممبر اڈون بیون کہتا ہے۔ جب ہندوستانی با اختیار حکومت کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ان کے نزدیک اس حکومت کا مفہوم آزادی اور اجنبی اقتدار سے رہائی کے ہوتے ہیں۔ انگریزی عمالان حکومت اس دعوے کا جواب مندرجہ ذیل الفاظ میں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ حکومت با اختیار تو تم کو ملیگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں ڈر ہے کہ تمہیں اصول اختیار جمہور بھی قبول کرنا ہوگا۔ ہم ہندوستانی اقتدار کو صرف اسوقت ہاتھ سے دیں گے۔ جس وقت اُس کو لینے والی ہندوستانی قوم ہو۔ نہ کہ چند صاحب حیثیت اشخاص۔ فی الحقیقت ہندوستانی وطنیت پرست گروہ اور ان کے انگریز حاکموں کے درمیان بنائے مخاصمت صرف یہی ہے۔ حکومت با اختیار سے ہندوستانی طبقہ کی مراد حکومت آزاد ہے۔ اور حکومت آزاد تو ایک گھڑی میں قائم ہو سکتی ہے۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ اگر آج اجنبی حکومت کا سایہ ہندوستان سے اُٹھ جائے تو کسی قدر کشمکش کے بعد کسی نہ کسی طرح کی ایک حکومت یا کئی ایک مقامی حکومتیں اس کی جگہ لے لیں گی۔ مگر وہ حکومتیں جمہوری اختیار کے اصولوں پر قائم نہ ہونگی۔ بلکہ چند ایک قومی اور منصوبہ باز اشخاص کی کارروائیوں کا نتیجہ۔

مندرجہ بالا بیانات اِن مغربی اور مشرقی اہل الرائے لوگوں کے خیالات کی تصویر ہے۔ جن کا ایمان ہے۔ کہ اہل مشرق حال میں کیا مستقبل قریب میں بھی حکومت خود اختیاری کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اب ہم اِن لوگوں کے خیالات کا مطالعہ کریں گے۔ جن کی اُمیدیں اِس طبقہ سے زیادہ خوش آئندہ ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ اسلامی لبرل ازم ہر طرح کے نیا بتی نظام حکومت کی بنیاد محکم قرار دی جا سکتی ہے۔ دمبیری کہتا ہے۔ مذہب اسلام اب بھی ایک شدت سے جمہوریت پسند مذہب ہے۔ جس کے دو رُکن حریت اور مساوات ہیں۔ اگر کوئی مشروطہ طرز کی حکومت حقیقی معنوں میں دنیا میں ہو چکی تھی۔ تو وہ حکومت خلفائے راشدین کی تھی۔ مشرقی قریبہ کے حالات کا ایک روشن خیال مطالعہ کرنے والا کہتا ہے۔ ملک عرب کے قبائل ہی صحیح طور پر حکومت جمہوریت کے مماثل ہیں۔ اور اِن قبائل کا ہر ایک فرد ہر وقت مسلح رہتا ہے۔ تاکہ اِس حکومت کی جمہوریت کو ہر تن واحد کی مطلق العنانی سے بچائے۔ اور ایسے لوگوں کا انجام جنہوں نے اِس اُصول سے پہلوتہی کی ہے۔ اسلامی عربی جمہوریت کے دعوے کی دلیل ہے۔ انقلاب نوجوانانِ ترک پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر لبانو کہتا ہے۔ ترک قوم کی تیاریِ انقلاب ایسی ادھوری نہ تھی۔ جیسے کہ بعض لوگوں خیال کرتے ہیں۔ بلکہ ایک تو اسلامی جمہوریت اِن کے ارادوں کی موید تھی۔ اور اس کے علاوہ اِس باب انہوں نے میں خاصی جدوجہد اور آرزو ترقی کا ثبوت دیا تھا۔ بنا بریں ترکی کی روحانی اور دنیاوی دو نو قسم کی روایات سے خواہش قیام پارلیمنٹ کی تصدیق ہوتی تھی۔ رسول اکرم نے خود ہمیشہ اہل عرب کے مشورہ سے ہر بات کی۔ اور علمائے اسلام ہر ایک بات میں اب بھی مشورہ اور باہمی تبادلہ آرا ضروری سمجھتے ہیں۔ ساری شریعت محمدیہ کی سپرٹ جبر اور مطلق العنانی کے قطعی خلاف ہے۔ اِن روایات کے ہوتے ہوئے جن کا ہر ایک فرد اسلام پر گہرا اثر ہے۔ نظام مشروطہ کا مسئلہ نہایت ہی عام فہم ہو سکتا ہے۔ اور ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ سلاطین سابق میں سے ہر ایک دیوان یا مجلس شورائے کا تقرر کرتے تھے۔ جن کے اجلاس مقررہ اوقات پر ہوتے تھے۔ اور زمانہ حال تک ادارہ دولت اور مجلس وزرا جیسے انسٹی ٹیوشن بھی قائم تھے۔ علاوہ ازیں ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء کی پارلیمنٹوں کی ناقابل فراموش قانونی نظیر سامنے موجود تھی۔ اِن تمام واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر لبانو کہتا ہے۔ کہ ترکی پارلیمنٹ قطعی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ

دیوانہا نے و مجلسہا سابقہ کی بنیادوں پر اُسی قسم کے ایک انسٹی ٹیوشن کا نیا ایوان +

مشہور امریکن ماہر مالیات مسٹر مورگن شوسٹر جن کو ایران کی انقلابی حکومت نے سلطنت کے ادارہ مالیہ کی تنظیم کے لئے مدعو کیا تھا۔ اور جو بعد میں انگریزی اور روسی مخالفت کی بنا پر اپنے عہدے سے برطرف کئے گئے۔ اہل ایران کی اہلیت برائے نظام مشروطہ کی تصدیق اور تعریف کرتے ہیں +

وہ کہتے ہیں۔ تاریخ دنیا میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ کوئی قوم ۔ صدیوں کی بدعنوانیوں اور استبداد کی بیخ کنی اور اس کے کھنڈرات پر اپنے دور جدید کو قائم کرکے دور اول ہی میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئی ہو اور وضع قوانین کے پیچیدہ اصولوں اور نظام سیاست کی مشکل گتھیوں کو سلجھا سکی ہو۔ کسی فرد یا قوم سے ایسی اُمید رکھنی فعل عبث ہے مجلس اول کے اراکین کو روز انتخاب سے ہی اعدائے وجود مجلس سے دوچار ہونا پڑا۔ اتنی مہلت تو درکنار کہ وہ وضع قوانین کا کوئی بھی کام سرانجام دے سکتے۔ ان کو اس پر شبہ تھا۔ کہ آیا ان کے فیصلہ جات پر کوئی عمل بھی کریگا یا نہیں +

مجلس ثانی کے اراکین جن میں سے ہر ایک کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ امریکن کانگرس اور انگریزی پارلیمنٹ کے اعلے معیار کے رو سے واقعی کسی بڑی کارگذاری کے اہل نہ تھے۔ اور یہ امر موجب تعجب نہیں۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ایک طرف تو انگریزی پارلیمنٹ کا مقابلہ جس کی اساس صدیوں کے تجربے سے پختہ ہو چکی ہو۔ ایک ایسی انجمن سے کیا جائے جس کی زندگی کا ایک تو روز اول ہی ہو۔ اور دوسرے ایسے ملک کے معاملات کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دی گئی ہو۔ جس کے افراد اور عمالان حکومت کا مستعدی کار اور حسن انتظام سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا ہو۔ مگر درحقیقت یہ امور فروعات ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے۔ کہ مجلس طہران اہل ایران کی سچی اور قابل ستائش اُمیدوں کا مظہر تھی۔ اس کے ممبروں کی دماغی اور تعلیمی قابلیت متوسط مدارج سے کہیں بڑھ کر تھی۔ دوران کاروبار انہوں نے بارہا اعلے درجے کے ایثار۔ فراست اور اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا۔ اور ہر قسم کی تجویز کا جس سے قومی فلاح متصور ہو۔ وہ بخوشی خیر مقدم کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں۔ انہیں مالیات کا چنداں تجربہ نہ تھا۔ مگر وہ ہر طرح کسی اجنبی مصلاح کار کی

ہدایات پر کاربند ہونے اور اُس پر کامل اعتماد کرنے کے لئے تیار تھے۔ بشرطیکہ اس کے مشورے خارجی اغراض اجنبی سازشوں اور اہل ملک کی منصوبہ بازیوں سے بے تعلق ہوں +

میں تو یہ کہونگا۔ کہ کوئی ایسی پارلیمنٹ حسن عمل سے عاری قرار نہیں دی جاسکتی۔ جبکہ ساری قوم اس کی پشت پناہ ہو۔ اِس کے اراکین اپنی کمیوں سے آگاہ ہوں۔ اور جو قومی مصالحہ کی خاطر ہر طرح کے ایثار پر کمربستہ ہوں +

اہل ایران کے متعلق میں کوئی عام رائے قائم نہیں کرسکتا۔ آبادی کا کثیر حصہ دہقان ہیں یا اہل قبائل اور سب کے سب جاہل مطلق۔ مگر دوسری طرف ہزاروں ایرانی تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ جن میں سے کیئوں نے تحصیل علم سے فارغ ہوکر بلاد اجنبیہ کا سفر بھی کیا ہے۔ وہ اور اِن کے علاوہ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ تعلیم کا خواہشمند اور مغربی تمدن کے تاثرات قبول کرنے کا متمنی ہے ہزار مشکلات کے باوجود انہوں نے حکومت استبداد کی بیخ کنی کی اور اسپرنیابتی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اور ملک کے اعلےٰ ترین عہدوں کے لئے استحقاق کا معیار جوہر تعلیم قرار دیا۔ من حیث القوم انہوں نے ترویج و تشویق تعلیم کا نہایت ہی تحیر انگیز ثبوت دیا۔ آزاد خیال اخبارات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی جس میں اندرونی و خارجی دشمنانِ ملت کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ اور ایرانیوں بلا استثنا نہایت ہی مترقی اقوام دنیا کی کاروباری۔ اخلاقی اور سیاسی معیارات کو اختیار کرنے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ اِن کے دلوں میں وہی ولولے اُٹھ رہے تھے۔ جو ہندوستانی جذبات کے محرک تھے۔ اور جن سے نوجوانان ترک حرکت میں آرہے تھے۔ اور جو قیام جمہوریہ چین کا موجب ہوئے +

اختتام کلام پر مسٹر شوستر فرماتے ہیں۔ کپلنگ نے کہا ہے۔ تم اہل مشرق کو تیز گام نہیں کرسکتے۔ اِس جملے میں ایک اخلاقی سبق اور ایک تنبیہ مضمر ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ مغربی اصول اہل مشرق کی رفتار ترقی قطعی طور سے تیز کرسکتے ہیں۔ بشرطیکہ اِن اہل مشرق کو یقین ہو۔ کہ جس امر کے لئے انہیں کہا جاتا ہے۔ وہ اِن کی اپنی بھلائی کا موجب ہے۔ حقیقت امر یہ ہے۔ کہ مشرقی اخلاقی جذبات اور حب وطن و قوم ایسے ہی موثر اور قوی ہیں۔ جیسے کہ مغرب میں۔ گو وہ کسی قدر سطح بالا کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ اور قدرتی طور پر کوئی مشرقی کسی ایسے معاملہ میں

اظہار مستعدی و جانفشانی نہیں کرنا چاہتا۔ جس میں وہ جانتا ہے۔ کہ اس کی کوشش کا ثمر ایک مغربی کے قبضے میں جائیگا +

کئی ایک مغربی اہل الرائے حضرات کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ جب تک مشرق پر مغربی حکومت کا دور دورہ ہے۔ اہل مشرق کبھی بھی حکومت خود اختیاری سے کما حقہ معرفت حاصل نہیں کر سکتے اور ان کی پولیٹیکل اہلیت کے قیام کا ذریعہ صرف ان کی اپنی کوشش ہو سکتی ہے۔ اگر انہیں اس کا موقع دیا جائے۔ اس نقطہ خیال کو مسٹر لائنل کرٹس نے خوب نبا ہا ہے۔ وہ کہتا ہے تعلیم اور اسی قسم کے اور مفید ذرائع ہی صرف ہندوستانیوں کو خود اختیاری ذمہ وار حکومت کے لئے تیار نہیں کر سکتے۔ برخلاف یہ اس کے اگر ان کے ساتھ ساتھ کسی قدر اختیار اور اقتدار بھی نہ دیا گیا۔ تو خوف ہے۔ یہ برکات موجب شر نہ ہو جائیں۔ اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم کار آموزی اور تجربہ ہی وہ اہلیت اور قابلیت پیدا کر سکتے ہیں۔ جو محض تعلیم خواہ وہ کسی درجہ تک ہو۔ پیدا نہیں کر سکتی +

میں اسی امر پر پورا زور دونگا۔ کہ انتخاب کنندگان کو کچھ نہ کچھ اختیار بھی دینا چاہیئے۔ اور عمالان حکومت کو انتخاب کنندگان کے نمائندوں کو ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانی چاہیئے۔ ان کا رویہ رضاعی ماؤں کا سا ہونا چاہیئے۔ نہ کہ سوتیلی ماؤں کا سا۔ اور اگر یہ امید کی جائے۔ کہ وہ ان کے نمائندے حکومت خود اختیاری کا عمل کامیابی کے ساتھ سیکھ سکیں تو ان کو بطور خود کاروائی کرنے کا موقعہ دینا چاہیئے۔ جس میں حکومت بالادست کا مطلق دخل نہ ہو۔ اسی طرح انتخاب کنندگان بھی اپنے حق ووٹ کا صحیح استعمال نہ سیکھ سکیں گے۔ تا وقتیکہ ان کو ایسا کرنے میں کامل آزادی نہ ہے۔ اس طریق عمل مشکلات کا سامنا تو ہو گا۔ اور وہ مشکلات بھی کیسی جو خود پیدا کردہ ہوں۔ مگر مصیبت یہ ہے۔ کہ ان مشکلات پر قابو پانے کی کوشش ہی اس مقصد کو سرانجام دے سکتی ہے۔ اور اس سے اپنی آپ مدد کرنے اور حسن کارگذاری دکھا ووٹ دینے کی اُمید رکھنے کا مادہ پیدا ہو گا +

مجھے اس بات کا فخر ہے۔ کہ انگلستان نے ہندوستان پر بڑے بڑے احسان کئے ہیں اور اس کی حکومت بے شمار برکات کا موجب ہوئی ہے۔ مگر اس حکومت کے طریقے اور

اُصول گھِس چکے ہیں۔ اور اگر اِن کو زیادہ زمانے تک کام میں لایا گیا۔ تو وہ نہ صرف ہندوستانی اخلاق کو نقصان پہنچائیں گے۔ بلکہ خود حکمران طاقت کے لئے موجب خطرہ ثابت ہوں گے جن فی ولایت جواب تک انگریزوں کو حاصل تھا۔ اب بتدریج ایسے ہندوستانیوں کے کندھوں پر ڈالنا چاہیئے۔ جو اِس بارِگراں کے متحمل اور اہل ہو سکیں۔ اِن کی تعداد اور طاقت میں بھی اضافہ ہونا چاہیئے مگر تاوقتیکہ ذمہ واری کا بار اِن پر نہ ڈالا جائیگا۔ اِن مقاصد کی تکمیل کبھی نہ ہو سکیگی۔ اور اِن معاملات کا سبق کسی سکول یا تعلیمی کتابوں کے ذریعہ سے نہیں دیا جا سکتا۔ گو کتابی تعلیم اِس کے لئے لابدی ہے ٭

جو نصب العین وزیر ہند کے گذشتہ اور حال کے اعلان نے قائم کیا ہے۔ اِس کا حصول ایک کارِ اہم ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہمارے اختیار و اقتدار حکومت ہند کے آخری مراحل اب آن پہنچے ہیں۔ اور خود ہی ہماری اپنی روایات اِس امر کی تصدیق کرتی ہیں۔ اِس کارنامے کے مہتم بالشان ہونے کی ایک یہی کیا کم وجہ ہے۔ کہ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا اختیار دوسروں کے سپرد کر رہے ہیں ٭

مسٹر کرٹس کے آخری الفاظ سے اِس طرزِ عمل کی تصدیق ہوتی ہے۔ جو آج نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دیگر بلادِ مشرقی میں رونما ہے۔ جنگِ عظیم نے ایک طرف تو مشرقی قوموں کے احساسات اور جذبات کو تقویت دے دی ہے۔ اور دوسری طرف خود مغربی قومیں جنگ سے کمزور ہو گئی ہیں۔ اور اِن کا اخلاقی رعب اور اثر مشرقی اقوام کے دلوں سے مفقود ہو چکا ہے۔ اور اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ آج مغرب کی قوت بتدریج مگر یقینی طور پر مشرق پر سے زائل ہو رہی ہے۔ یہ دوسری بحث ہے۔ کہ آیا اِس واقعہ کا نتیجہ نیک ہو گا یا بد۔ مگر اِس کے اٹل ہونے میں کسی کو شبہ نہیں اور یہ کہنا چنداں مشکل نہیں۔ کہ آج سے ایک پشت یا دس سال بعد ہی سارے کا سارا مشرق قریبہ کامل آزادی یا کم از کم حکومت خود اختیاری کا مالک ہو گا۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ آیا یہ آزاد شدہ قومیں خوشحال جمہوریت پسند اور منظم حکومتیں قائم کریں گی۔ یا اپنے عہد سابقہ کی سیاسی سراسیمگی اور استبداد میں پھر سے جا گریں گی۔ ہم نے کم از کم ہر دو پہلو کے اسباب اور حالات کا مطالعہ کر لیا ہے۔ اور فی الحال یہی بہتر ہو گا۔ کہ

اِس امکان مستقبل کا خاتمہ کسی قسم کی قطعی رائے یا تیقن احتمال پر نہ کریں - بلکہ نشان استفہام پر۔ کیونکہ آئندہ کا حال صرف خدا کو معلوم ہے +

باب پنجم

جذبۂ وطینت

زمانہ جدید کی سب سے قوی اور معنی خیز حقیقت جذبۂ وطینت ہے۔ جس وقت یہ جذبہ یورپ میں رونما ہوا۔ تو اُس نے سارے براعظم کے حالات میں تغیر پیدا کر دیا۔ اِن تغیرات کا زمانہ انیسویں صدی ہے۔ اور اِسی لئے اِس کو صدیٔ وطینت کہا گیا ہے۔ مگر یہ کچھ یورپ ہی کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اِس کا اثر دنیا کے ہر گوشے میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ اور میرا یقین ہے۔ آئندہ بھی ظاہر ہوا رہیگا +

اِس قدر اہم اور نتیجہ خیز حقیقت کو دیکھکر معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ وطینت کیا شئے ہے اور عجیب امر یہ ہے۔ کہ اس کی تعریف اب تک نہیں ہو سکی۔ کئی ایک دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ جن کی بنا پر وطینت کو تمدنی۔ نسلی۔ سیاسی۔ اقتصادی مذہبی جغرافی حالات کی صورتِ اظہار قرار دیا گیا ہے۔ مگر میں یہ کہونگا۔ کہ یہی اسباب بناءِ قومیت و وطینت نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اِن کے علاوہ اور بھی کئی ایک ہیں۔ اور اصولِ وطینت اِن عناصر سے ممزوج و مترتب ہے۔ جو مختلف انسانوں کو کسی خاص نقطہ کی طرف لاتے ہیں۔ مگر وطینت کی صحیح تعریف کا پیدا نہ ہونا باعث مایوسی نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وطینت کچھ معمہ یا رازِ سربستہ نہیں۔ بلکہ روزمرہ کی حقیقت جس سے ہر ایک شخص واقف ہے۔ اب وطینت کیا ہے۔ وطینت صرف اِس خیال۔ اِس ایمان کا نام ہے۔ جو کئی افراد کا مشترکہ خیال ہو۔ کہ وہ ایک گروہ ایک قومیت ایک وطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ بس اِسی کا نام حسِ وطینت ہے۔ اب اِس قسم کا واحد خیال رکھنے والے افراد اگر اپنے آپ کو ایک ایسے نظام میں مربوط کر لیں۔ جس سے اِن کی مدنی اِن کی معاشرتی اور روحانی و دنیوی

فلاح پیدا ہو۔ تو ہم اِس گروہ کے اِن نئے لوازمات کے مجموعے کو ایک سلطنت یا حکومت سے تعبیر کریں گے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ وجود سلطنت یا نظامِ حکومت قیام جذبۂ وطنیت کے لئے لازمی نہیں۔ اَور قومی افراد کا شیرازہ اِسی قسم کے جماعتی نظام کے بغیر بھی قائم رہ سکتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری نہیں۔ کہ کسی سلطنت یا حکومت کے افراد و عناصر ایک ہی قوم کے ممبر ہوں تو گویا قومیت کا مدار سلطنت پر نہیں اَور نہ کسی سلطنت کا مدار جذبات وطنیت پر ہے۔ خود آسٹریا کی سلطنت کے انجام کو دیکھ لیجئے جو مختلف النوع اقوام سے مترتب تھی اَور جنگ عظیم کے حادثے نے اسے پارہ پارہ کر دیا۔ اَور یہی حال اَور اِسی قسم کی سلطنتوں کا ہو سکتا ہے +

جنگ عظیم نے وطنیت کے مختلف مفہوم کی حقیقت اچھی طرح کھول دی۔ سوئٹزرلینڈ ہی کو لیجئے جہاں کی مختصر آبادی کی نہ زبان ایک ہے۔ نہ مذہب اَور نہ تمدن مگر بایں ہمہ اہل سوئٹزرلینڈ میں جذبہ وطنیت کسی دوسری قوم سے کم نہیں۔ اَور جس پر دوران جنگ کے واقعات کا مطلق اثر نہیں ہوا +

اِن عام مسائل سے لوگ کم و بیش واقف بھی ہیں۔ میں اِس جگہ اب صرف قومیت اَور نسل کے موضوع پر بحث کرونگا۔ بدقسمتی سے اِن دونو الفاظ کا استعمال انا پشنا پ طریق سے کیا جاتا ہے۔ اَور اکثر لوگ قومیت کو نسلیت اَور نسلیت کو قومیت سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ ہر دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ قومیت عقلانی جذبہ کا نام ہے۔ اَور نسلی امتیاز مادی حقیقت ہے۔ جس کا اندازہ سائنٹیفک معیارات سے لگایا جاتا ہے۔ مثلاً کھوپڑی کی ساخت۔ بالوں کی بناوٹ۔ چہرے اَور آنکھوں کا رنگ تو گویا دوسرے الفاظ میں نسل کی حقیقت انسانوں کا اپنا وجود ہے اَور وطنیت کا جذبہ اِن کا تخیلات کا نتیجہ ہوتا ہے +

اب ایک معمہ ملاحظہ ہو۔ نسلی امتیاز اَور قومیت ہر دو میں سے نسلی خصوصیت فی الحقیقت زیادہ پائیدار ہے۔ ہر ایک انسان کے قوا اَور خصائص زیادہ تر جدی ہوتے ہیں۔ اَور اِس کے گرد و پیش کے حالات کیسے ہی امید افزا کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی وہ اِس منتہائے عمل سے نہیں بڑھ سکتا جس کی اِس کے جدی خصائص اجازت نہیں دیتے۔ باوجود اِس کے لوگ اپنے نسلی امتیازات کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر جذبہ قومیت اِن کے ہیجان کا موجب ہوتا ہے

اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے۔ کہ صرف پچاس سال سے نسلی امتیاز کا راز انسانی دماغ پر اثر کار ہوا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں۔ کہ اس حقیقت کی سائنٹفک تصدیق کے بعد عام لوگ بھی اسے فوراً قبول کریں۔ گو جب تک وہ قبول نہ کریں گے۔ تب تک اس سے کسی قسم کا عملی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا دوسری طرف جذبہ قومیت کا اثر ان تینوں میں اتنے زمانے سے گھر کئے ہوئے ہے۔ کہ اس سے عجیب وغریب نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ قصہ مختصر زمانہ حال کی سیاسی زندگی کا بہترین محرک جذبۂ قومیت و وطنیت ہے۔ اور لوگ اس امر کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ کہ آیا وہ ایک ہی نسل سے بھی ہیں یا نہیں +

اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت دوران جنگ عظیم پیدا ہوا یہ جنگ عام طور پر نسلی اختلافات کی بنا پر لڑی گئی تھی۔ اور یہی بات زیادہ تر اس کی خونخواری اور طوالت زمانہ کا موجب ہوئی۔ مگر حقیقت امر یہ ہے۔ کہ تمام متخاصمین زیادہ تر ایک ہی نسل کے تھے۔ مفسر ان امتیازات نسلی نے یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے۔ کہ ایک خفیف سے ایشیائی عنصر کے ماسوا یورپ میں تمامتر تین مندرجہ ذیل نسلی گروہ آباد ہیں۔ (۱) ایک تو وہ جس کا کاسہ سر لمبا اور اونچا ہے۔ اور جس کا رنگ بھورا سفید ہے مغربی اصطلاح میں اسے نورڈک کہا گیا ہے۔ (۲) دوسرا گروہ وہ ہے جس کا کاسہ مدور اور رنگ معمولی سفید ہے۔ اس کا نام "الپائین" فرقہ ہے۔ (۳) اور تیسرا گروہ جو "بحیرہ رومی" کہلاتا ہے۔ دراز سر اور صاف گندمی رنگ رکھتا ہے۔ مگر یہ تینوں گروہ آپس میں اس قدر مربوط ہو چکے ہیں۔ کہ یورپ کی تمام قومیں ان میں سے کسی دو سے مخلوط ہیں اور اکثر تینوں سے۔ تو گویا جنگ یورپ مختلف قوموں کی جنگ نہ تھی۔ بلکہ ایک ہی گھرانے کے مختلف اعضا کی +

اور اس حقیقت کا علم یورپ کے اکثر اہل الرائے کو تھا۔ مگر پھر بھی جنگ کی شدت پر اس کا کچھ اثر نہ پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مغربی قومیں اپنے آپ کو بالکل مختلف نسلوں سے متعلق سمجھتی ہیں۔ اور انہوں نے ان نسلی گروہوں کے نام "ٹیوٹانی"۔ "لاطینی"۔ "سلافی" اور "اینگلوسکسن" وغیرہ رکھ دیئے ہیں۔ اور اس امر کا لحاظ نہیں کیا۔ کہ یہ نام دراصل تاریخی امتیازات کو جن کا مدار زیادہ تر زبان اور معاشرت پر ہے۔ ظاہر کرتے ہیں۔ مغربی لوگ مندرجہ بالا تعبیری کو اب تک

صرف ایک قسم کی عقلانی عجوبہ سمجھتے رہے ہیں۔ اور جب تک اِن کا خیال یہی رہیگا۔ وہ اپنی نسلی توحید کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اور لاطینی۔ ٹیوطانی۔ سلافی و اینگلوسکسن تقسیم نسل کو ہی اپنی فرقہ بندی کی بنا سمجھتے رہیں گے۔ اِن کا حقیقی نسلی جذبہ تو حالت جمود میں رہیگا۔ اور اگر کوئی چیز اِن کے قلوب کو متحرک کر سکیگی۔ تو وہ اِن کی خیالی فرقہ بندی کا اصول جس پر وہ اب تک کاربند رہے ہیں۔ اِس بحث کا لب لباب یہ ہے۔ کہ عام لوگ اِن باتوں کی تو پرواہ بھی نہ کریں گے۔ جو معنوی طور پر اِن کے نسلی امتیازات اور تقسیم کی بنا ہے۔ مگر محض خیالی اصول کی خاطر اپنی دولت آخری پائی دینے اور اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

آج یورپ کا یہ غلط نصب العین جس کی تفصیل اوپر کی گئی ہے۔ موجب حیرت ہو۔ مگر پھر بھی یہ کچھ بہت عجیب بات نہیں۔ اور یہ اِس لئے کہ جذبہ وطنیت یورپ کی رگ رگ میں اِس قدر حلول کر چکا ہے۔ کہ اِس کے سامنے کسی اور احساس کو ٹھہرنے کی تاب نہیں۔ اور اِس نے نسلی یکجہتی کے خیال کو جس کا احساس بعض لوگوں کو ہو چلا تھا۔ اپنا رنگ جمانے نہیں دیا۔ بلکہ اِس کو مصالحہ کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ آج تک وطنیت کا جذبہ ہی جس کے ارکان معاشرت۔ زبان اور تاریخ ماضیہ کے واقعات ہیں۔ لوگوں کو کسی مہم کی تکمیل کے لئے ابھار سکتا تھا۔ ایک معنی کر کے یہ خیال ایک محدود وضع کی یورپی تحریک کا نتیجہ تھا جو خود اِس سے محدود تر قرون اوسطے کے یورپی مقامی۔ قبائلی اور لسانی خصوصیات پر قائم تھا لیکن انیسویں صدی کے وسط تک اِس خیال کے رکھنے والوں میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوا۔ وہ اِس کی جگہ وسیع اور غیر محدود وطنیت کی حقیقت کو قبول کرنے لگے۔ اور اب ساری دنیا اُن کی منتہا نظر ہو گئی۔ اور وہ قرون اوسطی کی وطنیت کے خیال سے کہیں آگے ترقی کر گئے۔ اب قوم کے مفہوم میں وہ تمام عناصر اور گروہ شامل کئے جانے لگے۔ جو نسلی امتیازات میں تو مختلف مگر معاشرتی اور تاریخی بنا پر مخلوط ہو کر ایک فرقہ یا ایک قوم بن چکے تھے۔ اِس غیر محدود مجموعہ فرقہ ہائے مختلفہ کے لئے جیسے قوم کے پرانے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اب ایک نئے نظریہ کی ضرورت پڑی اور RACE یعنی نسل کا ہمہ گیر لفظ عاید کیا گیا۔ بنا بریں آج کل اہل

غلط لفظ کا اطلاق اِن تمام مختلف النسل مجموعہ ہائے افراد پر کیا جاتا ہے۔ جو یورپ اور امریکہ کے مختلف ممالک میں آباد ہیں۔ اور قوم کی اس غلط تعریف کی بنا پر پان انگل ازم۔ پان جرمنی ازم ایسے غلط الفاظ تراش لئے گئے ہیں۔ حالانکہ نسل دونو فرقوں کی ایک ہی ہے۔ باوجود اس کے شاید ہی کوئی مغربی ایسا ہو۔ جو نسل اور قوم دونوں کو ایک ہی چیز نہ سمجھے ہوئے ہو۔ ایسے حالات پہ امید رکھنی کہ وطنیت اور قومیت کے موجودہ مفہوم وہ نہ رہیں۔ جو اب ہیں۔ کبھی قدر بے معنی اور فضول حاصل ہوگا۔

وطنیت اور قومیت کا یہ جذبہ جس کا نام اب نسل قرار دیا گیا ہے۔ پہلے پہل تو صرف مغربی تمدن کے اولیں مرکزوں میں ظاہر ہوا اور یہاں سے بڑھ کر وہ ایسے مقامات میں پھیل گیا۔ کہ جہاں اس کے پہنچنے کا وہم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ جزیرہ نما بلقان میں اس نئی پان قومیت کے تو نہایت مہلک اثرات پیدا ہوئے۔ یہاں "پان سلاف ازم" اور "پان سرب ازم" جیسے بے معنی نعرۂ قومیت نے اِن ممالک کو بھوتوں کی رقص گاہ بنا دیا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک تو یہ جذبہ ایشیائی قوموں میں بھی سرایت کر چکا تھا۔ تحریک نوجوانانِ ترک۔ نوجوان مصر و تحریکات الجزائر ہندوستان نے ثابت کر دیا ہے کہ وطنیت آہستہ آہستہ تمام دنیا پر تسلط کیا چاہتی ہے۔ اور یورپی "پان قومیت" کی نقالی سے فضائے مشرق بھی "پان توران" "پان عرب" حتیٰ کہ "پان مسلم وطنیت" کے نعرہ ہائے بیداری سے گونجنے لگی۔

فصل اول

اب ہم جذبۂ وطنیت کے مشرقی مظاہرات کا مطالعہ کریں گے۔ اور پھر دنیائے اسلام کے جذبۂ قومیت کی حقیقت پر بحث کریں گے۔ ہندوستان کی وطنیت کی تجدید و ترقی بالکل مختلف طریق سے ہوئی ہے۔ اور اسی لئے اس پر علیحدہ باب میں بحث ہوگی۔

انیسویں صدی کے مغربی تاثرات کی اشاعت سے پہلے دنیائے اسلام قومیت متحدہ کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا تھی۔ ہاں ایسی مقامی روایات ضرور موجود تھیں جیسے آئین

صرف ایک قسم کی عقلانی عجوبہ سمجھتے رہے ہیں۔ اور جب تک اِن کا خیال یہی رہیگا۔ وہ اپنی نسلی وحدت کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اور لاطینی۔ یونانی۔ سلافی و اینگلوسکسن تقسیم نسل کو ہی اپنی فرقہ بندی کی بنا سمجھتے رہیں گے۔ اِن کا حقیقی نسلی جذبہ تو حالت جمود میں رہیگا۔ اور اگر کوئی چیز اِن کے قلوب کو متحرک کر سکیگی۔ تو وہ اِن کی خیالی فرقہ بندی کا اصول جس پر وہ اب تک کاربند رہے ہیں۔ اِس بحث کا لب لباب یہ ہے۔ کہ عام لوگ اِن باتوں کی تو پرواہ بھی نہ کریں گے۔ جو معنوی طور پر اِن کے نسلی امتیازات اور تقسیم کی بنا ہے۔ مگر محض خیالی اصول کی خاطر اپنی دولت آخری پائی دینے اور اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

آج یورپ کا یہ غلط نصب العین جس کی تفصیل اوپر کی گئی ہے۔ موجب حیرت ہو۔ مگر پھر بھی یہ کچھ بہت عجیب بات نہیں۔ اور یہ اِس لئے کہ جذبہ وطنیت یورپ کی رگ رگ میں اِس قدر حلول کر چکا ہے۔ کہ اِس کے سامنے کسی اور احساس کو ٹھہرنے کی تاب نہیں۔ اور اِس نے نسلی یکجہتی کے خیال کو جس کا احساس بعض لوگوں کو ہو چلا تھا۔ اپنا رنگ جمانے نہیں دیا۔ بلکہ اِس کو مصالحہ کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ آج تک وطنیت کا جذبہ ہی جس کے ارکان معاشرت۔ زبان اور تاریخ ماضیہ کے واقعات ہیں۔ لوگوں کو کسی مہم کی تکمیل کے لئے ابھار سکتا تھا۔ ایک معنی کر کے یہ خیال ایک محدود وضع کی یورپی تحریک کا نتیجہ تھا جو خود اِس سے محدود تر قرون اوسطے کے یورپی مقامی۔ قبائلی اور لسانی خصوصیات پر قائم تھا لیکن انیسویں صدی کے وسط تک اِس خیال کے رکھنے والوں میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوا۔ وہ اِس کی جگہ وسیع اور غیر محدود وطنیت کی حقیقت کو قبول کرنے لگے۔ اور اب ساری دنیا اُن کی منتہا نظر ہو گئی۔ اور وہ قرون اوسطی کی وطنیت کے خیال سے کہیں آگے ترقی کر گئے۔ اب قوم کے مفہوم میں وہ تمام عناصر اور گروہ شامل کئے جانے لگے۔ جو نسلی امتیازات میں تو مختلف مگر معاشرتی اور تاریخی بنا پر مخلوط ہو کر ایک فرقہ یا ایک قوم بن چکے تھے۔ اِس غیر محدود مجموعہ فرقہ ہائے مختلفہ کے لئے جیسے قوم کے پرانے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اب ایک نئے نظریہ کی ضرورت پڑی اور RACE یعنی نسل کا ہمہ گیر نقطہ عاید کیا گیا۔ بنا بریں آج کل اہل

غلط لفظ کا اطلاق اِن تمام مختلف النسل مجموعہ ہائے افراد پر کیا جاتا ہے۔ جو یورپ اور امریکہ کے مختلف ممالک میں آباد ہیں۔ اور قوم کی اِس غلط تعریف کی بنا پر پان انگلوازم۔ پان جرمنی ازم ایسے غلط الفاظ تراش لئے گئے ہیں۔ حالانکہ نسل دونو فرقوں کی ایک ہی ہے۔ باوجود اس کے شاید ہی کوئی مغربی ایسا ہو۔ جو نسل اور قوم دونوں کو ایک ہی چیز نہ سمجھے ہوئے ہو۔ ایسے حالات پہ امید رکھنی کہ وطنیت اور قومیت کے موجودہ مفہوم وہ نہ رہیں۔ جو اب ہیں۔ کس قدر بے معنی اور فضول لا حاصل ہوگا۔

وطنیت اور قومیت کا یہ جذبہ جس کا نام اب نسل قرار دیا گیا ہے۔ پہلے پہل تو صرف مغربی تمدن کے اولین مرکزوں میں ظاہر ہوا اور یہاں سے بڑھ کر وہ ایسے مقامات میں پھیل گیا کہ جہاں اس کے پہنچنے کا وہم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ جزیرہ نما بلقان میں اس نئی پان قومیت کے تو نہایت مہلک اثرات پیدا ہوئے۔ یہاں "پان سلاف ازم" اور "پان سرب ازم" جیسے بے معنی نعرۂ قومیت نے اِن ممالک کو بھوتوں کی رقص گاہ بنا دیا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک تو یہ جذبہ ایشیائی قوموں میں بھی سرایت کر چکا تھا۔ تحریک نوجوانانِ ترک۔ نوجوان مصر و تحریکات الجزائر ہندوستان نے ثابت کر دیا ہے کہ وطنیت آہستہ آہستہ تمام دنیا پر تسلط کیا چاہتی ہے۔ اور یورپی "پان قومیت" کی تقلید سے فضائے مشرق بھی "پان توران" "پان عرب" حتیٰ کہ "پان مسلم وطنیت" کے نعرہ ہائے بیدار سے گونجنے لگی۔

فصل اوّل

اب ہم جذبۂ وطنیت کے مشرقی مظاہرات کا مطالعہ کریں گے۔ اور پھر دنیائے اسلام کے جذبۂ قومیت کی حقیقت پر بحث کریں گے۔ ہندوستان کی وطنیت کی تجدید و ترقی بالکل مختلف طریق سے ہوئی ہے۔ اور اسی لئے اس پر علیحدہ باب میں بحث ہوگی۔

انیسویں صدی کے مغربی تاثرات کی اشاعت سے پہلے دنیائے اسلام قومیت متحدہ کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا تھی۔ ہاں ایسی مقامی روایات ضرور موجود تھیں جیسے انکی

کی حسن عقیدت اپنے بادشاہ یعنی سلطانِ وقت کے متعلق۔ عربوں کا تفاخر قومی بھی اِس حقیقت کا ایک اور مظہر تھا۔ یہ باتیں ثابت کرتی تھیں۔ کہ مغربی وضع کی قومیت کا امکان مشرق میں بھی ہو سکتا ہے اگر کہیں قومیت کی وہ صورت جو مغرب میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ موجود تھی۔ تو وہ اہل ایران کی قدیم نسلی۔ معاشرتی اور جغرافی روایاتِ سطح مرتفع عجم میں ایک قوم ہونے کا پتہ دیتی تھیں۔ گو اِس حقیقت باہرہ سے بیرونی دنیا اور خود اہل ایران ایک عرصہ تک بےخبر رہے۔

اِس میں شبہ نہیں۔ کہ اسلام کے اصول اِس قسم کی قومیت اور وطنیت کے مخالف ہیں۔ اسلامی خلافت اور امامت یعنی ایک ہمہ گیر الٰہی جمہوریہ کا سیاسی نصب العین قدرتی طور پر کسی مختار کُل اور علیحدہ علیحدہ قوموں کے وجود کا منافی ہے۔ یورپ میں بھی ہولی رومن امپائر اور پائے روم کی ازہمہ اعلیٰ حیثیت کے زمانے میں علیحدہ علیحدہ سلطنتوں کا قیام مشکل تھا۔

مذہبی اصولوں کی مخالفت کے ہوتے ہوئے یہ بالکل قدرتی تھا۔ کہ انیسویں صدی کے احیائے وطنیت میں اسلام کو کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ بیسویں صدی کے ابتدائی سنین میں کہیں جا کر صحیح طور پر مغربی وطنیت کا وجود شروع ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی اصولِ اتحادِ مسلمین اور اسلامی وطنیت کے جذبات کی درمیانی کڑی ہے۔ اور ترک مصلحین قوم کے خیالات تو تمام تر یورپی نقطہ خیالِ وطنیت کا پرتو ہیں۔ اسلام جدید کا یہ مظہر ترکی میں سب سے پہلے پیدا ہوا اور ترکوں کی سلطانِ وقت سے عقیدت شعاری اور غیر ترک عیسائی غلام قوموں پر حیثیتِ حاکمانہ نے اِس قومی یکجہتی کے احساس کو ترقی دی۔

بعینہ یورپ کی طرح ترکوں نے بھی اپنے اِس دورِ جدید کا آغاز محاوراتِ زبان کی کاٹ چھانٹ اور اپنے عہدِ ماضی کے واقعات کو تازہ کرنے سے کیا۔ پچاس سال ہوئے ترکوں کو اپنی تاریخ کے متعلق علم نہ تھا۔ اور اِن کے اجداد کے کارنامے محض قصے کہانیوں کے طور پر یاد کئے جاتے تھے۔ اور تاریخ کے اہم واقعات کا کسی کو علم نہ تھا۔ صرف رسول اکرمؐ کی سوانح زندگی اور اسلام کے ابتدائی زمانے کے حالاتِ عام دلچسپی کا باعث تھے۔ اور سلطنت عثمانیہ کی وسیع فتوحات اور تین براعظموں کے مقبوضات کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم تھا مگر وطن پرست مصلحین نے اِن قومی کارناموں کی یاد کو تازہ کر دیا۔ یہی حال ترکی زبان کا تھا جہاں

تک اِس کا تعلق سرکاری سررشتوں سے تھا۔ اس کی ہیئت ترکی تو رہی ہی نہ تھی۔ ہاں عربی اور فارسی محاورات استعارات اور ترکیب بندیوں سے جکڑ جکڑا کر اِس کی صورت ایسی ہو گئی تھی۔ کہ عوام طبقہ نہ اس کو سمجھ سکتا تھا۔ اور نہ بول ہی سکتا تھا۔ اور عوام کی اصلی زبان ایک طرح کی صاف اور سادہ زبان تھی جس کی لغت محدود اور جس کی کئی ایک مقامی صورتیں ہو گئی تھیں۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ اِسے جہلا کی زبان سمجھتا تھا۔ وطن پرست گروہ نے اِس کمی کو پورا کر دیا۔ دیسی زبان کے سیدھے مگر پُر معنی جملات و محاورات کے فائدوں سے باخبر ترک مصلحین قوم نے جو مغربی ممالک کے قواعد نحو و علم الزبان سے واقف تھے۔ اب ترکی کو ادق ترکیبوں اور غیر مانوس محاورات سے پاک و صاف کرنا شروع کیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ نصف صدی کے اندر اندر ایک ایسی زبان پیدا ہو گئی۔ جو نہ صرف ادبا اور شعرا کے ہر ایک قسم کے ادائے معانی کا ذریعہ بلکہ غیر تعلیم یافتہ طبقے کی روزمرہ قرار پا گئی+

مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ترکی وطنیت کے محرک زیادہ تر یورپی قومیت پسندی کے جذبات تھے۔ جوں جوں لوگوں کی محبت اپنے ملک اور اپنی قوم سے بڑھتی گئی۔ یورپی تعصبیت کے شدید صدمات اِن کی قومی اور وطنی حمیت کو بڑھاتے رہے۔ اِس وطن پرست فرقہ کا نصب العین تمام اقوام عثمانیہ کو جن کی زبان ترکی ہو۔ ایک سلسلہ "عثمانیت" میں منسلک کرنا تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ تحریک ایسے وقت میں شروع ہوئی۔ جبکہ سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی عیسائی وطنیت اور عربوں کی "پان عربیت" متحرک ہو چکی تھی۔ سلطان عبدالحمید مرحوم خاص طور پر اس قسم کی وطنیت کے ہر قسم کے مظاہرات کا دشمن تھا۔ کیونکہ ایک تو ایسے مظاہرات اِس کے استبداد کے منافی تھے۔ اور دوسرے اِس کی پالیسی کا ستونِ واحد یعنی "تحریک اتحاد مسلمین" مانع وطنیت تھی۔ الغرض ہے۔ بنابریں کیا وطنیت پرست ترک اور کیا لبرل اس کی نظروں میں دونو قابل عتاب تھے +

۱۹۰۸ء کے انقلاب نے "جذبہ وطنیت" کو نمایاں ترقی بخشی۔ ترکوں کیلئے دوسرے اختلافات سے قطع نظر وطنیت ہی ایک ایسی چیز تھی جس پر وہ سب متفق تھے۔ بلکہ اِس کے احساس کا غیر معتدل اظہار ہی اِن کی بعد کے مصائب کا ذمہ وار رہا۔ بعض متعصب نوجوان ترکوں نے اپنی عثمانیت کا عمل اس طور سے کیا۔ کہ تمام غیر مسلم اور غیر ترک رعایا شدید مخالفت پر آمادہ ہو گئی اور اہل البلقان نے موقعہ پا کر ۱۹۱۲ء میں غیر منظم سلطنت ترکی پر حملہ کر دیا۔

حقیقت امر یہ تھا کہ جس طریق سے ترک اپنے اصول عثمانیت کی ترویج چاہتے تھے اس سے کیا غیر مسلم اور کیا غیر ترک دونوں اِن کے دشمن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اب ترکی وطنیت۔ نسلیت کے درجے تک ترقی کر چکی تھی اور وہ محض مقامی اور جغرافی حدود سے بڑھ کر اپنی عثمانیت کا میدانِ عمل وہ تمام ممالک بنایا چاہتے تھے۔ جہاں جہاں ترکی زبان کا اثر پھیلا ہوا ہے۔ اور جسے وہ اب "پان توران" "پان ترک" کے ناموں سے یاد کرنے لگ گئے۔ ترکی تحریک کے اس پہلو پر اِس باب کے اختتام پر بحث ہوگی اور فی الحال ہم دنیائے اسلام کے دیگر حصص میں جذبہ وطنیت کے اولیں مدارج تک سلسلہ کلام کو محدود رکھیں گے۔

احیاء وطنیت عثمانی کے جلد ہی بعد عربوں میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار ہونا شروع ہو گیا۔ اور قدرتی طور پر سب سے پہلے اِس کا اظہار بطور احتجاج خلاف حکومت ترکی ہوا۔ یہ تو معلوم ہی ہے۔ کہ بادیہ نشینانِ عرب و نجد ہمیشہ سے آزادی کے دلدادہ رہے ہیں۔ کسی حد تک یہی شوقِ حریت عربوں کی اِس نفرت کا باعث ہوا جو انہیں۔ عراق۔ یمن۔ شام اور فلسطین کے حکمرانوں یعنی ترکوں سے تھی۔ ایک ہزار سال کی ترکی سیادت کے باوجود عربوں اور ترکوں کے تعلقات کبھی بھی حقیقی طور پر دوستانہ نہیں ہوئے۔ اور اِس کا سبب اِن کے قومی خصائص کے اختلافات تھے۔ ترک خواہ الجزائر میں ہوں یا ترکی میں اُن کی خاصیت ہمیشہ منطقہ باردہ کے مطابق ہوگی۔ اور عرب خواہ شمالی دنیا کے کسی گوشے میں پہنچ جائیں۔ پھر بھی اِن کی عادات اور رسم و رواج اہلِ جنوب کے سے ہوں گے۔ اِن میں وہی جسمانی پھرتی۔ تیزیٔ طبع۔ رنگینیٔ خیال اور شدید درجے کا عشق حریت ہوگا۔ برخلاف اس کے ترکوں کے مزاج میں ثقل اِن کی عادات میں پائیداری اور بھاری پن اور ضابطہ اور قواعد کی پابندی کا شوق یعنی تعمیل احکام فوجی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوگا۔ ترک حکام کے نزدیک عربوں کی رنگینی مزاج اور تیزی حرکات اہلِ عرب کے چھچھورے پن کی دلیل ہے۔ اور عربوں کی نظروں میں ترکوں کا شاندار تحمل اِن کے بھدے پن کی علامت۔ اِن کی پاسداری ضوابط محض اِن کی غلامانہ روش کی جھلک۔ اور اسباب مادی کی خواہش اِن کی دنیا پرستی کا ثبوت ہے۔ عرب ترکوں کے بھدے پن پر مضحکہ اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ واہ میاں ترک سنپکہ۔ چینی۔ عربی۔ ایرانی اور یونانی غرضیکہ ہر وضع کے تمدن

تمہارا واسطہ پڑا۔ مگر کیا مجال کہ اِس میں کسی کا اثر تمہارے دماغ پر پڑ گیا ہو۔ بس تم صرف ڈاکے مار رہو۔ اُور کچھ بھی نہیں ◆

اِس کے علاوہ عرب ترکوں کی غیر مشروطیت سے حد درجہ بیزار ہے۔ اور وہابی تحریک کا اولین نشانہ ترکوں کی سیادتِ حرمین تھی۔ وہابی تحریک دب تو گئی۔ مگر عربی بے چینی کسی طرح سے کم نہیں ہوئی۔ ایک جرمنی سیاح ۱۸۸۰ئہ میں لکھتا ہے۔ جب حجاز ترکوں کے قبضے سے نکل جائیگا۔ تو عرب ترکوں کی موجودہ لغزشوں کا اچھی طرح سے بدلہ لیں گے۔ اِسی طرح شریف مکہ نے ایک فرانسیسی سیاح سے بیس سال بعد یوں کہا۔ ہم جو آلِ رسول ہیں۔ آج ترک پادشاہ کے سامنے گردن خم کرنے پر مجبور ہیں۔ جو اکثر حالات میں ترکوں کے سابقہ عیسائی غلام تھے۔ اِسی لئے انیسویں صدی کی ہر ایک ترکی شکست کے بعد ترکوں کے عربی مقبوضات میں بغاوت کی ایک لہر پھر جاتی تھی ◆

انیسویں صدی کے نصف تک یہ شورشیں کبھی کبھی پیدا ہوتی تھیں اور پھر خود بخود بیٹھ جاتی تھیں۔ اور اِن کا کوئی قومی پروگرام یا عملی نصب العین نہ تھا۔ مگر نصف صدی کے بعد کے واقعات ایک اصلی عربی "وطنیت" کا آغاز ہوا۔ پروفیسر سٹاؤرٹ کا یہ بیان اِن کی کوتہ بینی کی علامت۔ اگر اِن کو واقعات کا علم ہے۔ اور وہ اِن پر پردہ نہیں ڈالنا چاہتے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ عربی وطنیت کا جذبہ صرف اُس وقت رُونما ہوا جب فرانس اُور انگلستان کی مشرقی سیاستیں مشرقِ قریبہ میں نظامِ استعماری قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگیں۔ اِس کی جائے ابتدا شام تھی۔ اور یہ امر کسی قدر قدرتی تھی۔ کیونکہ دنیائے عرب میں سے شام ہی ایسا مقام تھا جہاں مغربی تاثرات کا نفوذ شدت سے ہو رہا تھا۔ ابتدائی عرب شورشوں کے لیڈر کچھ بہت قابل لوگ نہ تھے۔ اُور اِس لئے ترکی حکومت اِن کی کارروائیوں کے تدارک میں کامیاب ہوتی رہی ◆

۱۸۷۷ئہ کی جنگ روس و روم نے جس میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ صورتِ حالات کو بالکل متغیر کر دیا اور اب شامی عرب کھلم کھلا ترکی حکومت سے آزاد ہونے کے دعوے کرنے لگے۔ اِن کا ارادہ یہ تھا۔ کہ تمام عربی ممالک کی زیرِ سیادت شریف مکہ ایک متحد سلطنت کے طور پر تنظیم دیجائے۔ اُور یہ ارادہ یقینی طور پر عربی لیڈروں کی مغربیت کا

نتیجہ تھا۔ جو ایک الٰہی جمہوریہ کے خواب دیر سے دیکھ رہے تھے۔ اور نجد کی تحریک وہابی کی بھی یہی بنیاد تھی۔

مگر اس دفعہ بھی یہ چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ سلطان وقت عبدالحمید مرحوم تھے۔ جن کی پان اسلامک پالیسی کے ہوتے ہوئے عربی وطنیت بے اثر تھی۔ برخلاف اس کے اب عربوں کی آؤ بھگت قسطنطنیہ میں ہونے لگی۔ علاوہ ازیں شام اور حجاز کی ریلوں کے تعمیر نے عربستان پر ترکی سیاسی گرفت کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ جس کی موجودگی میں ایک کامیاب عربی بغاوت کا امکان اور بھی دور ہو گیا۔ سلطان مرحوم کے پروپاگنڈا اتحاد مسلمین نے بھی ترکی عربی کا وش کو اک گونہ کم کر دیا۔ اور اس میں کلام نہیں۔ جوں جوں یورپ کے دندان آز مشرق قریبہ پر تیز ہونے جاتے تھے۔ کیا عرب اور کیا ترک سب کو اتفاق اور یکجہتی ہی میں اپنی خیریت نظر آتی تھی۔

مگر سلطان مرحوم جیسے روشن دماغ پادشاہ کی کوششیں بھی کچھ بہت کامیاب نہ ہوئیں۔ اور ترکوں کا عربی ناسور روز بروز خراب ہوتا گیا۔ کئی سو شامی لیڈر غیر ممالک کو بھاگ گئے۔ اور مصر اور یورپی ممالک کی آڑ میں بیٹھ کر عربی آزادی کے لئے باقاعدہ پروپاگنڈا کرنے لگے۔ ان کی کوششوں کا آغاز ۱۸۹۵ء میں ہوتا ہے۔ جبکہ پیرس میں حزب الوطنیہ کا افتتاح ہوا۔ دس سال تک یہ کمیٹی اپنا کام خاموشی سے کرتی رہی مگر یہ کام بے اثر نہ تھا۔ ۱۹۰۵ء میں تمام حجاز اور یمن میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے۔ میرے خیال میں یہ شورشیں قطعی طور پر کبھی بھی فرو نہیں ہو سکیں۔ اور کئی سالوں تک لکھوکھہا روپے اور قیمتی جانوں کے نقصان کا باعث ہوئیں۔ اور سلطنت عثمانیہ کے مصائب طرابلس و بلقان کی ایک حد تک ذمہ وار ہوئیں۔

۱۹۰۵ء کی عربی شورش نے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ وطنیت پرست عرب جلاوطنوں نے اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اور مغربی ممالک میں کامیابی سے نوجوانان عرب کے مقاصد کی اشاعت کی۔ اس پروپاگنڈا میں ایک اشاعت قابل ذکر ہے۔ نقیب (ازوری) کی کتاب "احیاء عرب" نے جو فرانسیسی زبان میں طبع ہوئی تھی۔ ساری دنیا کو

عربی نقطہ خیال سے آگاہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۰۶ء میں عربی قومی کونسل نے ایک اعلان شائع کیا جس کا ماحصل یہ تھا۔ سلطنت ترکی پر اب ایک پائدار تغیر آچکا ہے۔ ترک جواب تک اہل عرب پر تشدد کرتے رہے ہیں۔ اِن کو خفیف اسباب کی بنا پر علیحدہ علیحدہ رکھنے پر کامیاب نہیں ہوئے۔ اور اب نوجوانانِ عرب اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ کہ ترقی کے کِرم خوردہ جسم سے اپنے آپ کو علیحدہ کر کے عربی قوم کی ایک علیحدہ سلطنت کی بنیاد ڈالیں۔ اِس سلطنت کی حدود دنیائے عرب کی حدود ہوں گی۔ یعنی وادی فرات سے لیکر آبنائے سوئیز تک اور بحرہ روم سے لے کر عمان تک۔ ولایت حجاز و مدینہ کی ایک عربی سلطان کی سیادت میں جو شریف مکہ ہو۔ بطور سلطنت تنظیم دی جائے گی۔ اور یہ سلطان خلیفۂ اسلام بھی ہوگا۔ اور اس سے اسلامی سیاسی اور روحانی حکومتوں کے اختیار کی باگ ایک ہی ہاتھ میں ہوگی۔

جو اعلان اہل عرب کے نام جاری کیا گیا۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے۔ "اے اہلِ وطن۔ تمہیں معلوم ہے۔ کہ آج عربی قومیت کے افراد دنیا میں بالخصوص ترکی سلطنت میں کس حقارت اور نفرت سے دیکھے جاتے ہیں۔ آج ہم بہائم وسطِ ایشیا کے پنجہ استبداد میں گرفتار ہیں۔ ہمارا وطن جو قدرت کی دولت سے مالا مال ہے۔ اغیار کے پاؤں تلے روندا جا رہا ہے۔ ایک دنیا جانتی ہے۔ کہ اپنے عہدِ ماضی میں ہم نے ایک صدی کے اندر اندر آدھی دنیا کو مسخر کر لیا۔ اور کئی صدیوں تک تمدن اور تہذیب کی مشعل کو روشن رکھا۔ آج ایک خبیث حکومت کے عمال نے ہمیں جاہل مطلق بنا دیا ہے۔ اور جب سے سلیم کی اولاد نے علم خلافت کو ہاتھ میں لیا ہے۔ ہم دنیا کے غریب ترین اور حقیر ترین مخلوق قرار پا گئے ہیں۔ اِس اعلان کے اختتام پر عرب آزاد کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ ہاں آج عربوں سے کوئی پوچھے۔ کیوں صاحب اب تو آزادی مل گئی نا)

مگر محض ایسی اشاعتوں سے آزادی حاصل نہ ہو سکی۔ بغاوتیں ہر جگہ دبا دی گئیں اور ترکی سیادت نے اپنا اقتدار قائم رکھا۔ عہد حمیدی میں سلطنت کے عربی صوبے گویا دو تحریکوں کے درمیان ڈگمگا رہے تھے۔ اِن میں سے ایک تو جذبہ حریت تھا۔ اور دوسرا جذبہ ہ بقاو منہ مغربیین،

۱۹۰۸ء کے ترکی انقلاب نے حالات کو بالکل بدل دیا۔ عربوں نے ترکی صوبوں کے

چین جانے پر اظہارِ مسرت کیا۔ اور اپنے مستقبل کی بڑی بڑی اُمیدیں باندھنے لگے۔ عربی ممبرانِ پارلیمنٹ عثمانیہ نے عربی خود اختیاری حکومت کا دوسرا کیا جب نمائندگانِ انجمن اتحاد و ترقی کو استرد کر دیا۔ عرب اس فعل سے بھڑک اُٹھے۔ اور اپنے پروپاگنڈا احیاءِ عربیت کا از سرِ نو اجرا کر دیا۔ اب تو وہ بڑے بڑے خواب دیکھنے لگے۔ ان کا ارادہ یہ ہوا۔ کہ ایک مستقل عربی قومیت کا شیرازہ باندھیں جس میں دنیا کے تمام عربی بولنے والی قومیں الجزائر۔ تیونس۔ مراقش وغیرہ بھی مل ملا کر ایک ہمہ گیر عربی سلطنت کے اجزا بن سکیں۔ تو گویا اس صورت سے عربی وطنیت ترکی وطنیت کی طرح اب توحیدِ نسل کے درجے تک ترقی کر گئی۔

عربی تحریک کے عام نتائج سے قطع نظر ہم اب صرف سلطنت ترکی کی عربی رعایا کے جذبہ وطنیت پر سلسلہ کلام کو محدود رکھیں گے۔ ۱۹۱۲ء کے مغربی دستبرد کے خوف کے باوجود ترکوں کی پالیسی "عثمانیت" نے عربی بے چینی کو فرو ہونے سے روکا۔ اور ۱۹۱۴ء میں عربی انقلاب کی از سرِ نو تیاریاں ہونے لگیں جنگ یورپ کے شروع ہوتے ہوتے عربی شورش کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ ترکوں نے سرآوردہ شورش کنندگان کا سختی سے قلع قمع کیا۔ گو "جہاد" کے اعلان نے ایک مختصر گروہ کو ترکوں کا حامی بنا دیا۔ بالخصوص اس لئے کہ فتح مصر کا امکان بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ مگر جوں جوں جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اس گروہ کی ہمدردی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ نے علی الاعلان بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کا اصلی سبب انگلستان کی خطیر امداد تھی۔ اور اس کے شروع ہوتے ہی ہر جگہ کے عرب ترکوں کے دشمن بن گئے۔ اتحادیوں کے وعدۂ آزادی سے متاثر ہو کر عربوں نے جان توڑ کر ترکوں کا مقابلہ کیا اور ۱۹۱۸ء کی ترکی شکست زیادہ تر ان کی جنگی کارروائی کا نتیجہ تھا۔

جنگ کے بعد کے حوادث دنیائے عرب پر بحث کرنے سے پہلے ہم شمالی افریقہ کے عربوں کی "وطنیت" پر اب ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔ اس وطنیت کا بہترین مظہر اہل مصر کا دعوئے حریت ہے۔

اہل مصر کیا عہدِ فراعنہ میں اور کیا آج سب کے سب "نوشکت" طبقہ نسل انسانی میں سے ہیں۔ اور اسی لئے ان کے بیشتر حصہ آبادی یعنی فلاحین کی جبلت میں سادگی۔ سستی اور اطاعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ہاں کبھی کبھی یہ اطاعت مبدل بہ بغاوت ہوتی رہی۔ مگر اس کا اثر دیرپا

کبھی نہیں رہا۔ اِس طبقۂ آبادی کے اوپر غیر ملکی افراد کی تہ جمی ہوئی ہے جو زیادہ تر عرب۔ کرد۔ چرکس۔ البانوی اور ترک ہیں۔ اِس کے علاوہ مغربی قوموں کی اپنی اپنی بستیاں ملک کے بڑے بڑے شہروں میں آباد ہیں۔ جو ملکی قانون کی زد سے بچے ہوئے ہیں۔ اور ایک دیسی عیسائیوں یعنی قبطیوں کا گروہ ایسا ہے۔ جو نہ تو مسلمان ہوتا ہے۔ اور آبادی کا کامل دسواں حصہ ہے۔

ایسے حالات کے ہوتے ہوئے شاید یہ معلوم ہو کہ ایسے ملک میں احیاء حریت بہت مشکل ہوگا۔ مگر موجودہ واقعات اِس خیال کا قطعی رد کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ اول تو یہ ہے۔ کہ مصر ایک عرصے سے زیر اثر مغرب ہے۔ نپولین کے حملے نے اہل مصر پر ایک فائر اثر ڈالا اور گو اِس کا اخراج ملک سے جلد ہوگیا۔ تاہم یہ تعلق جو ایک سربرآوردہ مغربی قوم کے ساتھ پیدا ہوچکا تھا۔ دیرپا ثابت ہوا۔ محمد علی پاشا جیسے والی مصر نے فرانسیسیوں کے اخراج کے بعد اہل مغرب کی مادی برتری سے اثر پذیر ہو کر بہت بڑے پیمانے پر مغربی آئین اور رسم و رواج کے اختیار کرنے کا انتظام کیا۔ اور اِس کا ایک اثر یہ ہوا۔ کہ مصری قوم کے رگ و ریشہ میں مغربیت کا نفوذ ہونے لگا۔ محمد علی پاشا کی یہ پالیسی اِس کے جانشینوں نے قائم رکھی۔ اور خدیو اسمعیل جیسے مُصرف نے جسے اپنی مغربیت پر ناز تھا۔ صدہا مغربیوں کو اعلٰے اعلٰے عہدے دئے۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مصر پر رفتہ رفتہ اغیار کی حکومت قائم ہونے لگی۔

مصر کی پہلی صدائے وطنیت اس وقت سُنی گئی۔ جس وقت اسمعیل کی پالیسی کے بد نتائج نظر آنے لگے۔ خدیو کے حد درجے کے اسراف سے جس کے لازم ملزوم گرانبار خارجی قرضے اور شدید ملکی ٹیکس تھے۔ متاثر ہو کر روشن خیال مصریوں نے اِس پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اپنے جذبۂ وطنیت سے متحرک ہو کر انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ خدیو کسی طرح سے اپنی اِن فضول خرچیوں سے باز آئے۔ اور خدیو کے حالی موالی صرف یورپی منصوبہ باز ہی نہ تھے جیسا کہ اُمید کیا جاسکتا تھا۔ بلکہ چرکس اور ترک پاشاؤں کا ایک جم غفیر تھا۔ جو بڑے بڑے مشاہرے حکومت سے پاتے تھے۔ بنابریں یہ احتجاج اہل مصر کی حب الوطنی کا اظہار تھا۔ اور اِسی لئے اِن کا نعرۂ جنگ مصر مصریوں کے لئے قرار پاگیا۔

اِس ہیجان میں جو اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ جمال الدین جیسی انقلاب انگیز شخصیت

کی لہر داخل ہوگئی۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ماسوائے مصر شاید ہی کوئی ایسا مقام ہو۔ جہاں جمال الدین مرحوم کا اثر زیادہ دیرپا ثابت ہوا ہو۔ اسی لئے اسے ابوالحریت کہتے ہیں۔ اس کا اثر صرف عرابی پاشا جیسے فیصلہ کن عمل کے حامی پر ہی نہ تھا۔ بلکہ مفتی محمد عبدہ جیسے نرم روش کے انسان پر بھی۔

مگر حالات حاضرہ میں جنگی پارٹی کا طوطی بول رہا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں ایک فوجی افسر عرابی پاشا نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ وہ فلاح نسب سے تھا۔ تو گویا تاریخ مصر میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ اہل مصر میں سے ایک نے مصریوں کے دل و دماغ پر اقتدار حاصل کیا۔ "مصر مصریوں کے لئے" کا نعرہ جنگ۔ بلند کر کے عرابی پاشا کے حامیوں نے غیر مصری یورپی یا ایشیائی سب کو اپنے ملک سے بدر کرنے کا تہیہ کیا۔ مگر ان کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔ سکندریہ میں چند یورپی مارے گئے۔ اور مصر پر قبضہ کرنے کا یہ اچھا بہانہ یورپی حکومتوں کے ہاتھ آیا۔ تل الکبیر پر ایک انگریزی فوج نے مصری وطن پرستوں کو شکست دی اور اس ایک لڑائی کے بعد مصر پر لارڈ کرومر کی صورت میں انگریزی اقتدار قائم ہوگیا۔ خدیو کا گھرانہ تخت مصر پر متمکن رہا اور مصری آئین حکومت بحال رہے۔ مگر اصلی طاقت اور انتظام کی باگ انگریز مشیر مال کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ جو اب سے انگریزی امپیریل اقتدار کا محافظ سمجھا جائے گا۔

پچیس سال تک لارڈ کرومر نے مصر پر حکومت کی اور بوجہ اپنی حسن کارگذاری برائے مفاد انگلستان اس قابل اہلکار کا نام انگریزی تاریخ میں یادگار رہیگا۔ اس کے قوی بازو کی مدد سے مصر دیوالیہ ہونے سے بچ کر ایک خوشحال ملک ہوگیا۔ مگر اس مادی فلاح نے مصریوں کی حب الوطنی میں کمی نہیں ہونے دی۔ انگریزی گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے بے بس مصری دب تو گئے مگر ان کے جذبہ حمیت کا استقلال قائم رہا۔ اور اس کی اندرونی طاقت بتدریج مترقی ہوتی رہی۔ تل الکبیر کے محاربے کے بعد اس کا وجود نظروں سے اوجھل تو ضرور ہوگیا۔ مگر آج کے واقعات صاف بتا رہے ہیں۔ کہ وہ مرا نہیں۔ بلکہ خفیہ طور پر نشو نما پاتا رہا۔ ایک مشہور جرمن افریقی سیاح جو ۱۸۹۵ء میں مصر میں وارد ہوا۔ اہل مصر کی ذہنی تغیرات سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے برملا کہہ دیا۔ کہ مصر کی قومیت کا شیرازہ بندھ چکا ہے۔

صدی سابقہ کے حالات پر حالات حاضرہ نے تازیانے کا کام کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی

اِن پرجوش مصریوں کو مفتی محمد عبدہٗ جیسی شخصیت نے سمجھایا کہ ترقی اور اقتدار کی راہ تعلیمی اور ذہنی ارتقا کی دشوار گذار اور تنگ گھاٹیوں میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ مگر جذبۂ حمیت کے متوالے یہ وعظ کب سننے والے تھے۔ اور سنتے بھی کیوں۔ کیونکہ ان کو بخوبی علم تھا کہ اعتدال اور میانہ رو پالیسی کے نام لیوا خود سراسر وطن پرست ہیں۔ اور ان کا پند و نصیحت محض زمانہ سازی ہے۔ اہل مصر کا جذبۂ حریت فی الحقیقت حکومت انگریزی کے خلاف ایک عمل احتجاج تھا۔ کیونکہ آج تک تو یہ بھی ثابت نہیں ہو سکا۔ کہ کسی وقت ایک مصری نے بھی سلطنت انگریزی میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی ہو۔ اس کے علاوہ خود قانونی نقطۂ نگاہ سے مصر میں انگریزی دخل ناجائز تھا۔ انگریز مصر پر اس لئے قابض تھے۔ کہ وہ خود بخود حقوق یورپ کے محافظ بن بیٹھے تھے۔ اور اس بات پر خود یورپ میں بہت لے دے ہوتی رہی۔ آخر کار انگریزوں نے بار بار تخلیہ مصر کے وعدے کئے جو کبھی پورے نہ ہو سکے۔ مگر فرانس نے ان دعووں کو ۱۹۰۴ء کے اتحاد تک کبھی نہ مانا۔ اور برملا مصری حزب الاحرار کی حمایت کی۔ اس فرانسیسی حمایت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ فرانسیسی طریق تعلیم اور فرانسیسی تمدن کا رواج مصر میں روز افزوں ہونے لگا۔ مصری نوجوان اپنی تعلیم کے لئے فرانسیسی استادوں یا پروفیسروں کے زیر درس رہے۔ اور چونکہ یہ پروفیسر بالعموم انگریزوں کے دشمن ہوتے تھے۔ وہ مصری نوجوانوں کو انگریزوں کی طرف سے ہمیشہ بدظن کرتے رہتے تھے۔

انتہا پسند وطن پرستوں کا لیڈر مصطفیٰ کامل پاشا مرحوم تھا۔ قدرت نے پاشا مرحوم میں قومی جوش کے تمام عناصر کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے۔ اور ان کا جوش اس قدر تھا جس قدر ان کی ذات کا مقناطیسی اثر۔ ان کی فصاحت بیان و زور قلم لوگوں کے دلوں کو مسخر کئے لیتا تھا۔ ان کی زیر ادارت کئی ایک اخبارات تھے۔ اور ان اشاعتوں کی روک تھام کے باوجود ان کے حوصلوں میں کمی نہیں ہوئی۔ ان کے جذبۂ وطنیت کا مندرجہ ذیل بیانات سے پتہ چلتا ہے وہ فرماتے ہیں۔ تاوقتیکہ مصری خود اس کے قیام کے ضامن نہ ہوں مصری فلاح اور تمدن کی اساس دوسروں کے سہارے کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر ایک مصری کو خواہ وہ زمیندار۔ تاجر۔ معلم یا فلاح ہو۔ اس حقیقت کا احساس ہونا چاہیئے۔ کہ بنی نوع انسان کے بعض ایسے حقوق

ہیں جن کو غصب کرنے کا کسی کو مجاز نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک انسان کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے۔ اور اس حریت کی معاشرتی اور ترقی زندگی اس کا فرض اولین ہے۔ اور حب الوطنی سے بڑھ کر کوئی اور شیوہ تہذیب روحانی کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اور جس قوم کو آزادی نصیب نہیں اس قوم کی ہستی اور عدم وجود برابر ہے۔ صرف حب الوطنی سے قومیں ترقی و تمدن کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتی ہیں۔ اور حب الوطنی میں وہ خون ہے۔ جو اولوالعزم قوموں کی روح کو شاداب کرتا ہے اور حب الوطنی سے ہی مردہ افراد اور مردہ قومیں عالم حیات میں آتی ہیں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے۔ کہ پاشا مرحوم انگریزی اقتدار کا شدت سے مخالف تھا۔ ذیل کے الفاظ "لواء" روزنامہ کے ایک آرٹیکل سے مقتبس ہیں "ہماری قومی ثروت لوٹی جا رہی ہے۔ اور اس کے لوٹنے والے انگریز ہیں۔ ہمارے پاک حقوق غصب ہو چکے ہیں اور انگریز ان حقوق کو غصب کرنے والے ہیں۔ اور یہی امر ہماری یقینی کامیابی کا باعث ہو گا۔ جب سچائی ہماری طرف ہے۔ تو ہمارے مقاصد کی تکمیل محض دنوں کی بات ہے۔"

باوجود اس قدر جوش و خروش کے مصطفےٰ کامل پاشا یہ جانتے تھے۔ کہ مصری قوم انگریزوں کے فوجی مقابلے کی اہل نہیں۔ اسی لئے انہوں نے جنگی شورش کا قصد کبھی نہیں کیا۔ ۱۹۰۸ء کے اوائل میں عین شباب یعنی ۳۴ سال کی عمر میں انہوں نے انتقال فرمایا۔ اور ان کے جانشین مصری حزب الاحرار کے لیڈر محمد فرید بے قرار پائے۔ فرید بے مرحوم پاشا مرحوم کے قابل جانشین نہ تھے۔ ان کی قابلیتوں کا اندازہ فرید بے کے مندرجہ ذیل بیان سے لگ سکتا ہے۔ "انگریزوں کی موجودگی نے ہمارے پاک وطن کو ناپاک کر دیا ہے۔ انہوں نے ہمارے تمام ملکی پاؤں کے تلے روند ڈالے ہیں۔ ہماری زبانیں کھینچ لی ہیں۔ اور ہمارے معصوم زن و مرد کو تہ تیغ کیا ہے۔ جن کی ان بدکاریوں سے قریب ہے۔ کہ آسمان گر پڑے۔ زمین پھٹ جائے۔ اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں۔ اس کا علاج صرف ایک ہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمیں آج سے اپنی زندگی کو حقیر سمجھنا چاہئیے۔ کیونکہ ایسی زندگی سے قومی جدوجہد کی موت کہیں بہتر ہے۔"

فرید بے نے ایک اور غلطی یہ کی کہ مصری عیسائی یعنی قبطی آبادی سے متعلق مخالفانہ روش اختیار کی جن کو دوست بنانے میں پاشا مرحوم نے اس قدر جانفشانی کا اظہار کیا تھا۔ فرید بے کے پروپیگنڈا

کی بڑھتی ہوئی شرارت سے متاثر ہو کر قبطی گروہ نے اس کے برخلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس کا جواب عزیز بے نے حسب ذیل الفاظ میں دیا "قبطیوں کو ہلاک کر دینا چاہئے۔ ان کے جسم اور ان کے چہرے شیطانوں اور بندروں کے سے ہیں۔ اور یہ ان کے خصائل ہی کی مناسبت کا ثبوت ہیں۔ ان کا وجود ڈارون کی تھیوری کو ثابت کرتا ہے۔ اور وہ واقعی بندروں کی اولاد ہیں۔ او ملعون! قبطیو! او! غلاموں کی اولاد! او! بندر خصالو! تم پر لعنت!"

مصری وطن پرستوں کے بیانات کی درشتی ایک واقعہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اور وہ یہ تھا کہ کرومر مصر سے رخصت ہو چکا تھا۔ اور اس کا جانشین اب الڈن گورسٹ تھا۔ انگلستان کی جدید لبرل وزارت مصریوں کے غصہ کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی جسے کرومر کی تمردانہ لاپرواہی نے مشتعل کیا تھا۔ دوسری وجہ انقلاب ترکی تھا جس سے مصری حسیات پر ایک گہرا اثر پڑا تھا۔ اور ایک اور بات یہ بھی تھی کہ فرانس اور انگلستان کی رقابت کے خاتمہ پر مصری کسی یورپی طاقت کی مدد سے انگلستان سے ایفائے وعدۂ تخلیہ مصر کرانے سے مایوس ہو کر اب ذاتی کوششوں پر آ رہے تھے۔

ایسے حالات میں بھلا انگریزی مصری دوستی کیسے ہو سکتی تھی۔ کیونکہ الڈن گورسٹ کی پالیسی کیسی ہی نرم ہوتی۔ اس کے اختیار میں یہ تو تھا ہی نہیں۔ کہ مصریوں کو آزادی عطا کر دیتا۔ اور اس ولولے کو انگلستان نے حقارت سے رد بھی کر دیا تھا۔ ہر ایک انگریز کا یہ یقین تھا۔ کہ نہر سویز کا انگریزی قبضہ ہی انگلستان کے مشرقی مقبوضات کی حفاظت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اور مصر کا دائمی قبضہ ایک لابدی ضرورت ہے جس سے مراد یہ تھی۔ کہ مصری وطنیت اور انگریزی امپیریل ازم کے درمیان کبھی کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ انگریزی لبرل پالیسی مصری حریت کے جذبات کم نہ کر سکی۔ اور خود الڈن گورسٹ نے اس بات کو تسلیم کر لیا۔ کہ مصریوں نے رعایت کے معنی کمزوری کے لئے ہیں۔

اب مصری جذبات کا اظہار اس طرح سے ہونے لگا۔ کہ انگریزی حکومت کو شدید منقلب کی پالیسی کی ضرورت لاحق معلوم ہونے لگی۔ سنہ ۱۹۱۱ء الڈن گورسٹ رخصت ہوا۔ اور اس کی جگہ کچنر مقرر ہوا۔ کچنر کا تقرر اس امر کا اشارہ تھا۔ کہ ہر قسم کی شورش کو وہ آدمی نہایت سختی اور تشدد سے دبا دیگا۔ جس نے مہدی سوڈان کی قبر اور درویشوں کی ڈنڈے سے خبر لی تھی۔ کچنر کا خاص حکم

یہ تھا۔ کہ امن بحال ہو۔ اور یہ کام اُس نے ٹھیک طور سے سرانجام دیا۔ اُس نے مصریوں کو کہا تم سیاسیات کو چھوڑ دو جس سے تم بے بہرہ ہو۔ اور زراعت میں لگ جاؤ جسے تم جانتے ہو۔ اور اس نے صاف طور پر جتا دیا۔ کہ انگلستان مصر سے کبھی بھی دست بردار نہ ہوگا۔ اور خود مصری بھی حکومت خود اختیاری کی اہلیت نہیں رکھتے۔ نئے قوانین کی مدد سے کچنر نے سڈیشن کا قلع قمع کیا۔ اُس نے خوشامدی اخبارات کے سوا سب کو بند کر دیا۔ اور تمام قومی لیڈر یا تو قید کر دئے گئے۔ اور یا اُن کو جلا وطن کر دیا گیا۔ اِن تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ دنیا کی نظریں مصر کی طرف سے ہٹ گئیں۔ جس میں انگریزی اخبارات نے مصر کے متعلق ایک حرف نہ لکھنے سے مدد کی اور امن ہوتا یا قائم ہو گیا

مگر کیا یہ واقعی امن کی صورت تھی۔ جب اِن کے حقیقی قومی جذبات کی یوں پامالی ہونے لگی تو غم و غصے کی چنگاریوں نے جو پھر بھی کبھی کبھی نکل پڑتی تھیں۔ اجنبیوں کو ڈرا دیا۔ ۱۹۱۴ء مسٹر سڈنی لو نے لکھا۔ یہ کہنا۔ کہ ہم مصر میں ہر دلعزیز ہیں صریح غلطی ہے۔ ہاں ہم سے لوگ خوف کھاتے ہیں مگر یہ کہنا۔ کہ اُن کے دلوں میں ہماری عزت ہے۔ بالکل غلط بات ہوگی۔ اور پیار تو ہمکو کوئی بھی نہیں کرتا۔ اس سے بڑھکر معنی خیز وہ بیان تھا۔ جو ایک سائنٹفک رسالے میں مصر کے اوپر تاریکی کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اِس کے چند جملات ذیل میں دئے جاتے ہیں۔ مصری معاملات اور خبروں کا انگریزی اخبارات میں نہ شائع ہونا۔ ایک نہایت ہی غیر خوش آئیند طریق عمل کی نشانی ہے۔ اور مصر کی حقیقت یہ ہے۔ کہ ساری کی ساری قوم حکومت احتلال کی پالیسی سے بیزار ہے۔ اور دل ہی دل میں اجنبیوں کی غصبیت پر پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ اور حال کے بعض واقعات نے مصریوں پر ثابت کر دیا ہے۔ کہ حکومت انگریزی الحاق مصر کیا چاہتی ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کہ یہ خیالات کہاں تک صداقت پر مبنی ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے۔ کہ انگریزی اثر نہ صرف لوگوں کی پریشانی کا باعث ہے۔ بلکہ اُس نے لوگوں کے دلوں کو بالکل مطمئن نہیں کیا۔ اگر کچنر کی سخت گیری سے کچھ نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ تو وہ صرف یہ کہ بے چینی اب بالائی سطح کے نیچے دبا دی گئی ہے۔ یہ امر مصری جذبہ کا ثبوت ہے۔ جو باوجود شدید سختی کے اب تک زندہ ہے۔ قانون مطابع کے ظلم نے نہ صرف مسلمانوں کو ہی برانگیختہ کیا ہے۔ بلکہ عیسائی قبطیوں کو بھی انگریزوں کا دشمن بنا دیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ انگریزی حکومت اِن فوائد

کو کام میں لانے پر مجبور ہوئی۔ یا یہ کہ بے چینی کی ظاہری علامات کے کم کرنے سے اُس کی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے۔ محض اِس حکومت کی کمزوری اور اس کے اقتدار کی ناپائیداری کا ثبوت ہے۔ اِس بیان کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ مصری معاملات سے انگریزی ووٹ دہندگان کو کوئی تعلق نہ ہو۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہندوستان اور مغربی اور وسطی افریقہ کے مسلمان اس برطانوی رویہ کو نظر تعمق سے دیکھ رہے ہیں اِن کی ہمدردی سراسر مصریوں کے ساتھ ہے۔ اور وہ یورپی عیسوی امپیریلزم کی سیاسی منصوبہ بازیوں سے متنفر ہیں +

مصر کی حالت ۱۹۱۴ء میں یہ تھی۔ اور جنگ کے شروع ہوتے ہی شدید وضع کی ہلچل ملک میں رونما ہوئی۔ حقیقت امر یہ تھی۔ کہ انگریزوں کو قیامِ اقتدار میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ مصر پر اقتدار انگریزی تھا۔ مگر اُس کی قانونی حیثیت سلطنت عثمانیہ کے ایک صوبہ کی تھی یہ بات فوراً ہی آشکار ہو گئی۔ کہ ترکی انگریزوں کے دشمنوں کی حمایت کیا چاہتی ہے۔ اور خود عباس حلمی خدیو مصر نے اپنے خیالات کا علے الاعلان اظہار کیا۔ جنگ کے ابتدائی ایام میں گو ترکی غیر جانبدار تھی۔ مصری پریس میں اشارتاً انگریزوں کے خلاف خیالات کا اظہار ہونے لگا۔ اور مصری رعایا اور مصری فوج کے افراد کا رویہ شدت سے مخالفانہ ہو گیا۔ انگریزوں کو اپنی طاقت کے کھوے جانے کا خدشہ پیدا ہوا۔ چنانچہ جس وقت سلطنت عثمانیہ جنگ میں شریک ہوئی۔ انگلستان نے خدیو عباس حلمی کو معزول کر کے اِس کے بھائی سلطان حسین کو تخت پر بٹھایا اور مصر کو سلطنت انگریزی کا مقبوضہ قرار دیا +

اِس سے وطن پرست فرقے کے دلوں میں ایک آگ سی لگ گئی۔ برملا بغاوت تو اِن کے امکان سے باہر تھی۔ کیونکہ انگریزوں نے ایک لشکر جرار جس میں زیادہ تر اِن کی نو آبادیوں کے سپاہی تھے ملک میں پھیلا دیا تھا۔ مگر پھر بھی آئے دِن فسادات ہو رہے۔ جن کو حکومت احتلال نے نہایت سختی سے قانون جنگ کے ذریعے سے فرو کیا۔ ایک فرانسیسی اِس موقعہ پر لکھتا ہے۔ ہر ایک مسلمان مصری کا دِل جہاد کے جذبات سے مشتعل ہے۔ ابتدائے اکتوبر سے ہر ایک ادنے حیثیت کے مصری کے رویہ کا اگر مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ وہ عیسائیوں کے خون کا پیاسا ہے بعض تو سلطان المعظم کا اعلانِ جہاد سُن کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اور جب اِن کی اِس حرکت

کی اطلاع انگریزی پولیس کو کی گئی۔ تو اس نے ایسے لوگوں کو ٹکٹکی سے باندھ کر بید مارے۔ یہی حالت جامع الازہر کی تھی۔ جہاں یورپی نائرین پر لعنت ملامت کی جاتی تھی +

وطن پرست مصریوں نے بیرونی ممالک میں اپنے مظلوم اہل وطن کے جذبات کی اچھی طرح سے اشاعت کی۔ ان کے لیڈر فریبے نے جنیوا سے ایک اعلان شائع کیا۔ جس میں اُس نے انگلستان کے ناجائز فعل کی شدت سے ملامت کی۔ اور اہل انگلستان کو یاد دلایا۔ کہ ایسے حالات میں جرمنی کے خلاف ان کے خیالات کہاں تک قابل تسلیم ہو سکتے ہیں۔ یہ جلا وطن مصری لیڈر جرمنی کے پرجوش حامی بن گئے۔ جیسا کہ شیخ عبد الملک حمزہ کے ایک جرمنی اخبار ارٹیکل سے معلوم ہوگا وہ فرماتے ہیں۔ شاید ہی کوئی مصری ایسا ہو۔ جو انگلستان کی شکست اور تباہی کا متمنی نہ ہو۔ جنگ کے ابتدائی ایام میں میں نے مصر کے دیہات میں تمام مصریوں کو بغیر اِس کے کہ وہ اہل ثروت ہوں یا معمولی فلاحین قیصر جرمن اور سلطان المعظم کے تعلقاتِ دوستانہ کا حامی اور جرمنوں کی فتح کے لئے دست بدعا پایا +

انگریزی فوج کی موجودگی میں اِن اعلانات کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ترکوں کے حملۂ نہر سویس کا تدارک کر دیا گیا۔ اور مارشل لا کے عمل سے مصریوں پر وہ ہیبت چھا گئی۔ جو جنگ کے اختتام تک قائم رہی +

شمالی افریقہ کی وطنیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں سوائے مصر کے کسی اور مقام پر قومی جذبات کا اِس قدر تموّج اور کہیں نہیں ملتا۔ گو یورپیوں سے نفرت کی علامات ہر جگہ موجود ہیں مگر ان کا اظہار ایک منظم نیشنل ازم کے طریق پر نظر نہیں آتا۔ بلکہ پان اسلامزم و پان اسلامی نیشنل ازم کے طریق پر +

شمالی افریقہ کے عدم وجودِ وطنیت کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ماسوائے مصر کے اور کسی شمال افریقی خطے میں قومیت کے تمام عناصر موجود نہیں۔ کیونکہ مختلف قبائل کے گروہ جو بحرہ روم اور صحرائے افریقہ کے درمیان آباد ہیں۔ دراصل یورپی الاصل ہیں اور حبشیوں یا ایشیایوں سے اِن کا چنداں تعلق نہیں۔ اور نسل لاطینی سے اِن کو ایک گونہ نسبت ہے۔ اہل بربر بالکل شمالی البانیہ کے لوگوں کی طرح اپنی زبان اور اپنے قومی رسم و رواج کے شدت سے محافظ ہیں۔ مگر اس کے

ساتھ ہی وہ قبائلانہ طریق زندگی کے حامی ہیں۔ اور خواہ مذہباً اب وہ ایک قوم ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اِس طور پر کبھی مخلوط نہیں ہوئے۔ کہ انہیں سراسر ایک قوم کہا جا سکے ؛

بربروں کے دوش بدوش عرب آباد ہیں۔ انہوں نے شمال افریقہ بارہ صدیاں ہوئیں فتح کر کے اِس پر اپنی سلطنت قائم کی۔ انہوں نے وہاں کے باشندوں کو مسلمان کیا۔ اور ان میں عربی معاشرت کا رواج دیا۔ مگر پھر بھی وہ اِن کی مجموعی ہیئت کو اِس قدر عربیانہ نہ کر سکے جیسا کہ انہوں نے شام اور عراق میں کیا بربروں اور عربوں میں حقیقی اتحاد پیدا نہیں ہوا۔ اور بربروں کے بعض آئین معاشرت اب تک غیر عربی ہیں۔ اِن کی زبان اب تک عربی نہیں ہوئی اور انہوں نے عربوں سے شادی بیاہ کے تعلقات بہت ہی محدود رکھے خالص عربی نثراد عرب قلیل تعداد میں اِن کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اور اِس کی وجہ یہی ہے۔ کہ اِن میں اور اِن میں معاشرتی تعلقات کبھی گہرے نہیں ہوئے ؛

جس خطۂ ملک کی یہ کیفیت ہو۔ وہاں متحد قومیت کا شیرازہ کیسے بندھ سکتا ہے۔ بنا بریں۔ شمالی افریقہ میں ہر جگہ مختلف قبائل ملیں گے۔ مراقش کی بالکل یہی حالت نہیں۔ اور گو سارا ملک ایک ہی سلطان کے زیر نگیں ہے۔ مگر تمام ساحلی مقامات پر سلطانی حکومت کے اہلکاروں کی نسبت مقامی قبائل کے سرداروں کا زیادہ عمل دخل ہے۔ اِس افراط تفریط کے حالت نے فرانسیسی فتوحاتِ افریقہ شمال کو اور بھی سہل کر دیا۔ یہ سلسلہ ۱۸۳۰ء سے شروع ہو کر زمانہ حال میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ فرانسیسی حکومت کی وجہ سے ملک میں امن و ترقی کا دور دورہ ہوا۔ اور یہی وجہ بالخصوص اور مشرقی ممالک کی طرح افریقہ میں بھی احیا جذباتِ حمیت کا موجب ہوئی اب ایک بات تھی۔ جو لوگوں کو متحد کر سکتی تھی۔ اور وہ اقتدار غیر سے بیزاری تھی۔ بنا بریں شمالی افریقہ میں بھی آج کل حریت الجزائر۔ حریت تیونس کی صدا کان میں پڑتی ہے۔ یہاں کے وطن پرستوں کا نصب العین محض آزادیٔ وطن نہیں۔ بلکہ قیام اتحاد مسلمین افریقہ شمال۔ اور اِن کے تعلقات بین المسلمین اِنکے اِن مقاصد کے سویدا ہیں ؛

یہ حقیقت ہے۔ جو ممالک عرب کے جذبات وطنیت کی موجودہ زمانے میں ہے۔ اب ہم چند جملات ایک اور اصلاحی ملک کے حالات کے متعلق تحریر کریں گے جس کے اندر ایک

وطن اور ایک قوم ہونے کے بہترین مصالحہ موجود ہیں +

انیسویں صدی میں ایران اِس قدر پس ماندہ ہو گیا تھا۔ کہ روسی اور انگریزی امپیریلزم کو اس کے حصے بخرے کرنے کا لالچ پیدا ہوا۔ کئی ایک روشن خیال اہل ایران کو اپنے وطن کی درماندگی کا علم تھا۔ اور وہ متعدد اصلاحانہ کوششوں کے بانی ہوئے۔ اِن کوششوں کا سلسلہ فرقہ بابیہ کے قیام سے شروع ہو کر انقلاب ۱۹۰۸ء تک جاتا ہے۔ اِس انقلاب کی اصل بنا انگلستان اور روس کا عہد نامہ ۱۹۰۷ء تھا جس کے رو سے خاک پاک ایران کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اِن کو روسی اور انگریزی احاطہ اثر قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۸ء کا انقلاب محبانِ ملتِ ایران کی آخری جہد تھی۔ تاکہ اپنے عزیز وطن کو لٹیروں کی دستبرد سے بچا لیں۔ مگر یہ احتجاج صرف اجنبی طاقتوں کے خلاف ہی نہ تھی۔ بلکہ قبیلہ قاجار کے خلاف بھی جو تخت فارس کے موجودہ مالک تھے۔ قبیلہ قاجار فی الحقیقت ایرانی نہیں۔ بلکہ ترکی الاصل ہیں اور اس لئے اندرونِ محل طہران کی زبان ترکی ہے۔ نہ کہ فارسی۔ اِن کی حیثیت ایران میں بالکل ایسی تھی۔ جیسی کہ منچو خاناں کی چین میں۔ اور ایرانی وطن پرست ہر قسم کے اجنبی اثرات اور طاقتوں سے اپنے ملک کو پاک کیا چاہتے تھے +

مگر انگلستان اور روس نے مل کر اِن کی کمر ہمت توڑ دی۔ اور ۱۹۱۲ء میں انہوں نے تمام ایرانی وطن پرستوں کو چن چن کر یا تو مار دیا۔ یا خارج البلد کر دیا۔ اور بد نصیب ایران حد درجے کی مایوسی اور بے بسی میں ڈوب گیا۔ ایک انگریز اِس حالت کا خاکہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ایران کی موجودہ فلاکت کے ذمہ وار روس اور انگلستان ہیں اور اگر کوئی فریق اِس مصیبت کی سزا کا مستحق ہو گا۔ تو وہ یہ دو ملک ہونگے۔ جبکہ ملک میں حکومت کی ذمہ وار ایک ایسی انجمن وزرا ہو۔ جس پر قوم کو مطلق اعتماد نہ ہو۔ اور انگلستان اور روس جیسی دو طاقتیں اِن کے سروں پر تلوار لئے کھڑی ہوں۔ اور جنہیں کسی قسم کی مالی امداد اول دی ہی نہ جاتی ہو۔ اور دی گئی ہو۔ تو کثیر سود کی شرائط پر۔ اور جسے دیانتدار اور نیک دل اجنبی اہلکاروں کے تقرر کا اختیار نہ ہو۔ جس کے وطن پرست پر جمیعت لیڈر یا قتل ہو چکے ہوں۔ اور یا جلا وطن کر دیے گئے ہوں۔ اور جس کے ملکی مصالحہ پر گرگ خصائل یورپی سرمایہ دار

اور رعایت خواہ ہونگے دندان آز گڑے ہوئے ہوں۔ تو پھر ایسے ملک کے افراد سے یہ توقع رکھنی کہ وہ کسی قسم کے حسن انتظام کا ثبوت دیں۔ ایک فعل لایعنی ہوگا۔ خدا کوئی معجزہ کرے۔ تو شاید ایران اپنی مصیبت سے بچ جائے۔ ورنہ میرا تو یہ یقین ہے۔ کہ ایران کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا ہے یہ خلاصہ ہے۔ دنیائے اسلام کے احیائے وطنیت کے ابتدائی مراحل کا جس کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہندوستان۔ مشرقی چین۔ و روسی تاتار و مسلمانان جاوا میں بھی ایسے ہی احساسات کا ظہور ہوا۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ ہر قسم کی وطن پرستانہ جدوجہد کے مظاہرات میں تحریک اتحاد مسلمین کی بھی جھلک نظر آتی تھی۔ جو اپنے ابتدائی مراحل سے نکلکر اب مرحلہ ثانوی یعنی درجہ نسلیت تک ترقی کر چکی تھی۔ اور اب ہم اس درجہ ثانوی پر ایک نگاہ دوڑائیں گے۔

فصل ثانی

اس ابتدائی حصوں میں ایشیا کی وطنیت کا دور ثانوی یعنی دور نسلیت کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ کہ کس طرح عرب اور ترک اپنے ابتدائی خیالات کے دور سے نکل کر اب توحید نسلیت کے نصب العین پر عمل پیرا ہیں۔ ترکوں کے باب میں اس کا نتیجہ پان توران اور پان ترک جیسے اصولوں سے ظاہر ہوا ہے۔ اور جس کی ابتدائی علامت ترکوں کی ۱۹۱۲ء کی پان عثمانیت تھی۔ اب ترکوں کو یہ معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ اس آبادی دنیا کا بزرگ تر حصہ ہیں۔ جو بحرالکاہل اور بحر شمالی سے لے کر بحرہ روم اور بحرہ بالٹک کے درمیانی ایشیائی اور یورپی فضا میں آباد ہیں۔ ان کو اصطلاح میں یورال التائی یا محض تورانی کہا جاتا ہے۔ اس گروہ میں نہ صرف قسطنطنیہ اور اناضول کے ترک ہی شامل ہیں۔ بلکہ وسط ایشیا۔ قفقاز اور شمالی ایران اور بالشک کے ترک اور ہنگری کے مجاری۔ فن لینڈ کے فن اور سائبیریا کے قدیم باشندے حتیٰ کہ منگول اور منچو بھی اسی کی ایک شاخ سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ رسم و رواج اور بعض اوقات چہروں کی ساخت میں یہ فرق کسی قدر مختلف ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی زبانیں ایک سی ہیں اور ان کے کئی ایک ذہنی اور اخلاقی

امتیازات ان کی ابتدائی توحید نسبی کا پتہ دیتے ہیں۔ اُن میں استقلال اور برداشت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ گو ان کا تخیل گھٹیا اور فنون نفیسہ کے عمل کی اہلیت کم ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ تحمل۔ ثبات اور انتھک کوشش کی قوت کا تحیر خیز اظہار کرتے ہیں۔ ایک بات اور ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ صلاحیتِ نظامِ جنگ و حکومت تو ان کی فطرت ثانی ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ تورانی جنگی لیڈر دنیا کے بزرگ ترین فاتحین میں سے ہوئے ہیں۔ اٹیلا اور اس کے ہن۔ ارپاد اور اس کے مجاری۔ رسیرج اور اس کے بلغاری۔ الپ ارسلان اور اس کے سلجوقی۔ ارتغرل اور اس کے آل عثمان چنگیز خان اور تیمور لنگ اور ان کے صف شکن مبارزانِ جنگ۔ ہندوستان کا بابر اور کیلائی خان اور نور اچو کیتھے میں سب ایک ہی ماں کے اولاد اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ تورانی گھڑ سوار کا نشانِ سُم صفحات تاریخ مشرق و مغرب کے ہر ایک باب میں گڑا ہوا ہے +

اب کوئی چاہے انہیں وحشی کہے یا اولوالعزم اِس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تورانیوں کا عہد ماضی تاریخ دنیا کا حیرت انگیز باب ہے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوگا۔ کہ آیا یہ مختلف گروہ واقعی اِس ایک ہی نسل کے اجزا ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ملکی سیاسیات کا دخل ہے۔ اِن اجزا کے اختلافات کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف اِن کی زبان اِن کے طبائع کا ایک ہونا اور عہد ماضی کی شاندار روایات ایسی بین و باہرہ امور ہیں۔ کہ اگر یہ تمام مل کر اپنے آپ کو ایک نسل سمجھنے لگیں۔ تو وہ ایک نسل ہو ہی جائیں گے۔ اور اگر کہیں ایسا ہو جائے۔ تو اس قوم یا نسل کے افراد کی متحدہ قوت دنیا کے لئے ایک نہایت ہی وحشت انگیز خطرہ پیدا کر سکتی ہے +

کچھ بہت عرصہ نہیں ہوا۔ اِس امر کی حقیقت کسی کو معلوم نہ تھی۔ نہ صرف فن اور مانچو لوگ اپنے آپ کو مختلف النسل خیال کرتے تھے۔ بلکہ قسطنطنیہ اور وسط ایشیا کے ترکوں کے درمیان کسی قسم کا رابطہ اتحاد موجود نہ تھا۔ قسطنطنیہ کے ترک تو قومیت کی معمولی حسیات سے بھی عاری تھے۔ ویمبری کہتا ہے۔ جب میں ۱۸۶۲ء میں قسطنطنیہ گیا۔ اور میں نے ترکوں سے کہا۔ کہ تمہاری نسل اُدریہ سے تا بہ چین تا تار پھیلی ہوئی ہے۔ تو

وہ نفرت سے کہتے تھے کیا تم ہمارا رشتہ وحشی قرغیزوں سے ملانا چاہتے ہو۔ سعد و سے چند اشخاص کے سوا۔ میں نے کسی ترک کو اپنی قومیت یا نسلی امتیازات پر فخر نہیں پایا۔

یہ فی الحقیقت دبیری کی اور فرانسیسی اہل قلمیوں کو ہی کا حصہ تھا۔ کہ انہوں نے اپنے تمام عمر کے مطالعے کے بعد نسل تورانی کی ہمہ گیر حقیقت دنیا پر آشکار کی۔ اور ان انکشافات کا نتیجہ بھی واقعی طور پر حیرت انگیز ہوا۔ دبیری اور اس کے رفیق کی معلومات تورانی دنیا کے گوشے گوشے میں شوق سے پڑھی جانے لگیں۔ اور عین اسی وقت نہ صرف قسطنطنیہ بلکہ اضلاع تاتار روس و الگا میں۔ قومیت کے نئے جذبات۔ متحرک ہونے شروع ہو گئے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ علاقہ والگا میں ان خیالات کے اظہار قسطنطنیہ سے بھی پہلے ہونے لگا۔ قوم تاتار کی بیداری تاریخ آئندہ کے موثر امکانات کا موجب ہوئی۔ یہ تو مسلمہ ہے۔ کہ تاتار قوم ایک وقت میں روس کی مالک تھی۔ گو اس کی سیادت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اس نے اپنی مذہبی۔ معاشرتی۔ اور نسلی خصائص کو محفوظ رکھا۔ ان کی آبادی کا کثیر حصہ کازان اور استراخان میں اور کریمیا میں آباد ہے۔ اور قفقاز آبادی کا معتد بہ جزو ہے۔ بنابریں روسی حکومتی تشدد کے باوجود تاتاریوں نے اپنی حیثیت اور قومیت کو پامال نہیں ہونے دیا۔

روسی مسلمانوں کی بیداری کا ابتدائی زمانہ ۱۸۹۵ء ہے۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک مسلسل جد و جہد جاری ہے۔ انقلاب ۱۹۰۵ء نے اس کو اور بھی تقویت بخشی اور قانون آزادی مطابع کے نافذ ہوتے ہی متعدد روزنامے۔ سینکڑوں اخبارات اور رسالے تاتاری احیا کی روز افزوں ترقی کا ثبوت دینے لگے۔ تاتاری مسلمانوں کی اقتصادی خوشحالی ہر قسم کی کوششوں کی حامی بن گئی اور باکو کے مٹی کے تیل کے چشموں کے لکھ پتی مسلمان مالکوں نے دل کھول کر مدارس یونیورسٹیوں اور دیگر علمی مشاغل کی امداد کی۔ تاتاریوں کی کوششوں کا دائرہ اب دن بدن وسیع ہونے لگا۔ انہوں نے وسط ایشیا کے ترکمان مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ اور روس کی مسلمان آبادی کو ایک متحدہ قومیت کی صورت بخشی۔ روس کی پارلیمنٹ (ڈوما) میں مسلمانوں نے کئی ایک فہیم اور قابل ممبر بھیجے۔ جن کی عالی دماغی اور معاملہ فہمی نے دیگر ممبروں پر اس قدر اثر کیا۔ کہ حکومت روس مسلمانوں کی طاقت سے خائف ہو گئی۔ اور اسلامی

نباتی عنصر کو بے قاعدہ طور سے کم کرنے پر آمادہ گئی۔

مگر روسی مسلمان نا عاقبت اندیش نہ تھے۔ اُنہوں نے روسی حکومت سے اظہار عقیدت کیا۔ مگر ان کے پُر جوش اہل قوم جنہیں روس سے فرار ہونا پڑا۔ قسطنطنیہ سے اپنے خیالات اور پروگرام کی اشاعت میں لگ گئے۔ گو تورانی گروہ پر ترکی حکومتی تشدد کبھی نہیں ہوا۔ مگر پھر بھی صاحب اقتدار حکام ان کے دعاوی سے متفق نہ تھے۔ مگر جب انقلاب ترکی کے بعد نوجوانان ترک کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت آئی۔ توانہوں نے بوجہ احسن اِس نئے اصول کی ترویج کی۔ اور ان میں سے کئی ایک اِس نئی تحریک کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ یہ امر موجب دلچسپی ہے۔ کہ روسی تاتاری لوگ اپنے پروگرام کی تکمیل میں لگے رہے۔ اِن کا بہترین داعی احمد آغا تھا۔ جس کا اثر بذریعہ اخبار "ترک یوردو" (خانۂ ترک) تاتاری دنیا کے ہر گوشے میں ظاہر ہونے لگا۔

گو احمد آغا یف بے فنلینڈ سے لے کر مانچوریا تک تورانی توحید النسل کے قائل تھے مگر وہ ناقابل العمل امیدوں سے محترز تھے۔ بنابریں اپنے نئے مشن کی کامیابی کا پہلا ذریعہ انہوں نے اتحاد ترک و تاتار و ترکمان قرار دیا۔ اور چونکہ یہ تمام قومیں مسلمان بھی تھیں۔ اِس لئے یہ قدرتی امر تھا۔ کہ ان کے قومی جذبات میں جذبہ اتحاد مسلمین کا عنصر بھی ملا ہوا ہو۔ گو اِس تحریکات کی ابتدائی صورت نہ پان اسلامک تھی۔ اور نہ تورانی بلکہ محض پان ترکی۔ مگر اب اِس کا دائرہ قطعی طور سے وسیع ہو چکا تھا۔

سنہ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان نے "تورانی" نصب العین میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اِس جنگ کا نتیجہ صرف یہی نہیں تھا کہ ترک یورپ سے خارج ہو گئے۔ اور اِن کی آئندہ آماجگاہ براعظم ایشیا نظر آنے لگا۔ بلکہ سربیوں کی ترقی طاقت سے خائف ہو کر خود بلغاری اور ہنگری کے مجاری اپنے آپ کو تورانی کہنے لگے۔ اور سلافی اور سرب اثر کے جانی دشمن بن بیٹھے ان کو اب یہ معلوم ہونے لگا۔ کہ "تورانی" نسل دنیائے آئندہ کی حکمران جماعت ہونے والی ہے۔ ان کے طریق استدلال ذیل میں دیا جاتا ہے۔ تورانی نصب العین کے داعی کہتے ہیں۔ کہ تورانی نسل میں قوت استقلال اور برداشت محنت شاقہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی

ایک طرف ایشیا کی قدیم قومیں یعنی عرب - ایرانی اور اہل ہندوستان تو بے روح اور پژمردہ ہو چکی ہیں - اور دوسری طرف یورپی اپنی شدید اقتصادی زندگی کی مارا ماری سے تھک کر چور ہو گئے ہیں - اِن کی آئے دن کی بین الاقوامی رقابتیں اور کاوشیں اِن کی طاقت کو سلب کر رہی ہیں - مگر بر خلاف اِن تمام حالات کے تورانی گروہ بنی آدم کی طاقت اس وقت تک محفوظ رہی ہے - اور اس پر مغربی کشمکش کا کچھ اثر اب تک نہیں پڑا - بنا بریں دنیا کے مستقبل میں فطرت نے تورانی قوم کو دنیا کی رہبری کا مقصد جلیل ودیعت کیا ہے بعض تورانیوں کا تو یہ دعوے ہے - کہ دنیا اب بوسیدہ اور نڈھال ہو چکی ہے - اور اس کی سست رگوں میں تورانی خونِ تازہ ہی کی پچکاری اب اسے ہلاکت سے بچا سکتی ہے +

پان توران کے داعی یہ خوب طور سے جانتے ہیں - کہ اِن کی مقاصد کی جزوی کامیابی کی پہلی شرط سلطنت روس کی تباہی ہے - بلکہ وہ خیال کرتے تھے - کہ فی الحقیقت سلطنت روس کی بنیاد اور عمارت تو تورانی ہے - اور محض ایک پلستر اِس پر چڑھا ہوا ہے - جو سلافی ہے - وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایسے اہم معاملے میں وہ بغیر کسی قسم کی مغربی امداد کے ایک قوم نہیں بن سکتے - لہٰذا انہوں نے سلطنت ہائے آسٹریا اور جرمن کی روسی رقابت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی +

میں سمجھتا ہوں اِس پان تورانی "نصب العین" نے ترکی کو میدان جنگ کی طرف دھکیلنے میں نمایاں حصہ لیا - یہ کون نہیں جانتا - کہ انور پاشا اور اس کے رفیق تورانی گروہ کے حامی بن چکے تھے - اور ہر ممکن طریق سے جس میں پان تورانی کے ساتھ پان اسلامزم اور پان ترک ازم غرضیکہ ہر ایک تدبیر شامل تھی اتحادیوں سے مقابلہ کرنے پر آمادہ تھے - اِس خیال کی بہترین مثال ایک ترکی اہل قلم تگین الپ کی کتاب "ترک اور پان ترکی نصب العین" کے بعض بیانات میں پائی جاتی ہے - وہ کہتے ہیں - جرمن آسٹروی لشکر کے ہاتھوں روسی شکست سے تین کروڑ سے لے کر چار کروڑ تورانی آزاد ہو جائیں گے - اور یہ ترکی گروہ کے ساتھ مل کر جس کی تعداد ایک کروڑ ہے - دنیا کے لئے ترقی کا نیا سامان مہیا کر سکتے ہیں - اور یہ ترقی انگلستان اور فرانس کی موجودہ حالت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو گی جب ۱۹۱۷ء میں روسی زار ازم کا خاتمہ ہو گیا - تو تورانیوں کے جوش کی حد نہ رہی - اِن کو اپنی طاقت پر اس قدر گھمنڈ ہو گیا - کہ وہ اپنے جرمنی حلفا سے بھی دامن کترانے لگے - اِس حرکت سے ان کی یورپی نفرت کا راز افشا ہو گیا - جس کا وجود اِن کے دلوں میں ہمیشہ سے تھا - اور ہے - ایک جرمنی

افسر جو مارشل خلیل پاشا فاتح قسط العمارہ کے سٹاف میں تھا۔ مارشل کی اُمیدوں کا ذکر ذیل کے الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے۔ تمام فرقوں کو جن کی زبان ترکی ہو۔ ایک متحدہ قوم کی صورت بخشی جانی چاہیئے اس مقصد کی تکمیل کا پہلا ذریعہ تسخیر ترکستان ہے۔ جو فی الحقیقت ترکی قوم کا گہوارہ ہے۔ اس بنیاد کو کھڑا کر کے سائبیریا کے یاقوتوں سے تعلقات پیدا کرنے ہونگے۔ جو ترکی قوم کی انتہائی مشرقی حد ہیں۔ قفقاز کے تاتار بھی اسی برادری میں شامل کئے جائیں گے۔ مشرقی قفقاز کے وہ قلیل گروہ کو جو آرمینیا یا گرجستان میں آباد ہیں۔ یا تو اس کثیر تورانی آبادی میں ملجانا چاہیئے۔ ورنہ وہ بزور مطیع کئے جائیں گے۔ اب اس تورانی قوم کا جو مسلمان بھی ہوگی، افغانستان اور ایران پر ایک خاص اثر ہوگا۔ اور وہ دنیائے اسلام کی رہبر ہوگی ۱۹۱۲ء کے دسمبر میں مارشل خلیل پاشا نے اسی جرمنی افسر سے کہا۔ ترکوں کو عراق جیسے بنجر ریگستان کے ہاتھ سے چلے جانے کی کیا پرواہ ہے۔ میں اس کی بجائے ترکستان میں ایک عالیشان سلطنت ترکوں کی سیادت میں قائم کر سکتا ہوں +

۱۹۱۸ء میں واقعی ترک جنہوں نے شمالی ایران اور قفقاز کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ ترکستان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مگر اس واقعہ کے بعد جلد ہی جرمنی کو شکست ہوئی اور ترکی امیدوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اس واقعہ سے کچھ عرصے کے لئے تورانی گروہ پر ایک سکتہ طاری ہوگیا۔ مگر آئندہ حالات نے ان میں پھر جوش پیدا کر دیا +

۱۹۱۸ء سے بعد کے واقعات پر بحث کرنے سے پہلے میں مسلمانوں کے نسلی احیاء کے عنوان پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ یاد رہے۔ کہ ترکوں کے جذبہ نسلی کے ظاہر ہوتے ہی عربوں کی تحریک قومیت کا جس میں نہ صرف عراق اور شام بلکہ الجزائر، مراقش اور مصر بھی شامل ہیں۔ اظہار ہوا +

ان تحریکات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عربی اور ترکی تحریکات ایک ہی طریق پر ترقی پاتی گئیں۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ عربی تحریک کسیقدر اسلامی جذبات اخوت کی صدائے بازگشت بھی تھی۔ کیونکہ عرب اپنے آپ کو اسلام کی برگزیدہ قوم سمجھتے تھے۔ جن کو دنیائے اسلام کی روحانی سیادت کا حق حاصل تھا۔ مگر عربی تحریک ایسی منظم نہ تھی جیسی کہ ترکی تحریک۔ دنیائے عرب کی دماغی کوششوں کے دو مرکز ہیں۔ ایک شام میں اور دوسرا مصر میں۔ دراصل مصر ہی میں سب سے پہلے اتحاد عرب کا خیال دیکھا گیا۔ اہل مصر یہ خیال کرتے تھے۔ کہ پہلے پہل وہ آزادی مصر کے ذریعہ سے مصری قوم

کو ابھاریں گے۔ اور پھر اِس بُنیاد پر ساری عربی دنیا کے مستقبل کی بنیاد رکھیں گے۔ خدیو سابق عباس حلمی پاشا جو ۱۹۱۴ء میں تخت سے اُتار دئے گئے۔ اِس نقطہ نگاہ کے حامی تھے۔

جنگ یورپ نے اِس عربی ارادے کو اَور تقویت بخشی۔ کیونکہ عربوں کو یقین تھا۔ کہ مصر خود مختار حجاز آزاد شام اَور عراق کے ساتھ مل ایک بہت بڑی سلطنت ہو سکتا ہے۔ مگر مصری الجزائری طرابلسی شامی اَور عراقی عرب اپنی اپنی مقامی مشکلات کے حل میں اِس درجہ منہمک ہیں۔ کہ عام دنیائے عرب کی آزادی کے خواب کی فی الحال کوئی تعبیر پیدا نہیں ہوتی۔

علاوہ بریں عربی اتحاد جو ایک قومی اَور نسلی مسئلہ ہے۔ اتحاد مسلمین جیسے مذہبی مسئلے سے پیوستہ ہے۔ اہلِ یورپ کی نظروں میں یہ بات ایک معمہ کیوں نہ ہو۔ اہلِ مشرق کے لئے اِس کے سمجھنے میں ذرہ بھر مشکل نہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ اہلِ مشرق مغربی قومیت کی حقیقت سے خواہ کیسے ہی متاثر ہو چکے ہوں اِن کی خاص مذہبی اخوت کا اُصول اُن کے دِلوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتا بنا بریں جب اہلِ مشرق قومیت اَور وطنیت جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ تو ان کی مراد اِس سے بالکل وہی نہیں ہوتی جو مغربیوں کی ہوتی ہے۔ اَور تعریفی اختلاف مسائل سیاسیات میں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ بطور مثال اصطلاح سلطنت لیجئے۔ مشرق میں اِس کے معنی صرف ایسا حصہ دنیا نہیں۔ جس کی حدود اَور نظامِ حکومت مقررہ ہو۔ بلکہ ایک ایسی سلطنت مراد ہے۔ جس کا مرکز حکومت تو مقررہ ہو۔ مگر اِس کے اختیار کا دائرہ ایسے جہات پر پھیلا ہوا ہو۔ جہاں مرکزی قوانین سے لوگوں کو اک گونہ لاپرواہی ہو۔ یہ حال ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا ہے۔ جس کے باشندے تو افغان ہیں۔ مگر آئے دن افغانستان سے بالا بالا انگریزی سلطنت ہند سے برسرپیکار رہتے ہیں اَور اپنے اندرونی معاملات میں ہر قسم کے بیرونی اثرات سے آزاد ہیں۔

یہی کیفیت اصول قومیت کی ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص اسلامی ملک میں پیدا ہوئے ہیں۔ یا وہاں کے طویل رہائش کے بعد اِس ملک کو اپنا وطن سمجھنے لگیں۔ ایک الجزائری یا مراکشی اپنے قیام مصر کے پہلے دن سے مصری ہے۔ اَور سمجھا جاتا ہے۔ اِس کی ایک خاص وجہ ہے۔ اَور وہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک اسلامی ملک کو دارالاسلام کہا جاتا ہے۔ اَور مسلمان خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں۔ اِس دارالاسلام کا اپنا مشترک وطن سمجھتے ہیں۔ اِسی لئے کسی

اسلامی حصہ دنیا کے مغربی تاخت کا شکار ہونے پر اِن مقامات کے مسلمان بھی بھڑک اُٹھتے ہیں۔ خواہ اطراف کے خطہ دوسرے سے کہیں دور ہوں۔

اِس تفصیل کے بعد یہ حقیقت صرف ہو جائے گی۔ کہ مسلمان اپنی وطنیت کو ہمیشہ پان اسلامی وطنیت سمجھتے ہیں۔ اِس طریق استدلال کی وضاحت ایک ترک عالم فرانسیسی رسالہ ریویو پولیٹیک انٹرنیشنل جنوری ۱۹۱۴ء میں یوں فرماتے ہیں۔ مغرب میں نظام حکومت کا مدار تمام تر افراد جغرافی اور نسلی خصوصیات پر ہے۔ مگر اہل مشرق کے نزدیک قومیت کی یہ تعریف نہایت ہی عامیانہ اور محدود حیثیت کی ہے۔ اِن کے نزدیک قوم کا وجود روحانی اتحاد پر مبنی ہے۔ اور یہ اتحاد محض سلطنت یا قوم کے مترادف نہیں۔ بلکہ اس کا حقیقی مفہوم "ملت" ہے۔ یورپی لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ اسلامی قومیت کی یہ حقیقت اِن کے اپنے قرون وسطیٰ کے حالات کے مماثل ہے۔ اور مسلمانوں کو حالات حاضرہ کے ماتحت اِس قدیمی نصب العین کو خیرباد کہنا چاہیئے۔ اِن کی محدود معلومات کا نتیجہ ہے۔ اِن مغربیوں کو یہ معلوم نہیں۔ کہ اسلام محض مذہب ہی نہیں۔ بلکہ یہ ایک نظام قومیت معاشرت و تمدن بھی ہے۔ اور اصول اخوت یا اتحاد مسلمین جسے یورپی لوگ پان اسلامزم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک اِن کے جذبہ وطنیت کا بہترین محرک ہے۔ قومیت کی اِس اسلامی تعریف اور اِس کے مندرجہ بالا مغربی مفہوم کے درمیان جو فرق ہے۔ وہ فقط اِس دلیل کا نتیجہ ہے۔ کہ مسلمان اتحاد اُمتہ کو ودیعت روحانی خیال کرتے ہیں۔ اور مغربی قوم کے افراد اسے اپنے ایجاد کردہ معیاراتِ تاریخ و تمدن کی تشکیل سمجھتے ہیں۔

اصولِ اتحاد مسلمین یا اس کا دوسرا نام پان اسلامزم زمانہ جدید کی ایجاد ہے۔ اور اسے اب تک کوئی آئینی صورت دی نہیں جا سکی۔ باوجود اِس کے بعض ایسے مقامات مثلاً الجزائر و ہندوستان میں جہاں جذبہ حب الوطنی نے کافی طور پر نشوونما نہیں پائی۔ یہ اتحاد مسلمین ترقی پر ہے۔ ایک فرانسیسی کہتا ہے۔ اسلامی قوم پرستی ایک محدود یا مقامی جذبہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر رو ہے۔ جو ایک ہی وقت میں ہندوستان۔ افریقہ اور ایشیا یعنی تمام دنیائے اسلام پہ سے بہ رہی ہے۔ اسلامی وطنیت کا اُصول محض اسلامی اخوت کا جدید پہلو ہے۔ اور مغربی خیالات سے تصادم میں اس کا کمزور ہونا تو درکنار اب تو ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ کہ مغربیت نے

اِس کے بیٹے تازیانے کا کام کیا ہے۔ آج اِس اتحاد مسلمین کے نام لیوا ہر ملک میں اور ہر ایک اسلامی طبقے میں نئے نئے داعی پیدا کر رہے ہیں۔ اور عوام کے تعصب کو مشتعل کر رہے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے۔ جبکہ پان اسلامی وطنیت ایک اہم مسئلہ بنے بغیر نہیں رہ سکتا +

فصل سوم

یہ تصویر ہے۔ مشرقی تحریکاتِ جدید کی اور یہ ہیں حالات حاضرہ۔ جنگ یورپ کے بعد سارے مشرق کا ایک شدید بے چینی میں مبتلا ہو جانا۔ اِس جنگ کے واقعات کا بدیہی نتیجہ ہے۔ اگر جنگ کے بعد کے عہدناموں میں روا داری اور انصاف کا پہلو قوی ہوتا۔ تو ممکن تھا یہ شدید خطرہ رونما نہ ہوتا۔ مگر اِس کے برعکس عہدنامہ ورسائی دسیورسے نہ صرف یورپ ہی میں امن بحال نہ ہو سکا بلکہ اہل مشرق کے متعلق قبل از جنگ کے سے زیادہ بے دردانہ مغربی طرزِ عمل کا اعادہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنگ کے حوادث سے عبرت پذیر ہونا تو درکنار مغربی قوموں نے مشرق کو وہی کنب کرنا سمجھا۔ جو صدیوں سے خواب غفلت میں پڑا سو رہا تھا +

لبرل حکمت عملی اور قیامِ اصولِ خود اختیاری کے وعدوں کے باوجود جنگ کے اختتام پر اتحادی اپنے موجودہ مکروہ طرزِ عمل کی دلیل وہ خفیہ عہد نامے قرار دینے لگے۔ جس کے رو سے اُنہوں نے اسلامی ممالک کی قطع برید کا منصوبہ باندھا تھا۔ اتحادیوں کے دعاویٔ زمانہ جنگ کی حقیقت خود مختار سلطنت ایران کے نمائندوں کو پیرس کانفرنس میں شریک ہونے سے روکنے اور اِن کے پس پشت ایرانی وزرا سے ایرانی آزادی کے منافی اقرار نامہ کرا لینے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ تو اب سب کو معلوم ہے۔ کہ اِس اقرار نامے کے رو سے شاہ ایران کا درجہ ایک ہندوستانی نواب سے بڑھ کر نہیں رہتا۔ مصر کے بارے میں یہی رویہ اختیار کیا گیا۔ اہل مصر کو جنہوں نے انگریزی اعلان محافظت مصر کے خلاف کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ یہ صاف لفظوں میں جتا دیا گیا کہ اِن کے نیابتی وفد اتحادی کونسل کے سامنے پیش ہونے کا مجاز نہیں اور انگریزی سیادت ایک عمل پختہ ہو چکا ہے۔ اِن سب باتوں کا ماحصل یہ نکلا۔ کہ مشرق وسطیٰ و قریب پر یورپی احتلال کا سدّ ہونا تو درکنار اُلٹا اِس کی تصدیق اور تکمیل کر دی گئی +

لیکن اِن ہوشربا سانحات کا قصہ اِسی پر ختم نہیں ہوتا۔ شدید دستبرد کے اتحادی طرزِ عمل سے یہ خیال پیدا ہونا قدرتی تھا۔ کہ یہ طاقتیں اپنے منصوبوں کے پُرخطر امکانات سے آگاہ ہیں۔ اور اِن سے بچنے کے لئے آپس میں اتحاد اور یکجہتی کا ثبوت دیتی رہیں گی۔ برخلاف اِس کے جبکہ اہلِ مشرق غم و غصہ سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اتحادی طاقتیں اپنی بعد از جنگ لوٹ کی تقسیم میں آپس میں ہاتھا پائی پر اتر آئیں۔ اِس واقعہ نے اہلِ مشرق پر ثابت کر دیا۔ کہ مغربی طاقتیں نہ صرف اخلاقی جذبات سے عاری ہیں۔ بلکہ اِن کی ڈپلومیسی۔ حسنِ عمل سیاسیات بھی اِن سے رخصت ہو چکی ہے۔ اِس قسم کے خیالات سے ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ جو نظام اِسقدر ضعیف بنیادوں پر قائم کیا گیا ہو۔ آسانی سے برباد کیا جا سکتا تھا +

یہ ہے وہ طریق استدلال جس سے اہلِ مشرق مغربیوں کی سیاسی بدکرداریوں کو دیکھ رہے ہیں اور اِس قسم کے باغیانہ تخیلات کی تائید نہ صرف اِن کے اپنے مادی اور اخلاقی صدمات سے بلکہ روس کی بلشویت سے بھی ہوتی ہے۔ انقلاب سُرخ کے بانیوں نے پہلے تو یورپ کو جنگ کی للکار بتلائی اور پھر اہلِ مشرق کے اضطراب سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے اِن کی طرف لپکے۔ جو شدید بے چینی آج کل مشرق میں رونما ہے۔ اس کے پیدا کرنے میں بلشویک پروپاگنڈے کا حصہ بھی ہے۔ اور خدا جانے وہ اپنی یورپی تاخت کے بعد ممالکِ ایشیا میں کیسی کیسی تباہیوں کا موجب نہ ہوگا۔ اور جس کے تاثرات روز افزوں ترقی پر ہیں +

مشرقِ جدید کے ہیجان کی تفصیل کیلئے ایک کتاب بھی کافی نہ ہوگی۔ بنابریں ہم یہاں صرف یہی کہنے پر اکتفا کریں گے۔ کہ بے چینی اور شدید اضطراب کی آگ کسی خاص طبقہ یا حصہ دنیا تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اِس کے شعلے نہ صرف ترکی۔ عربستان۔ اور ایران سے بلند ہو رہے ہیں بلکہ ہندوستان۔ افریقہ شمال۔ ترکستان اور جاوا اور سماٹرہ جیسے دور افتادہ اسلامی ممالک سے بھی اِس بے چینی کے ہندوستانی مظاہرات پر باب ہشتم آئندہ میں بحث ہوگی +

اسلامی اضطراب کی پہلی لہر مصر میں اُٹھی۔ انگریزی تدابیر کی سختی نے مصری جذبات کو دورانِ جنگ اچھی طرح سے قابو میں رکھا۔ گو عام خیالات کا جمود محض ظاہری تھا۔ ابتدائی ابواب میں مصریوں کے جذبات وطنیت کے متحرک ہونے کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ

اعتدال پسند طبقہ ارتقائی ذرائع سے مصری فلاح کا حامی تھا۔ اِس کا نصب العین یہ تھا۔ کہ جب تک انگریزی احتلال کے عارضی ہونے کے دعاوی میں اختلاف نہ ہو۔ اہل مصر بتدریج اپنی موجودہ حالت کو سنوار لیں اور پوری طرح سے تیار ہو کر موعودہ آزادی سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر ۱۹۱۴ء کے اعلان سیادت انگریزی نے جس کے رو سے مصر سلطنت برطانیہ کا مقبوضہ قرار دیا گیا صورت حالات کو بالکل بدل دیا۔ اب تو میانہ رو مصریوں کو بھی معلوم ہونے لگا۔ کہ اِن کے فلاح مستقبل کے تمام دروازے اِن پر بند کر دئے گئے ہیں اور اِن کے قومی نصب العین حصول استقلال تام کی اب کوئی اُمید نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اعتدال پسند فرقے کا وجود معدوم ہو گیا اور ساری کی ساری قوم انتہائی طرز عمل کے لئے مستعد ہو بیٹھی +

انتہا پسند جماعت تو ابتدا ہی سے قیام احتلال انگریزی کی دشمن تھی۔ اور اِس کے اور معتدل فریق کے نمائندے انجمن صلح پر مصری تمناؤں کی صداقت ذہن نشین کرانے کے لئے پیرس بھیجے گئے۔ یہاں اراکین انجمن نے اِن کے ساتھ سلوک کیا۔ تو یہ کیا۔ کہ اِن کا دعوے آزادی بالکل مسترد کر دیا۔ اور اتحادی اعلان حق محافظت برطانوی کی ایک نقل حوالے کر دی اِس بے عزتانہ طریق عمل کے جواب میں مصری وفد نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا اور حکومت انگریزی کو آنے والے خطرات پر خبردار کیا۔ "ہم نے اتحادی دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر وہ ہم پر بند رکھا گیا۔ فتح مند اتحادی سلطنتوں کے مدبرین کے وعدوں اور اعلانات حق خود اختیاری کے برخلاف وایں کہ جنگ کا اہم مقصد ملل ضعیف کی آزادی کی بحالی تھی۔ مگر اب انجمن صُلح انگریزی قبضہ مصر کو بلا استفتا قوم مصر عہد نامہ ورسائی و سینٹ جرمان میں مربوط کر کے اِس بدعہدی کی تصدیق کرتی ہے۔ ہم اراکین انجمن صلح کو جنہوں نے ہمارے قومی حقوق کے خلاف بدعہدی کر کے ایک شدید جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اِس کے ساتھ ہی قیام و تنظیم انجمن بین الاقوام کا اعلان کیا ہے۔ اِس امر سے آگاہ کرتے ہیں۔ کہ ملک مصر کے متعلق اِن کی ہر ایک کارروائی اور مصری قوم کے متعلق اِن کے فیصلہ جات کے وجود کو ہم قطعاً تسلیم نہیں کرتے اگر ایوان متحدین میں ہماری صدائے احتجاج کی شنوائی نہ ہوئی تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ محض اِس لئے ہے۔ کہ فتح مند اتحادی دوران جنگ کی خونریزی کو طرز عمل عہد سابق

کی جگہ قیام طرز عمل عہد جدید کے لئے کافی خیال نہیں کرتے"۔

اِن سطور کے شایع ہونے سے پہلے ہی مصری عملی شورش کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مصری وفد کے پیرس پہنچنے کے ساتھ ہی وطن پرست جماعت نے اپنے دعاوی کو انگریزی عمالان حکومت کے سامنے پیش کر دیا۔ اِن کے مطالبات یہ تھے۔ کہ انگریز ملک کی حکومت سے دست بردار ہو کر اپنی حدود اختیار معاملاتِ قرضۂ عامہ و نہر سویس تک محدود رکھیں۔ اِن مطالبات کی اہمیت کا اندازہ اِس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ مصری انجمن وزرا نے بھی جس کا تقرر بایا حکومتِ انگریزی ہوا تھا۔ اِن کی تائید کی۔ مصری وزیر اعظم رُشدی پاشا نے تو اپنے چند رفقا کے ساتھ لندن جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اِن معاملات نے انگریزوں کی پوزیشن مصر میں بدرجہ غایت نازک کر دی۔ مگر انہوں نے اِس کا جواب یہ دیا۔ کہ حکومتِ انگریزی جس کی حیثیت سیادت اب مسلمہ اُصول ہے۔ حفظ امن و قیام نظام سلطنت برطانیہ جس کا مصر ایک حصّہ قرار پا گیا ہے۔ ایسے وقت میں اختیار کُل سے دست بردار نہیں ہو سکتی اور وزیر مصر کا سفر انگلستان اور وہاں پہنچکر ناقابل قبول دعاوی کا اعادہ کوشش بے سود ہوگی"۔

اِس سے انگریزی روش کی سختی کا پتہ چلتا تھا۔ مگر اِس کے ساتھ ہی مصری طرز عمل میں بھی کمال درجے کی متانت اور استواری تھی۔ رشدی پاشا کی وزارت مستعفی ہو گئی۔ اور کوئی شخص مصری وزارت جدید کا بار اپنے سر پر لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ بنابریں انگریزی ہائی کمشنر جنرل اللنبی نے اختیارات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ دوران حال لیڈروں نے یہ اعلان کیا کہ اہل مصر کے خیالات کو جانچنے کے لئے رائے عامہ بذریعہ ووٹ لی جائیگی۔ انگریزی حکام نے اِس کارروائی کی ممانعت کر دی۔ مگر وطن پرستوں کے اعلان پر پورا عمل ہوا اور تمام قوم نے بزور و شور مصری لیڈروں کے مطالبات کی تائید کی۔ اِس آزادانہ روش نے انگریزی حکام کو اور بھی بھڑکا دیا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں انہوں نے قومی لیڈروں کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا۔

اِس سخت گیری کے جواب میں مصری وطنیت کے جذبات نے ایک شدید طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ ریلیں اور تاریں کاٹی جانے لگیں۔ انگریز افسر اور سپاہی مارے جانے لگے

صرف قاہرہ میں ہزاروں گھر لوٹ لئے گئے۔ اور صحرائی بدوؤں کی سرحدی تاخت نے ان خطرات کو اور بھی دوبالا کر دیا۔ چند ایک روز میں شدید ہیجان کی بجلیاں ملک کی ایک جانب سے دوسری جانب تک کوندنے لگیں۔ اور خود انگریزوں نے پارلیمنٹ میں تسلیم کیا۔ کہ اہل مصر کی مخالفت حکومت انگریزی اب سارے ملک میں سرایت کر چکی ہے۔

انگریزی اہلکاروں نے اس حالت میں مستعدی سے کام کیا۔ سودان سے قابل اعتبار پلٹنیں مصر میں بھیجی گئیں۔ اور مقامی مصری پولیس نے کم و بیش احکامات کی تعمیل کی اور بعد کثیر کشت و خون ملک میں امن بحال ہوا۔

لیکن امن کی بحالی نے اصل مسائل میں کچھ تغیر نہیں ہونے دیا۔ اور یہ امن بھی کثیر التعداد انگریزی اور مصری سپاہ کی موجودگی سے قائم ہو سکا۔ اور شدید وضع کے "مارشل لا" سے بھی مظاہرات بند نہ ہوئے جو آئے دن شدید نقصان جان کے باوجود ہوتے رہے۔ سب سے زیادہ پرخطر یہ بات تھی۔ کہ صرف اعلیٰ طبقے کے لوگ ہی وطن پرست نہ تھے۔ بلکہ لاکھوں فلاحین اور عوام جن کے ساتھ دوران جنگ میں کچھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا ضروریات جنگی کی وجہ سے انگریزوں نے کم و بیش ایک دو مصریوں کو مزدوروں کے طور پر زبردستی بھرتی کر کے مشرق قریب اور یورپ میں کام پر لگایا تھا۔ اور فوج کی خورد نوش کے لئے غلے اور غذا کی بڑی بڑی مقدار بجبر حاصل تھیں۔ اہل بینش انگریز ان حالات کو دیکھ دیکھ کر سہمے جاتے تھے۔ شورشوں کے تھوڑے ہی دن بعد ولیم ولکاکس انجینیر نے کہا۔ مصر میں انگریزی حکومت کی بنیاد صرف یہی تھی۔ کہ فلاحین اس کے خیر خواہ تھے۔ شیوخ عمدہ۔ اور امرا کی رائے خواہ کچھ ہو۔ مگر فلاحین اجنبی حکومت سے مطمئن تھے۔ مگر آج انگریز فلاحین کی دوستی کو ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں۔ ولنٹائن چرل نے اسی طرح پیپر ٹیمز میں لکھا۔ تاریخ قبضہ انگریزی میں یہ پہلا موقعہ ہے۔ کہ فلاحین کا ایک کثیر حصہ جن کو ہماری ذات سے بہ نسبت کسی اور طبقہ کے زیادہ فوائد پہنچے ہیں۔ اب ہمارا دشمن بن گیا ہے۔ انگلستان میں بہت کم لوگ حالات کی اس پریشان کن صورت سے آگاہ ہیں۔ جو آج کل مصر میں پیدا ہو گئی ہے۔

تمام غیر ملکی افراد وطن پرستوں کے جذبہ اتحاد سے عام اس سے کہ وہ کسی طبقہ یا مذہب سے انکا تعلق ہو۔ بے حد متاثر ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے گرما میں ایک عظیم الشان مظاہرہ ہوا۔ اس کے متعلق ایک

ایک اطالوی لکھتا ہے۔ تاریخ مصر میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ صلیب کے ساتھ ہلال ملا ہوا ہے۔ اِس زمانے سے پہلے مصری عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایسا ہی اختلاف تھا جیسا کہ ہندوؤں کا اور یہودیوں کا۔ مگر آج حالات متغیر ہو چکے ہیں۔ جیسے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے کیا ویسے ہی مصریوں نے جن کے مذہبی اختلافات اب اِن کے عہد ماضی کی داستان ہو چکی ہے۔ آج ہر ایک مصری کے دل میں ایک ہی جذبہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آخر کار اُن کی فتح ہو کر رہیگی ایک فرانسیسی عورت جو ایک عرصے سے مصر میں مقیم تھی یوں لکھتی ہے۔ اِس ملک مصر میں جس کے مذہبی اختلافات کی کوئی حد نہ تھی۔ ہم نے عجیب و غریب حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔ آج قبطی پادری مساجد کے منبروں پر سے وعظ کہہ رہے ہیں۔ اور علمائے اسلام عیسائی گرجوں میں تقریریں کر رہے ہیں تمام مرد اور عورتیں خواہ وہ مصری ہیں یا ترک وادی نیل پر طلوع شمس آزادی کے لئے دستِ بدعا ہیں۔ میں نے خدیو توفیق پاشا کا زمانہ بھی دیکھا ہے۔ اور زمانہ حال کا جو سب سے حیرت انگیز انقلاب میرے دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ عورتوں کی حالت ہے۔ سنین سابقہ میں انہیں سیاسیات سے کچھ سروکار نہ تھا۔ مگر آج کی حالت یہ ہے کہ گذشتہ گرما میں ایک زنانہ مظاہرہ کے موقعہ پر انگریزی فوج کے سپاہی سنگین چڑھائے ہوئے ان عورتوں کے مجمع پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مصری خاتون سینہ کھول کر ایک سپاہی سے یوں کہنے لگیں۔ میں تمہاری سنگین کی موت سے مطلق نہیں ڈرتی تم اگر مجھے مار دوگے۔ تو میں مس کیول ثانی ہو جاؤں گی۔

اِن حالات غیر متوقعہ کے روبرو انگریزی پبلک کے افراد دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ جن کے لیڈر ونسٹن چرچل اور ولیم دلکاس جیسے لوگ تھے۔ جو خطیر رعائتیں دینے کی پالیسی کے حامی تھے۔ اور دوسرا گروہ جس کا نمائندہ ایم [illegible] تھا۔ کہتا تھا۔ رعائتوں کی پالیسی کمزوری کی نشانی ہوگی۔ اگر مصر سے صرف ایک دن کے لئے انگریزی قبضہ اُٹھ جائے۔ تو وہ پھر اسی پریشانی کے گڑھے میں جا پڑیگا۔ جس سے ہم نے نکالا تھا۔ اُس نے یہی صلاح دی۔ کہ حکومت انگریزی کو اقتدار مصر ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ اِن مصری حالات کا انگلستان میں گہرا اثر پڑا۔ اور پارلیمنٹ نے ایک تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا جس کا افسر لارڈ ملنر اور اس کی غرض حالات مصر کی چھان بین قرار پائی۔

لارڈ ملنر کا تقرر عاقلانہ تھا۔ یہ شخص انگریزی سیاسی زندگی میں قابلِ فخر حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ نہ اس کی روش محض نفظی لبرل ازم اور نہ شعبدہ رجعت پسندی کی متحمل تھی۔ اور اس کو نظامِ حکومت کے مختلف پہلوؤں کا خاصہ تجربہ تھا۔ لارڈ ملنر میں ہر اسلوب سے حقایق کو تسلیم کرنے کا مادہ موجود تھا۔ تحقیقاتی کمشن ۱۹۲۰ء میں مصر پہنچا۔ اور اس کو ایک شدید دقّت کا سامنا کرنا پڑا۔ مصر کے ہر چہار سمت میں منادی کر دی گئی تھی کہ تحقیقاتی کمشن سے مقاطعہ کیا جائیگا چنانچہ ایسا ہی ہوا نہ صرف عوام بلکہ مفتی اعظم جیسی جلیل القدر شخصیت نے بھی ملنر سے ملنے سے انکار کر دیا۔ تاوقتیکہ کمشن کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے آزادی مصر کا اعلان نہ کر دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے ملنر کو ایک بات بھی کرنے کا موقع نہ ملیگا۔ آخر بہر صورت ملنر کو رائے عامہ کے رہبر سعد زغلول پاشا اور دیگر وطن پرست لیڈروں سے صاف صاف تبادلہ خیالات کرنے کا موقعہ ملا۔

بعض عجیب و غریب واقعات نے بھی ان کوششوں کی تائید کی۔ اور وہ یہ تھے۔ مثل اور ممالک کے مصر میں بھی نہ صرف سیاسی بلکہ معاشرتی بے چینی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ نئی وضع کے مفسدہ پرداز پیدا ہو رہے تھے۔ جو خلقت کو نہایت ہی خطرناک صورت فساد پر آمادہ کر رہے تھے۔ ان نوجوانوں کی حرکات سے متاثر ہو کر مصری لیڈر جن کو نہ صرف اپنی لیڈری بلکہ حیثیت اور جائداد بھی رکھنی تھی۔ اس قسم کے انتہائی انقلاب کی روک تھام کی تدابیر سوچنے لگے۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ۱۹۲۰ء کے موسم گرما میں لارڈ ملنر اور سعد زغلول پاشا نے ایک قابلِ عمل صورت فیصلہ کا اصول قائم کیا۔ اخبارات کی رپورٹوں اور خود لارڈ ملنر کے شائع کردہ اعلان کے مطابق اس فیصلہ کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں تخلیہ مصر و اعلان خود مختاری مصر جس پر صرف اسی قدر خارجی اثر ہو جتنا کیوبا میں جمہوریہ امریکہ کا ہے۔ نفاذ حکومت خود اختیاری و اخراج اہلکاران اجنبی دیوانی و جنگی نفاذ عہد نامہ استمراری جس کے رو سے مصر کو کسی اجنبی طاقت سے بلا استمزاج برطانیہ عہد نامہ کرنے کا مجاز نہ ہو۔ اور مصر برطانیہ کو نہر سویس اور مصر کی حفاظت کے اختیارات اور بنا اسٹیشن جہازات ہوائی کے لئے ایک خطہ زمین عطا کرے مسئلہ سوڈان فی الحال معرض التوا میں ڈال دیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ تجاویز شاید ایک قابلِ قبول طریق عمل کی بنیاد بن سکیں۔ بدقسمتی سے ان پر فوراً عمل نہ کیا گیا۔ اور مصر اور انگلستان دونو ممالک میں ان کی مخالفت ہوئی۔ انگلستان

میں آزادیٔ مصر کے مخالف آراء کے اثر سے ملنر رپورٹ فروری ۱۹۲۱ء تک اول تو شائع ہی نہیں ہوئی۔ اور دوسری طرف انتہاپسند مصری وطن پرستوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ مگر دور اندیش مصری اس کی حمایت میں تھے۔ کمشن کی رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت خود اختیاری کا نفاذ اب کسی طرح سے ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کہ جذبہ وطنیت اب کسی طرح سے مر نہیں سکتا اور مخالفت جمہور کے ہوتے ہوئے مصر پر دعوئے حکومت نہایت ہی مشکل اور قابل ملامت فعل ہوگا۔ اور اگر انفصال مسائل حائلہ کو چندے اور ملتوی کیا گیا تو قیام امن میں مشکلات کا اضافہ ہو جائیگا۔ حکومت انگریزی نے اس رپورٹ کو من وعن قبول نہ کیا اور لارڈ ملنر نے اپنا استعفا داخل کر دیا۔ زغلول پاشا کی حیثیت بحیثیت لیڈر مصر اب تک قائم ہے بلکہ وہ قابینہ جدید کا صدر قرار دیا جا چکا ہے۔ باوجود اس کے آج مصر کی حالت پہلے سے زیادہ قابل اطمینان نہیں +

طوفان وطنیت کے بادل جو مصر پر گرجے اور خوب برسے اب فضائے مشرق کے اور حصص کی طرف بڑھے۔ اور تموج حالات کا مرکز ترکی ہو گیا۔ اس حادثے کا باعث تمام تر اتحادیوں کی بدکرداریاں تھیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں۔ کہ مشرق قریبہ کے ممالک کے لئے کسی قسم کی پائیدار حکمت عملی کی دریافت ایک مشکل امر ہے۔ مگر یہ کوشش کامیاب بھی ہو سکتی۔ اگر اتحادی نیتوں میں کسی طرح کی صفائی ہوتی جنگ کے اختتام پر کئی ایک اقوام سابق رعایا دولت عثمانیہ کو یقین تھا۔ کہ اتحادی وعدوں کا زمانۂ ایفا آ پہنچا ہے۔ ان میں سے عرب بالخصوص ان امیدوں میں مگن تھے۔ جن سے دوران جنگ لمبے چوڑے وعدے کر کے خطیر جنگی امداد حاصل کی گئی تھی (اور جو وعدے اب شیشہ صد پارہ کی شکل چکنا چور ہو چکے ہیں) ان کے علاوہ ترک بھی اپنی شکست سے اس قدر مایوس نہ تھے۔ صدر جمہوریہ ولسن کی شرائط چہاردہ کے علاوہ خود وزیر برطانیہ لائیڈ جارج نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔ "اور نہ ہم اس لئے برسرپیکار ہیں۔ کہ ترکوں کو ان کے دارالخلافت قسطنطنیہ سے اور ان کی تاریخی آماجگاہ ایشیائے کوچک اور طراقیا سے جن کی آبادی کا کثیر حصہ ترک ہیں محروم کر دیں"۔ دوسرے الفاظ میں ترکوں پر یہ واضح کر دیا گیا تھا۔ کہ سلطنت عثمانیہ کے غیر ترکی علاقوں کی بحالی تو ناممکن ہوگی مگر آل عثمان اپنے آبائی مقامات میں بدستور رہ سکیں گے۔ ترکوں کو ۱۹۱۵ء کے خفیہ عہد ناموں کا مطلق علم نہ تھا۔ جن کے رو سے ساری کی ساری سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دئے گئے تھے۔ مگر ان کا راز ابھی تک

افشا نہ ہوا تھا۔ اور ترکوں کی امیدیں قائم رہیں ⁂

عربوں کو اپنی امیدیں بر لانے کا ترکوں سے کہیں زیادہ یقین تھا۔ اور ان کے متعلق بالخصوص اتحادیوں کے منصوبے زیادہ گہرے اور زیادہ ناپاک ثابت ہوئے۔ شریف مکہ کی بغاوت سنہ ۱۹۱۶ء کا جس کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کے تمام عربی مقبوضات اس کی حدود سے نکل گئے اور ترکی فوج کو شدید نقصانات کا متحمل ہونا پڑا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس بغاوت کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ یہ کچھ ناگہانی یا خلاف توقع حادثہ نہ تھا۔ اس کے تمام پہلوؤں پر پورا غور ہو چکا تھا اور اتحادی امداد نے اسے عملی صورت دینے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ جنگ کے ابتدائی ایام سے چند عرب لیڈر انگریزی حکام سے مصر میں ساز باز کر رہے تھے۔ کیونکہ ہر قسم کی عربی شورش نہ صرف مصر اور نہر سویس کی حفاظت کا موجب بلکہ ترکی علاقے پر حملے کرنے کا بہترین ذریعہ ہو سکتی تھی ⁂

مگر عربوں نے صرف نقد رشوت کو کافی نہیں سمجھا۔ انہوں نے اتحادیوں سے یہ وعدے لیا کہ اختتام جنگ پر تمام عربی ممالک کو ایک سلطنت کی صورت میں قائم ہو جانے دیا جائیگا۔ مگر انہیں ممالک میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی اپنی خاص اغراض بھی تھیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ان ملکوں کو اپنے حلقۂ اثر میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انگریزی حلقہ اثر عراق کے جنوب میں بصرہ پر تھا۔ اور فرانسیسی دائرۂ اثر شام میں جبل لبنان پر تھا۔ جس کے باشندے مذہباً رومن تھے۔ اور جس پر فرانس نے اپنا حق حفاظت جما رکھا تھا۔ گو یہ دونو مقامات ترکی سلطنت کے حصے تھے۔ مگر یورپی سیاسیات میں حقوق یا قانونی رواداری کا دخل نہیں۔ حالات مساعد کے پیدا ہونے پر انہیں مقامات کی حدود کہیں سے کہیں جا پڑتی تھی۔ چنانچہ انگریزی اور فرانسیسی نظارتہائے خارجہ نے یہ تدبیر سوچی کہ شام کو فرانسیسی حلقہ اثر قرار دیا جائے۔ جس کے بدلے عراق انگریزوں کے زیر اثر ہو۔ مگر ان علاقہ جات کی حدود فی الحال قائم نہ کی جائیں اور عہد نامہ ترکی کے اثنائے بحث میں دولت عثمانیہ کے خلاف ہر دو فریق یعنی فرانسیسی اور انگریز اس قسم کے دعاوی پیش کریں۔ جن کی بنا پر اس کے عربی مقبوضات خود بخود تقسیم ہو کر ان متحدین کی دامن میں آ پڑیں ⁂

اس خفیہ عہد نامے کے ہوتے ہوئے انگریزی حکام مصر کو بہت کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر عربی بغاوت ایک نہایت ہی نایاب نعمت تھی اور اس کا کھو دینا مہلک ثابت ہوتا لہذا

لہٰذا من حیث المجموع انگریزی عربی معاہدے سے ایسی صورت پیدا ہو سکی جس سے عربوں کو اتحادیوں کی دو رُخی کا پتہ نہ چلے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو شریف مکہ کے نائبوں کو سر ہنری مکموہن برطانوی ایجنٹ مقیم مصر نے ایک دستاویز دی۔ اس دستاویز کے رو سے انگریزوں نے خود مختار عربستان کو باستثنا بصرہ اور وہ مقامات جہاں انگریز فرانسیسی مصالحہ کو صدمہ پہنچائے بغیر وعدہ نہیں کر سکتے۔ قبول کر لیا۔ دستاویز کی آخری دفعہ محض دھوکے کی ٹٹی تھی۔ مگر اس سے مطلب نکل آیا۔ عرب جن کو انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خفیہ عہد نامے کا قطعاً علم نہ تھا۔ اس شرط کو فرانسیسی حقِ حفاظت لبنان سمجھے رہے اور یہ امید لئے ہوئے کہ خوشی خوشی گھر سدھارے۔ کہ اِن کی دیرینہ مراد بر آئی۔ اور ایک وسیع پیمانے پر بغاوت کا انتظام کیا۔ جو نہایت موثر اور کامیاب ثابت ہوئی۔

یہ بغاوت ۱۹۱۶ء میں شروع ہوئی۔ مگر اس میں قطعاً کلام نہیں۔ کہ اگر عربوں کو انگریزی فرانسیسی خفیہ عہد نامے کا ذرا بھر علم ہوتا۔ تو وہ زنہار زنہار ترکوں کے خلاف سرکشی نہ کرتے۔ اسی مہینے یعنی مئی میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ایک اور عہد نامہ مرتب ہوا جس کا نام سائیکس پیکو عہد نامہ ہے۔ اس عہد نامے کے رو سے سلطنت عثمانیہ کے عربی مقبوضات قطعی طور پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان تقسیم کر دئے گئے۔ اس کی شرائط کے مطابق عراق تمام تر برطانوی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ اور شام طیر سے سکندروں تک قطعی طور پر فرانسیسی مقبوضہ بن گیا جس میں آرمینیا اور ایشیائے کوچک کے وسیع قطعات شامل کر دئے گئے۔ فلسطین کی حیثیت بین الاقوامی قرار دی گئی۔ مگر اس کا بندرگاہ حیفہ برطانوی مقبوضہ قرار پایا اور من حیث المجموع ارض مقدس زیر سیادت برطانوی رکھی گئی۔ عراق اور شام کا درمیانی حصۂ ملک جو زیادہ تر ریگستان تھا۔ زیر اثر فرانسیسی و انگلستان آزاد قرار دیا گیا۔ فرانسیسی حلقہ اثر میں باقی ماندہ علاقہ شام یعنی دمشق اور اس کے درمیانی مقامات کر دئے گئے۔ اور انگریزی حلقہ اثر میں باقی ماندہ عراق یعنی موصل دے دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں سر ہنری مکموہن کا وعدۂ آزادی کافور ہو گیا۔

مگر اس پس پشت قرارداد کی اطلاع عربوں کو مطلق نہیں دی گئی۔ برخلاف اس کے اِن کے جوش کو ابھارنے کے ہر ممکن ذرائع کام میں لائے گئے۔ تاکہ وہ خوب جانبازی کے ساتھ ترکوں کے خلاف لڑیں۔ انگریزی حکومت نے صیغہ راز کے چند نہایت منتخب افسروں کو عربوں کے

پاس بھیجا۔ جن میں سے ایک کرنیل لارنس نے تو عربوں پر اس قدر اثر قائم کر لیا۔ کہ اس کا نام عربی بغاوت کی روح ہو گیا۔ یہ لوگ جو کہا جاتا ہے۔ عربوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ملکو بتہائے انگریزی و فرانسیسی کی خفیہ قراردادوں کے علم سے محروم رکھے گئے۔ تاکہ ان کی ایمانداری ان کے فرائض کی سرانجام دہی میں مارج نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں انگریزوں کیا انہوں نے بھی دل کھول کر اعلانات شائع کئے۔ جن سے عربی خود مختاری کے وعدوں کا اعادہ ہوتا تھا۔ اور ان میں سب سے موخروہ اعلان تھا۔ جو جنگ کے اختتام پر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے شائع کر کے دیار عربی کے چپے چپے پر چسپاں کیا۔ "اتحادیوں کا اصلی مقصدِ جنگ یہ تھا۔ کہ جرمنی تمناؤں کو برباد کر دیا جائے اور ان ممالک کی آزادی اور خود مختاری بحال کی جائے۔ جو سلطنت ترکی کے زیر استبداد تھیں کہ وہاں کے لوگ آزادانہ اپنے طریق پر نظام حکومت کی بنیاد رکھیں"۔

اتحادی سیاسی فریب کے اس آخری عمل کے جلد ہی بعد صورت حقیقت پر سے پردہ اُٹھا دیا گیا۔ جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ دشمن کو شکست ہوئی۔ اور اس حیرت انگیز ڈرامہ مکر و فریب کا آخری باب ادا ہو چکا۔ اور جب پردہ نیچے گرا۔ تو عربوں نے اُس پر اپنی جہالت اور فریب خوردگی کی یاس انگیز تصویر دیکھی۔ فرانسیسی سپاہ شامی سواحلی مقامات پر قابض ہونے کے بڑھی۔ خفیہ عہدنامے شائع کر دئے گئے۔ اور عربوں پر اتحادی مکر کی حقیقت آشکار ہوئی۔ ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ ان کی انتہا درجے کی مایوسی کا اظہار ایک انقلاب انگیز طوفان کی صورت میں ہوا ہی چاہتا تھا۔ کہ عربی شیوخ اور امیر فیصل نے ان کو دلاسا دیا۔ فیصل کو اتحادیوں کی فوجی طاقت کا علم تھا۔ اور اس نے بھانپ لیا۔ کہ اگر فیصلہ تلوار کے سپرد کیا گیا۔ تو عرب نیست و نابود کر دئے جائیں گے۔ عربوں کے دعاوی کی اخلاقی قوت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اُن کے نمائندین سے پیرس کی انجمن صلح کے سامنے ان کے مطالبات کو پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ ۱۹۱۹ء میں عربستان میں امن تو تھا مگر عربوں کے دل غصے سے اُبل رہے تھے۔

امیر فیصل نے پیرس کانفرنس کے سامنے اپنے دعاوی فصاحت اور متانت کے ساتھ پیش کئے۔ لیکن اس کی شنوائی نہ ہوئی۔ ضابطہ اتحاد بین الاقوام کی ایک دفعہ نمبر ۲۲ تھی جس کے رو سے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ کہ دولت عثمانیہ کے بعض صوبے آزادی کے مستحق ہو چکے ہیں۔ مگر

اِن کی حکومت خود اختیاری کی رہنمائی بعض مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں رہیگی۔ تاوقتیکہ وہ کامل طور پر اپنے آپ کو خود مختاری کا اہل ثابت نہ کریں۔ مگر اہل عرب اِس مغربی رہنمائی کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ لارڈ بالفور کے ایسے کلمات کہ عربوں نے اپنے وعدوں کا ایفا کر دیا ہے۔ اور ہمیں اپنے وعدوں کی تکمیل کرنی چاہیئے بگفتیم فرانسیسیوں نہیں۔ مگر اب اِس کا اثر عربوں کے دلوں پر کچھ نہ تھا کیونکہ انہوں نے خفیہ عہدناموں کی قرادادیں معلوم کر لی تھیں اب عربوں کو یہ صاف طور پر نظر آنے لگا کہ انہیں کلیتاً اپنے زور بازو پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ خواہ اِس کا طریق عمل سیاست ہو یا نبرد آزمائی؛

فیصل اب تک طریق احسن کا حامی تھا۔ اور اِس کی یہ پالیسی دو وجوہات پر مبنی تھی۔ ایک تو عربی طاقت کی کمی اور دوسرے اتحادیوں کی آپس کی نزاعات یہ نزاعات یوں تو تمام حصص دنیا پر پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر اِن کا نمایاں اثر انگریزوں اور فرانسیسیوں کی عربی لیٹ کی تقسیم پر ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی ابتدائی وجہ یہ تھی۔ کہ خفیہ عہد ناموں کی رعایات سے حکومت فرانس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ جونہی سائیکس پیکو عہد نامے کی شرائط شائع کی گئیں۔ تو بعض فرانسیسی حلقوں میں یہ صدا بلند ہوئی۔ فرانس کو دھوکا دیا گیا ہے۔ کئی سالوں سے فرانس میں شام پر فرانسیسی حقوق کا شور وغوغا ہو رہا تھا۔ اور کئی ایک پرجوش مدعیانِ امپیریل ازم تو یہ چاہتے تھے۔ کہ مشرق قریبہ کا معتدبہ حصے کا الحاق سلطنت فرانس سے بزور کر دیا جائے اِن کا نعرہ جنگ شام تمام تھا۔ اور خفیہ عہد نامے کے روسے صرف سواحلی مقامات کے قبضے سے اِن کی تسکین نہ ہوتی تھی بلکہ وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ فلسطین و حلب۔ دمشق کے تمام علاقہ جات بشمولیت اضلاع روغن زمین متصل موصل فرانس کے حوالے کر دئے جائیں۔ فرانسیسی مریضانِ جوع الارض کا یہ دعوے تھا۔ کہ یہ علاقے فرانسیسی لوانٹ ہیں۔ اور اِن پر فرانسیسی استحقاقات محاربات صلیبی بلکہ شارلین کے زمانے سے قائم ہیں۔ شام الساس ثانی ہے۔ اور شام فرانس کی طرف امید کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ فرانسیسی اِسے چھوڑ نہیں سکتے۔ ۱۹۱۵ء میں مسٹر بیگ نے فرانسیسی مجلس کے سامنے کہا تھا۔ فرانسیسی پالیسی کا محور بحیرہ روم ہے۔ اور اس کی ایک بنا مغرب میں الجزائر تیونس اور مراقش میں قائم ہے۔ اور دوسری شام۔ لبنان اور فلسطین میں ہونی چاہیئے؛

ایسی ایسی امیدوں کے ہوتے ہوئے فرانسیسی رائے عامہ پر قرارداد سائیکس پیکو کے اثر کا اندازہ آسانی سے لگ سکتا ہے۔ اور ہر ایک بات کے ذمہ دار جو عربستان میں ہو رہی تھی۔ انگریز قرار دئے جاتے تھے ایک فرانسیسی اہل قلم لکھتا ہے۔ ماہرین علم دماغ کو چاہیئے کہ مقبوضات برطانیہ کے انگریز اہلکاروں کی دماغی ساخت کا مطالعہ کریں۔ یہ لوگ نہ کسی حکم بالا کی پرواہ کرتے ہیں۔ اور نہ اپنے افعال کی تصدیق لندن سے کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی اغراض میں منہمک ہر جگہ فرانسیسی اقتدار کو اسطرح پامال کر رہے ہیں جیسے کہ انہوں نے مصر میں کیا تھا۔ اس کے جواب میں انگریز فرانسیسیوں پر لالچ اور بے جا حرص کی تہمت باندھتے تھے۔ اور مشرق کی پر منظر حالت کا ذمہ دار ان کو قرار دیتے تھے۔ قصہ مختصر آج انگریز اور فرانسیسی ایام جنگ کا عہد دوستی دوام کچھ دن ہوئے ایک دوسرے سے جوتی پیزار پر اتر آئے تھے۔ اور عرب اور دیگر اقوام مشرق ان حالات کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

اس حالت کے ہوتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں اتحادی کچھ بھی سرانجام نہ کر سکے اور ۱۹۲۰ء میں جا کر کہیں کچھ فیصلے کی صورت نظر آئی۔ سان ریمو میں اتحادی وزرا کی انجمن مرتب ہوئی۔ اور اس میں ایشیائے کوچک کو حصص زیر اثر کے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور دولت عثمانیہ کے عربی مقبوضات کو حق حکمبرداری کے پردہ تذویر میں ڈھانپ کر آزاد کر دیا گیا فرانس انگلستان اور ان کا پٹھو یونان اس طریق عمل کی تکمیل کی تیاری میں لگ گئے۔ فرانسیسی کمک شام کو بھیج دی گئی۔ انگریزی افواج عراق اور فلسطین کو روانہ ہوئیں۔ انگریزی اور فرانسیسی فوجیں قبضہ قسطنطنیہ کے لئے تیار ہوئیں اور یونانی وزیر وینی زیلوس نے تسخیر ایشیائے کوچک کے لئے فوجی کارروائی کا ذمہ اٹھایا۔ صرف اطالیہ اس طریق عمل کا مخالف تھا۔ جس کے وزیر نے برملا کہا۔ کہ اطالیہ اس کارروائی کے لئے نہ تو ایک سپاہی روانہ کریگا۔ اور نہ ایک حبہ ادا کریگا اتحادیوں نے ترکوں سے ان کا مقدس شہر اور نہ لے لیا ہے۔ ان کے دارالخلافت پر اتحادی اقتدار قائم کر دیا ہے۔ اور ان کی عظیم الشان سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہر اور ساحلی مقامات پر اپنی فوجیں بٹھا دی ہیں۔ اب اگر ایسے پانچ ترکی نمائندے جن کا انتخاب اتحادی کریں گے۔ عہد ترکی پر دستخط کر دیں۔ تو وہ دستخط ان کے اپنے ہوں گے نہ کہ ترکی قوم کے اور

یہ تمام منصوبے بے معنی ثابت ہوں گے +

اطالوی وزیر نٹی کی پیشین گوئی صحیح نکلی۔ ترک احرار جن کو آنے والے امکانات کا علم تھا۔ اندرون ایشیائے کوچک میں اپنی حربی طاقت کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ انور پاشا اور ان کے ہمراہی تو اب قفقاز میں تھے۔ مگر ترکان احرار کی رہنمائی اب ایک نوجوان افسر کے ہاتھ میں تھی جس نے اپنے فوجی کمال اور شجاعت کا دوران جنگ پورا پورا ثبوت دیا تھا۔ اس نوجوان کا نام مصطفےٰ کمال پاشا ہے۔ سان ریمو کی قراردادوں کے شائع ہوتے ہی مصطفےٰ کمال پاشا نے ایک منظم فوج آراستہ کی اور اپنے صدر مقام انگورہ سے اتحادی منصوبوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس احتجاج کے عملی ثبوت میں اس نے فرانسیسیوں پر جو سلیسیہ پر قبضہ کئے ہوئے تھے حملہ کر دیا۔ اور ان کو شدید شکست دی +

عرب بھی عملی کارروائی میں لگے ہوئے تھے۔ مارچ میں شامی کانگرس نے دمشق میں بلا اختلاف شامی خود مختاری کا اعلان کر کے امیر فیصل کو شاہ شام تسلیم کر لیا۔ اس فعل نے سارے عربستان میں جوش امید برپا کر دیا۔ فرانسیسی علاقے میں شورشیں ہونے لگیں۔ فلسطین کے نو وارد یہودیوں کی وہاں کے مسلمان اور عیسائی عربوں نے مخالفت شروع کی۔ اور عراق میں لوگ انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے +

اس عربی ہیجان کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حکمبردار طاقتوں نے جنگی طریق عمل اختیار کر لیا۔ فرانسیسیوں نے شام میں ایک لاکھ فوج بھیج دی۔ اور اُس کو کمان جنرل گورو کو دی۔ جو ایک تجربہ کار کونیل افسر تھا۔ اور عمل شدید کا حامی تھا۔ جولائی کو جنرل گورو نے فیصل کو یہ انقطاعی حکم بھیجا۔ اطاعت غیر مشروط کرو۔ فیصل نے یہ حکم تو قبول کر لیا۔ مگر گورو نے اس حکم کی رسید و تعمیل میں ذراسی تاخیر سے فائدہ اُٹھا کر ساٹھ ہزار لشکر کو دمشق پر دھاوا کرنے کا حکم دے دیا۔ فیصل طرح جنگ ڈالے بغیر محض فرانسیسی زد کو روکتے ہوئے صحرا کی طرف اُٹھ بھاگا۔ ۲۵ جولائی کو فرانسیسی دمشق میں داخل ہو گئے۔ اور فیصل کو معزول کر کے سارے ملک پر کامل فرانسیسی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ مخالفین کو شدید سزائیں دی گئیں۔ اور جرمن طریق عمل کے مطابق بلدہ دمشق پر ایک کروڑ فرانک جرمانہ لیا گیا۔ اور جنرل گورو نے اعلان کیا۔ اگر ایک فرانسیسی یا ایک عیسائی کا بال بیکا ہوا۔ تو اس کی جگہ اس مقام کے تمام مسلمانوں کو بمبوں سے اُڑا دیا جائیگا +

اِس صدمہ برق کے نیچے شامی عرب سہم کر کچھ عرصے کے لئے دب گئے۔ عراق میں انگریزوں پر زیادہ مصیبتیں آئیں۔ کئی مہینوں سے عربوں کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ اور انگریزی کیدان نے پُرخطر امکانات کی اطلاع اپنی حکومت کو دے دی تھی۔ جولائی میں ایک لاکھ فوج کے ہوتے ہوئے ایک شاید عربی شورش برپا ہو گئی ۔

اِس دوران میں اتحادیوں نے ترکی عہد نامے کو قبول کرانے کے لئے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تھا یہاں کسی قسم کی مدافعت نہ ہو سکی۔ کیونکہ شہر اتحادی بیڑے کی توپوں کی زد میں تھا۔ مگر لکھو کھہا ترکوں کی خاموشی سے جس سے انہوں نے اتحادی سپاہیوں کو شہر پر قابض ہوتے دیکھا اتحادی حکام کے دلوں پر خوف سا چھا گیا۔ ایک فرانسیسی اخبار نویس اِس واقعہ کے متعلق یوں لکھتا ہے۔ اِس لب بند بے بس مایوس گروہ مسلمین میں چند ایک ایسے لوگ بھی تھے۔ جو اس مصیبت کی داستان کو اسلام کے ہر چہار گوشوں میں لے جانے والے تھے۔ چند گھنٹوں میں وہ انگورہ پہنچ جائیں گے۔ اور تھوڑی ہی اور دیر میں وہ قونیہ۔ سواس میں اِس منحوس خبر کو پھیلا دیں گے۔ اور چند دنوں میں بلشویک حلقہ ہائے اثر میں یہ اطلاع پہنچ جائے گی۔ اور وہاں سے قفقاز میں سے ہوتی ہوئی اِس کی صدائے بازگشت وسطِ ایشیا کے بیابانوں سے آئے گی۔ ایشیا اور افریقہ اِس بدقسمتی سے ایک نئے اتحاد میں مربوط ہو جائینگا سمجھ دار لیڈر عوام کے کانوں میں اتحادی بدکرداریوں کی داستان دہرائیں گے۔ ایسے لوگ جو تعلیم یافتہ اور اہل ثروت ہوتے ہیں۔ مگر وہ معمولی درویشوں کی طرح اسلامی تباہی کی منحوس خبروں کو دنیائے اسلام کے دور دراز گوشوں میں پہنچا کر انتقام جیسے پُرخطر جذبات کو مشتعل کریں گے ۔

حوادث ترکی سے اطالوی وزیر کی پیشین گوئی کی تصدیق ہونے لگی۔ قسطنطنیہ کے اتحادی مالکوں نے بے بس سلطان کو ایک بے غیرت اور بے اصول انجمن وزرا مرتب کرنے کا حکم دیا۔ اِس انجمن نے بطلِ حریت حمیت مآب اعلےٰحضرت مارشل غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو باغی قرار دیا۔ اور نام نہاد تین ترک خبیثوں کی ہیئت کو پیرس جا کر اتحادی فرمان کے مطابق عہد نامہ سیورے پر منقوطہ مقام پر بحیثیت نمائندگان دولت علیہ عثمانیہ دستخط کرنے کا حکم دیا۔ اِس طور سے اتحادی گویا صفحۂ قرطاس پر سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے۔ لیکن ماسوا اِن کے ہر ایک سمجھدار آدمی جانتا تھا۔ کہ یہ سب کچھ ناٹک ہے۔ اور یہ کہ سلطان نہ سے کر دنٰے سے ادنےٰ منشی وطنیت پرست ترک ہے۔ ترکی خارجی افغانستہ

اب انگورہ ہے نہ کہ قسطنطنیہ۔ اور یہ کہ اتحادی قوت اِن کی توپوں کی زد سے آگے نہیں جا سکتی۔ اور عہد نامہ سیورے کے متعلق تو بطلِ حریت غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے یہ کہہ چھوڑا تھا۔ ہم تا دم واپسیں تلوار کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔

اتحادیوں کی حالت اب بے حد نازک تھی۔ اور اتحادیوں کے گروہ میں اب صرف انگلستان اور فرانس ہی رہ گئے تھے۔ کیونکہ اطالوی وزیر نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ اطالیہ نہ تو ایک سپاہی اور نہ ایک حبّہ ہی اِس کار بد کے لئے دیگا۔ اتحادیوں کے کم و بیش تین لاکھ سپاہی عربوں کو دبائے ہوئے تھے۔ اور اسلامی ممالک میں فسادات کی علامات ہوتے ہوئے صرف ترکی تسخیر کے لئے تین لاکھ جوان اور درکار تھے۔ البتہ ایک ذریعہ تھا۔ جس سے یہ معاملہ طے ہو سکتا تھا۔ اور وہ ذریعہ یونان تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے ایک بڑے حصّے کے معاوضے میں یونانی وزیر دینی زیلوس نے ترکوں کو درست کرنے کا وعدہ کیا۔ اور اِس مقصد کے لئے ایک لاکھ فوج سمرنا میں اتار دی۔ لیکن یونانیوں کو مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ اور یہ ایک لاکھ بھی ایشیا کوچک میں پھیل کر ایک بے اثر طاقت رہ گئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے فرانسیسیوں کو ایک طرف اور دوسری طرف یونانیوں کو بے قاعدہ ریل پیل سے تھکانا شروع کیا۔ یونانی اِس طریق جنگ کی تاب نہ لاکر خندقوں میں بناگزیں ہو بیٹھے۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ تسخیر ایشیا کوچک کبھی بھی نہ ہو سکیگی۔ اور نہ ہوئی۔ اِس سے ایک اور مشکل پیدا ہوئی۔ دینی زیلوس تو اتحادی منصوبوں کی کٹھ پتلی بننے کے لئے تیار تھا۔ مگر یونانی قوم تیار نہ تھی۔ ۱۹۱۲ء سے لے کر آج تک ترکوں سے مُنہ کی کھاتے کھاتے اِن کے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ اور اب رختِ حرب سے بیزار ہو گئے تھے۔ نومبر میں انتخابات کے موقعہ پر ...۹۹ آرا کی موافقت اور ....۱ آرا کی مخالفت سے انہوں نے دینی زیلوس کو ملک سے نکال باہر کیا۔ اور قسطنطین کو واپس یونان میں بلوا لیا۔ اِس کے معنے یہ تھے۔ کہ اطالیہ اور یونان اِس معاملہ سے دست بردار ہو بیٹھے تھے۔ گو قسطنطین نے اپنے طور پر ترکوں سے طرح جنگ باندھی۔ مگر یہ محض دکھاوا تھا۔ بات یہ تھی۔ کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے تمام منصوبے خاک میں مل چکے تھے۔

اِس دوران میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی طاقت کو پختہ کر لیا تھا۔ اب وہ اپنے معاملات اور حریفوں سے کر رہے تھے۔ پہلے پہل تو انہوں نے عربوں سے دوستی پیدا کی۔ بعض

لوگوں کو یہ امر قابل تعجب معلوم ہو گا۔ کہ ایسے دو متضاد عناصر میں اتفاق کی صورت بھلا قائم ہو سکتی تھی۔ مگر انگریزی اور فرانسیسی بدکرداریوں نے یہ معجزہ بھی ممکن کر دیا۔ اور اس امکان کا سبب کرنل لارنس جیسے آدمی نے ذیل کے الفاظ میں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ عرب ترکوں سے منحرف ہوئے تو محض اس لئے کہ وہ آزادی کے خواہاں تھے۔ اور نہ اس لئے کہ ترکی حکومت کچھ خراب تھی۔ ایک وطنیت پرست عرب نے خود ایک فرانسیسی آزاد منش رسالے میں مندرجہ ذیل بیانات طبع کرائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ عرب اور ترک صدیوں سے یکجان ہو کر رہے ہیں۔ اور ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں۔ کہ آپس سے جدا ہو کر اغیار کے پنجہ استبداد میں گرفتار ہوں فرانسیسی وزیر ملراں کا یہ کہنا۔ کہ ہم ترکوں کی آزادی کو سلب کرنا نہیں چاہتے۔ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ترکی کی قرارداد صلح کی بنا صدر جمہوریہ ولسن کی شرائط چہاردہ تھیں۔ مگر جونہی جرمنی اور اس کے حلفا کمزور ہو گئے۔ تو ولسن کی شرائط اور استقلال شام کے تمام وعدے پامال کر دئے گئے اس اتحادی چیرہ دستی نے عربوں اور ترکوں کو متحدہ کر دیا۔ ۴۰ لاکھ شامیوں پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے فرانس کو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اسے مشرق قریب کے سوا کروڑ عربوں سے بھی عہدہ برآ ہونا ہو گا۔ اور یہ عرب تمام مسلم ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر بلاد اسلام کے لوگ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ان کارروائیوں سے متاثر ہو کر اپنے نظام سیاست کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اگر ان تمام بدعہدیوں کا انسداد آج نہ کیا گیا۔ تو جس وقت خون کی ندیاں بہنی شروع ہوں گی۔ اس وقت آب از سر گزشت والا معاملہ ہو گا۔

مصطفےٰ

شام کے علاوہ عربی ترکی موالات کے آثار ہر طرف نظر آنے لگے۔ اس موالات کی نہ تو کمال پاشا نے اور نہ فیصل نے برملا تائید کی تھی۔ مگر یہ محض سیاست تھی۔ ترک عربوں کے دوش بدوش سلیسیہ میں جنگ آزما تھے۔ اور ترک اور کرد شام میں عربوں کے ساتھ ہو کر فرانسیسیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اور عراق کی عربی شورش میں مصطفےٰ کمال پاشا کی یاوری کے نتائج صاف طور پر نظر آ رہے تھے۔

مگر یہ موالات عربی مصطفےٰ کمال پاشا کی خارجی حکمت عملی نہ تھی۔ بلکہ پاشا موصوف قفقاز کے تاتاروں اور ایرانی آذربائیجان کے ترکمانوں کے ساتھ رابطہ اتحاد قائم کر رہے تھے

اس وقت قفقاز عجیب افراط تفریط کی حالت میں مبتلا تھا۔ تاتاری مسلمان اور ترکمان۔ عیسائی ارمنی اور گرجی اور متعدد روسی فرقے آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ تاتاری ترکمانوں نے جو پان توران پروپاگنڈا سے متاثر ہو چکے تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے نعرۂ حریت کی پُرجوش صدائے بازگشت دی۔ اور بلشویک روس اب انگورہ کی دوستی کا متمنی ہوا۔ بلشویک آرزو یہ تھی۔ کہ مغربی طاقتوں کے برخلاف تمام مشرق بھڑک اُٹھے۔ بدیں وجہ انہوں نے ترکی طاقت کے احیا کو بنظر استحسان دیکھا تھا۔ ابتدا میں بلشویک انگورہ کی مدد کچھ نہ کر سکے۔ مگر جب جنوبی اور مشرقی روس میں رانگل کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ تو حکومت ماسکو کا قفقازی راستہ کھل گیا۔ اور روپیہ اور اسلحہ ترکوں کو بھیجا جا سکا۔

علاوہ بریں مصطفےٰ کمال پاشا اور حکومت ماسکو ایران میں فساد کرانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ایران کی حالت اس وقت نہایت ہی درماندہ تھی۔ دوران جنگ حکومت کی بے تعلقی کے باوجود انگریز۔ روسی۔ جرمنی اور ترکی فوجیں آئے دن سرزمین ایران پر ریل پیل کرتی رہیں۔ روسی انقلاب ۱۹۱۷ء کے بعد روسی فوج تو خارج از ملک ہو گئی۔ مگر انگریزوں نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر حکومت ایران سے فوراً ایک عہدنامہ کر لیا۔ جس کے رو سے شاہ کی حیثیت ایک ہندوستانی نواب کی سی کر دی گئی۔ اور یہ امر ایران میں بلشویک پروپاگنڈا کی کامیابی کا باعث ہوا۔ عہدنامہ پر گو سُرخ لاکھ کی مہریں خوب گول گول لگ چکی تھیں۔ مگر پھر بھی اہل ایران اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے۔ اس موقعہ پر حکومت ماسکو نے عہد زار کی تمام ایرانی مراعات کو ترک کرنے اور ایران سے عہد دوستی باندھنے کا اعلان کیا۔ قدرتی طور پر اس بات نے ایران پر گہرا اثر کیا۔ اور اس سرزمین میں حریت اور حمیت کے جذبات لہریں مارنے لگے۔ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں ایک مختصر بلشویک فوج شمالی ایران میں داخل ہوئی۔ وہ اندرون ملک میں نہیں گئی۔ مگر اس کی موجودگی نے انگریزوں کی حالت کو کمزور کر دیا۔ چند ماہ تک حالات کی صورت پریشان رہی۔ جو اب تک قائم ہے۔ مگر اس بات میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ ایران میں انگریزوں کے منصوبے خاک میں مل چکے ہیں۔ اور اغلب ہے۔ کہ ماسوائے جنوب ملک باقی تمام حصص سے اس کے اثر کا اخراج ہو جائے۔

اب ہم سرما ۱۹۲۰ء کے واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اُس وقت فرانس اور انگلستان کی پوزیشن نہایت ہی غیر خوش آیندہ تھی۔ اطالیہ اور یونان تو ان سے علیحدہ ہی ہو چکے تھے۔ مصری اور ایرانی ان کے سر پر ڈنڈا لئے کھڑے تھے۔ اور سلطنت کے فوجی مصارف کی کوئی انتہا نہ تھی۔ صرف قبضہ عراق کا صرف دس کروڑ پونڈ تھا۔ اور ان اخراجات کے خاتمے کی صورت نظر نہیں آتی تھی +

اب تو خود انگلستان اور فرانس میں ان مسرفانہ افعال پر لے دے ہونے لگی۔ بالخصوص انگلستان میں جہاں قبضہ عراق کو فعل مجرمانہ و مجنونانہ قرار دیا گیا۔ اس موقعہ پر کرنل لارنس نے کہا۔ ہماری تباہی کے دن آن پہنچے ہیں۔ ہمارا طریق حکومت ترکوں کے مقابلے پر بدترین ہے ترک ... ہم مقامی سپاہیوں کی مدد سے ملک میں امن رکھتے تھے۔ اور ہم آج ۹۰ ہزار فوج ہوائی جہازوں۔ مسلح چھکڑوں، مسلح کشتیوں۔ اور آہن پوش ٹرینوں سے امن قائم نہیں رکھ سکتے اور ہم نے کچھ نہیں۔ تو ایک موسم گرما میں دس ہزار عربوں کو ہلاک کیا ہے۔ ایسے خیالات سے متاثر ہو کر حکومت انگریزی نے پرسی کاکس کو عراق کا ہائی کمشنر بنا کر عربوں سے نامہ و پیام کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ شخص ملنر کی سی شخصیت اور تجربہ رکھتا تھا۔ اس کو کثیر رعایات دینے کا اختیار تھا جس کی وجہ سے اس نے عربوں پر اچھا اثر بٹھایا۔ اب تک عراق کے متعلق کچھ قطعی فیصلہ نہیں ہو چکا۔ مگر یہ نظر آتا ہے۔ کہ حکومت اپنے اختیارات محدود کر کے ۱۹۱۴ء کے حلقہ اثر یعنی بصرہ تک اپنا اقتدار رکھیگی +

فرانس شام میں شدید سزاؤں کی پالیسی سے امن رکھ سکا ہے۔ مگر عام حالات نہایت ہی خطرناک ہیں۔ آبادی کے تمام طبقے فرانسیسی اثر کے دشمن ہیں حتیٰ کہ کیتھولک مارونی جو فرانسیسیوں کے حامی تھے۔ اب ان کے مخالف ہیں۔ جنرل گورو نے شورش کے لیڈروں کو کارسیکا میں جلا وطن کر دیا ہے۔ مگر اس سے فرانس کے دوستوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ ابتک فرانسیسی پالیسی میں تغیر واقع نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ ہوا۔ وزیر لیگ نے کہا۔ فرانس تمام شام پر قبضہ حاصل کریگا۔ اس کے بعد گورو نے کہا۔ فرانس کے مصالحہ شام اقتصادی اور سیاسی دو نوع کے ہیں۔ اور فرانس ان سے کبھی دستبردار نہ ہوگا۔ اگر ہم آج شام سے نکل جائیں۔ تو ہماری سیاست کو سخت ضعف پہنچیگا۔ ہمارا اثر بحرہ روم اور لوانٹ میں برباد ہو جائیگا۔ جب ہم شام کو اقتصادی

طور پر اچھی طرح درست کریں گے۔ تو ائس کی دولت سلیسیہ کے ساتھ ملاکر مصر کی ثروت کے برابر ہوگی +

حکومت فرانس کے استقلال کے باوجود فرانس میں نہ صرف آزاد گروہ بلکہ بعض رجعت پسند بھی شامی مصیبت سے بیزار ہیں۔ ایک قدامت پسند فرانسیسی اخبار لکھتا ہے۔ ترکی حکومت سے آزاد ہوکر عرب اب کسی اور اجنبی حکومت کے زیر اثر نہیں رہنا چاہتے۔ یہ کہنا کہ شامی ہماری حفاظت کے محتاج ہیں۔ کذب صریح ہے۔ شام بالکل آزاد رہنا چاہتا ہے۔ حال میں دکتر بیرار فرانسیسی سینیٹر نے مجلس کے روبرو تقریر کی اور شدت سے فرانسیسی پالیسی پر نکتہ چینی کی۔ اس نے اس امر کا اعلان کیا۔ کہ آزاد شام نہ صرف فرانسیسی مصالحہ کا معاون ہوگا بلکہ اس سے اتحادی بدعہدی کا دھبہ بھی دور ہو جائیگا +

فرانسیسی حکومت جواب تک عربوں کی طرف سے اسقدر لاپرواہ تھی۔ ترکوں سے صلح کر چکی ہے۔ اس نے عہد نامہ سیور کو الگ کر ترکوں سے ایک نیا اقرار نامہ کیا ہے۔ جس کے روسے تخلیہ سلیسیہ کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ فرانس اور انگلستان میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ عہد نامہ سیور ناقابل عمل ہے۔ اور انجام کار سارے ایشیا کوچک پر ترکی سیادت کو تسلیم کر لینا لابدی ہوگیا +

ترکوں سے صلح کرنے سے شاید فرانس کو یہ امید ہے۔ کہ مصطفےٰ کمال پاشا عربوں سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ مگر میرے نزدیک تو یہ کبھی بھی ممکن نہیں۔ اگر حالات کا صحیح اندازہ لگایا جائے تو تمام مشرقی اقوام آج کل مغربی اقتدار کے برخلاف دن بدن متحد ہو رہی ہیں۔ اس حقیقت کا ایک ثبوت سنہ ۱۹۲۱ کی کانفرنس سیواس ہے۔ اس جلسے میں نہ صرف اطراف اسلام کے مومن مسلمین کے با اثر نمایندوں نے شرکت کی۔ بلکہ شیعہ مجتہدین کربلا۔ خوارج کے سربراہ یمن کے امام یحییٰ اور زیدی امیروں کے نائب بھی آئے۔ اور سب سے زیادہ موجب اطمینان حضرت شیخ الاعظم سنوسی کی شرکت ہے۔ مگر یہ موجب حیرت نہیں۔ کیونکہ اتحاد مسلمین سلسلہ سنوسیہ کی غرض اولین ہے +

یہ ہے مشرق قریبہ کی موجودہ حالت جس کے مطالعے سے عیاں ہے۔ کہ یہ ناقابل اطمینان

ہے۔ ایک امید افزا امر یہ ہے۔ کہ حکومت انگریزی اپنے بدطرز عمل سے باز آنے کا ارادہ ظاہر کر چکی ہے۔ اور پرسی کاکس اور ملز جیسے لوگوں کی کوششیں بے سود نہ ثابت ہونگی۔ کیونکہ یہ لوگ اِن انگریزوں کی اولاد میں ہیں۔ جنہوں نے یاس انگیز مصائب سے سلطنت انگریزی کو بچایا ہے +

دوسری طرف فرانس کی مجہول حرکتیں اب تک کم نہیں ہوئیں۔ اپنی روایات قدیم کے زیر اثر فرانسیسی صاحب اقتدار طبقہ اب تک اپنی ہٹ دھرمی پر اڑا ہوا ہے +

اِس روز سیاہ کے عالم میں جس کا آنا اٹل ہو چکا ہے۔ جبکہ بادیہ نشینانِ صحرائے شام کی بادسموم بیس تیس فرانسیسی پلٹنوں کو کباب کر کے رکھ دے گی۔ بصیرین عالم کا یہی فیصلہ ہو گا۔ کہ فرانسیسی بدکرداریوں کی یہی سزا تھی +

اِس نازک وقت میں مشرق قریب کے مسائل کو اِس منزل پر چھوڑ کر ہم وسط ایشیا کے سیاسی مسئلے یعنی وطنیت ہندوستان پر اب مفصل بحث کریں گے +

باب ششم

جذبہ وطنیت ہند

ملک ہندوستان ایک معمہ ہے۔ اپنی مسلمہ جغرافی اتحاد کے باوجود ہندوستان میں سیاسی اتحاد کی صورت حکومت انگریزی کے قیام سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ جنگجو اور بہادر قوموں کے ہوتے ہوئے۔ اجنبی غنیم ہمیشہ ان کے ملک پر غالب آتے رہے ہے۔ کئی ایک مختلف گروہ جن سے اس ملک کی آبادی مرتب ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک دوسرے سے جُدا اور ایک دوسرے کے مخالف رہے ہے۔ اور ان کی مذہبی معاشرتی اور لسانی روایات ہمیشہ ان کے جماعتی اتحاد کی مانع ہوئیں گو ہندوستان چین جیسا وسیع اور یورپ جیسا آباد ہے۔ مگر اس میں نہ تو کبھی چین کی عام یکجہتی کا اور نہ کبھی یورپی قوموں کی خصوصی وطنیت کا ظہور ہو سکا۔ بلکہ لچکدار بے شکل ہیئت جماعت رہا ہے۔ جس کے خصائص کی اپنی انتہائی حد تک کبھی ترقی نہیں ہوئی +

تاریخ ہندوستان پر تین حوادث کا نہایت دیرپا اثر ہوا ہے۔ آریہ حملہ۔ زمانہ سنہ ۱۵۰۰ء قبل مسیح۔ مسلمانوں کا حملہ۔ سنہ ۱۰۰۰ء میں۔ اور مغربی حملہ جس کی ابتدا ۱۵۰۰ء میں ہوئی۔ اور جس کی تکمیل آج ہو چکی ہے +

آریہ لوگ سفید رنگ کی قوم ہیں۔ اور وہ اسی حصۂ نسل انسانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس سے یورپی اقوام۔ وسط ایشیا سے جنوب کی طرف یلغار کرتے ہوئے وہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اور سیاہ فام دربود یعنی قدیم باشندگانِ ہندوستان کو مغلوب کر کے ملک پر بطور مالک قابض ہو بیٹھے۔ مگر آریاؤں کی تسخیر ہندوستانِ جنوبی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ان کا بیشتر

حصہ ملک کے شمال مغربی گوشے میں آباد رہا اور ایک قلیل گروہ ملک کے دیگر حصص میں پھیلا -
بلکہ شمال میں بھی جنگلی علاقہ جات قدیم باشندوں کے تصرف میں رہے - اور معدودے چند آریہ قبائل
نے جنوب کا رُخ کیا - ہندوستان میں ان قلیل التعداد آریاؤں کی حیثیت کثیر التعداد باشندگان قدیم
پر حاکمانہ تھی - اور اپنی اس بالا حیثیت اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے ذات کی رسم
کو ایجاد کیا - ذات ابتداءً امتیاز رنگ تھا - عام حکومتی عمال نے تو اس کی پرواہ نہ کی - مگر مذہبی فرقے
نے اس امتیاز کو قائم رکھا - تمام قوم چار طبقات میں تقسیم کر دی گئی - اول برہمن فرقہ مذہبی
کھتری یعنی فرقہ سپاہیاں - ویش یعنی کاروباری گروہ - اور شودر یعنی ادنے ترین ذات جو دریود
قدیم آبادی ملک کے ممبر تھے - ان ذاتوں کے اختلافات کو قائم رکھنے کے لئے نہایت تشدید
وضع کے قاعدے ایجاد کئے گئے - آپس میں رشتہ ناطہ - میل جول اور خورد نوش حتیٰ کہ پاس
سے ہو کر چھو جانا ممنوع قرار دیا گیا - ان آئین ذات کی عدیم تعمیل کی سزائیں نہایت سخت ہیں -
ایک تو یہی ہے - کہ نافرمان کو مرتد قرار دیا جاکر اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے - جس کے معنی یہ ہوتے
ہوتے ہیں - کہ وہ اپنی ذات سے ہمیشہ کے لئے خارج ہو جاتا ہے - اس سے کوئی شخص لین دین
نہیں کرتا اور اس کی حیثیت پاہر یا کر دیجانی یعنی شودروں سے گیا گزرا - تو گویا ایک طرف تو
ہندوستانی جماعت کا نظام ملکی نہ تھا - بلکہ روحانی اور دوسری طرف اس کے روحانی پیشواؤں نے
اپنے اختیارات رسومات مذہب تک ہی محدود نہ رکھے تھے - بلکہ لوگوں کی عام معاشرتی اور
سیاسی زندگی پر بھی حاوی کر دیا تھا +

ان امور کے نہایت اہم نتائج پیدا ہو گئے - ذات پات کے امتیازات بہر حالات میں قائم
نہ رہے - مثلاً بعض برہمن بھی رفتہ رفتہ دریود نسل سے مربوط ہونے لگے - گو محض معاشرتی معاملات
میں ذات کی خصوصیات قائم رہیں - اور ان سے بڑھ کر ان میں ہر ایک کے یعنی تین اعلےٰ
ذاتوں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مدارج قائم ہو گئے - گو ان مدارج ذات میں ابتدائی نسلی
امتیازات کا کچھ دخل نہ تھا - مگر ان کی اس شدت سے پابندی ہونے لگی - کہ تمام آبادی چھوٹے
چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنی اپنی جگہ پر جم گئی - اور مختلف فرقوں کا آپس میں اتحاد
تو درکنار کسی ادنے معاملے پر یکجہتی کا پیدا کرنا مشکل ہو گیا - اس حقیقت کا اثر تاریخ ملک

پر بہت ہی گہرا پڑا۔ ایک انگریز لکھتا ہے۔ ذاتوں کی مختلف النوعی نے جس کا رواج اِس قدیم زمانے سے ہو رہا ہے۔ ملک ہندوستان میں عجیب و غریب حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ گو تمام لوگ ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے ممبر ہیں۔ مگر ذاتی رسومات کی پابندی نے اِن کو گویا علیحدہ علیحدہ قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اب جماعتی اختلافات میں غریبی۔ امیری۔ شہری رہائش یا دیہاتی رہائش کا کوئی سوال نہیں۔ بلکہ اصلی بات تعلق ذات ہے۔ اور اِن مختلف گروہوں کے آپس کے تعلقات ایسے ہی گہرے ہیں۔ جیسے کہ کسی چڑیا گھر میں رہنے والوں جانوروں کے آپس میں ہوتے ہیں +

اِس حقیقت کو معلوم کرنے کے بعد یہ سمجھنا بالکل آسان ہوگا۔ کہ جس ملک پر ذات کی سی لعنت کی نحوست سوار ہو۔ وہ بھلا کسی اجنبی حملہ آور کا کیا مقابلہ کر سکیگا۔ اور یہ حملہ آور مسلمان تھے۔ مسلمانوں نے ایران فتح کرنے کے جلد ہی بعد ہندوستان پر حملے شروع کر دیے۔ جن کی حقیقت ابتداً سرحدی یلغاروں کی سی تھی۔ مسلمانوں کا پہلا اصلی حملہ سنہ ۱۰۰۱ء میں ہوا اور اس مہم کا قائد محمود غزنوی تھا۔ اِس نے اور اس کے بعد اِس کے جانشینوں نے رفتہ رفتہ ہندوستان پر اپنا تسلط جمانا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں پنجاب اور اِس کے ملحقہ علاقوں پر مستقل تصرف قائم کر لیا۔ اِن مسلمان حملہ آوروں میں خصوصیات تھیں۔ اول تو یہ لوگ بت پرستوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور دوسری یہ کہ لاکھوں نیچ ذاتوں کے ہندو مسلمان ہو گئے۔ اسلام کا یہی اصول۔ کہ تمام مومن بھائی ہیں۔ کیا کم تھا۔ اور اِس ایک بات نے کروڑوں ادنےٰ ذاتوں کے ہندوؤں کو مسلمان بنا کر صاحب اقتدار جماعت کا ہم پلہ کر دیا۔ اور یہ بات اسلامی آبادی کے کروڑ ہونے کا سبب ہے۔ ہندوستان کے مسلمان محض اجنبی حملہ آوروں کی اولاد ہی نہیں۔ بلکہ اِن کروڑوں ہندوؤں کی جو اسلامی اخوت اور مساوات کے سنہری اصولوں سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے +

کئی سالوں تک مسلمانوں کا دائرہ حکومت شمالی ہندوستان تک ہی محدود رہا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی مغل حکومت کے بانی نے ایک باقاعدہ اور ہمہ گیر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بابر اور اس کے جانشینوں نے سارے ملک کو اپنے زیر حکومت لا کر اُس کو سیاسی حیثیت سے یکجان کر دیا۔ لیکن مغلیہ فتح بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ جب روشن دماغ اور عالی حوصلہ مغل پادشاہوں کی جگہ اِن کے نااہل جانشین سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ تو برہمنوں نے پھر سر اُٹھایا

اور مغل سلطنت کی تباہی میں نمایاں حصہ لے کر ملک پر اُس کے عہد سابق کی طوائف الملوکی کو ازسر نو مسلط کر دیا۔ ہر جگہ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ جن کے حریص مگر کم حوصلہ فرمانروا ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے رہے +

اس حالت عدم انتظام سے انگریزی امیدوں میں اضافہ ہونے لگا۔ انگریز پہلے پہل پرتگیز۔ ولندیز اور فرانسیسی جماعت تجاران مغربی میں سے ایک تھے جنہوں نے کاروباری لین دین کی کوٹھیاں ہندوستان کے مختلف سواحلی مقامات میں قائم کر رکھی تھیں۔ جب تک مغلوں کا اقتدار قائم رہا ان مغربیوں کو تسخیر ہندوستان کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ انگریزی تعلق ہندوستان کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی کاروباری کوٹھی کی صورت میں ہوئی۔ لیکن جب مرکزی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ تو پہلے تو انہیں اپنی کوٹھیوں کو بچانے کے لئے ذرائعہ مدافعت بہم پہنچانے پڑے۔ اور اس کے بعد ہندوستانی فرمانرواؤں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ملک پر قبضہ کرنے کا لالچ پیدا ہو گیا۔ انگریزوں نے بتدریج اپنے مغربی رقیبوں کی قوت کا خاتمہ کیا۔ اور اس کے بعد اپنی طاقت کو بوجہ احسن پختہ کر لیا۔ ابتدا میں ایشیا انڈیا کمپنی کے سرمایہ دار اپنے کاروبار کو تجارتی حدود تک رکھنا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے کئی سالوں تک ایسا کیا بھی مگر حالات کو غنیمت جانکر ان کو ملکی فتوحات کا خیال پیدا ہوا۔ اس ملکی فتوحات کی پالیسی نے ہندوستانیوں میں سراسیمگی سی پھیلا دی جس کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کا غدر تھا۔ غدر تو ہو گیا۔ مگر نظام سلطنت کی باگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکلکر تاج انگلستان کے سپرد ہوئی۔ اور وکٹوریہ ملکۂ انگلستان قیصرہ ہند ہو گئیں۔ ان حالات سے نہ صرف برطانوی اقتدار ہندوستان اور بھی پختہ ہو گیا۔ بلکہ اس کے ذریعہ سے مغربی تاثرات کے حملے بیش از پیش ہندوستان پر ہونے لگے۔ سڑکیں۔ ریلیں اور نہریں بنائی گئیں۔ نہر سویز کے کھلنے سے مغربی ممالک سے لین دین زیادہ ہونے لگا۔ اور مغربی وضع کے مدارس نے مغربی روایات اور مغربی خیالات کے لئے راہ پیدا کر دی +

ہندوستان پر جس کے حالات آج کل اس تیزی سے ترقی کر رہے ہے۔ اسوقت ایک ایسی گورنمنٹ کا سایہ ہے۔ جو تاریخ دنیا میں بالکل انوکھی ہے۔ اور اس کا خاکہ یہ ہے۔ کہ چند نہایت ہی ذی ہوش اور تجربہ کار اہلکار جو چند ہزار تربیت یافتہ عمال کی مدد سے کروڑوں مختلف النوع

انسانوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ فی الحقیقت اِس قسم کا طریق حکومت انتہائی وضع کا استبداد ہے۔ جس میں محکوم گروہ کی آواز کی شنوائی کی گنجائش نہیں۔ لیکن حکومت کے نتائج اُمید افزا تھے۔ جہاں تک دیانتداری، حسن انتظام اور فرض شناسی کا تعلق ہے۔ حکومت ہند دنیا کی بہترین حکومتوں کی مماثل ہے۔ اِس نے ملک میں حالت امن پیدا کی۔ اُس نے رو رعایت اور ذاتوں اور فرقوں کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ ضرورت عدل کو مقدم جانا۔ اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کا حقیقی معنوں میں بطور ملک واحد شمار ہونے لگا۔

اب خود یہی خوبیاں حکومت انگریزی سے بیزاری کا موجب ہونے لگیں۔ زمانہ جدید کے ہندوستانی جن کو اپنے ملک کے عہد سابق کے حالات کی خبر نہیں۔ انگریزوں کی ذرہ ذرہ سی غلطیوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور آزادی، قومیت اور وطنیت جیسے اعلٰے جذبات سے متحرک ہو رہے ہیں۔ کیا ہندوستان اور کیا دیگر ممالک مشرق سب کے سب آج نئی نئی تحریکات کے متاثر ہوکر کہیں تو محض مقامی حکومت خود اختیاری اور کہیں کامل آزادی کے مدعی ہو رہے ہیں

انیسویں صدی کے آخری ربع تک منظم سیاسی جدوجہد فی الحقیقت ناپید تھی۔ ہاں کہیں کہیں اجنبی حکومت کی لغزشوں پر نکتہ چینی ہوئی۔ مگر نہ اِس قدر کہ اُسے مؤثر کہا جاسکے۔ عوام طبقہ آبادی جس کو قوت لایموت کے پیدا کرنے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ مغربی حکومت جس کا استبداد اُن کے اپنے قومی حاکموں کے استبداد سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ مغربی حکومت سے لاپرواہ تھے۔ اور ایک باا ثر ہندوستانی وطنیت کا تو ابھی تک وجود ہی میں نہ آنے کو تھی۔

متذکرہ بالا منظم سیاسی جدوجہد کی اولین علامت قیام انڈین نیشنل کانگرس ہے جس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء میں منعقد ہوا۔ اِس انجمن کے نام ہی سے ظاہر ہوجائیگا۔ کہ ہندوستانی آبادی کے مختلف گروہ واحد قومیت کے شیرازے میں باندھے جارہے ہیں۔ اِس کانگرس کے ابتدائی سالوں میں اِس کی عام نیابتی حیثیت کچھ بہت قابل وقعت نہ تھی۔ اور اِس کے اراکین زیادہ تر اخبار نویس اور وکالت پیشہ اصحاب تھے جو مغربی طرز حکومت کو سمجھ سکتے تھے۔ اور یہ مغربی طریقہ تعلیم کا ثمر تھے جس سے مغربی معاملات سے آگاہ ایک اہل الرائے طبقہ پیدا ہوچکا تھا۔

اس گروہ کو پہلے پہل ہندوستانی پسماندگی کا احساس ہوا۔ بنابریں کانگرس کی ابتدائی کارگذاری اصلاح رسومات معاشرتی انسداد خورد سالی شادی بیوگان ترویج تعلیم عامہ وغیرہ تک ہی محدود رہی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ خالص سیاسی معاملات پر بھی مباحثات ہونے لگے اور چونکہ تعلیم یافتہ ہندوستانی طبقہ ہندوستان ماضی کی تاریخی اور علمی روایات سے بے بہرہ نہ تھا۔ اُن کے دلوں میں اپنی موجودہ سیاسی بے بسی پر اضطراب اور اہل یورپ کی سی حریت حاصل کرنیکا احساس پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ باخبر اور بااثر اخبارات کی تعداد میں بھی روزافزوں اضافہ ہونے لگا۔ جو وقیع رائے عامہ کے وجود کا اظہار کرنے لگے۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں تو اہل ہندوستان نیابتی نظام۔ نگرانی محاصل۔ و اختیار صیغہ انتظامی وغیرہ جیسی سیاسی آرزوؤں کے مدعی بن چکے تھے۔

مگر پھر بھی ان مدعیان اختیار عام کا گروہ اب تک مغربی طرز تعلیم پر تربیت پائے ہوئے قلیل التعداد لوگوں پر مشتمل تھا۔ اور اس لئے ان کو عامہ وطنیت ہند کی بہترین مظہر نہیں کہا جاسکتا اور باستثنا تعداد قلیل ان کا نصب العین محض حکومت حاکمانہ کی ایسی اصلاح تھا جس سے ذمہ واری کا بار نہ صرف تمامتر غیر ذمہ دار اجنبی عمال حکومت پر سے۔ بلکہ ملکی آبادی کے نمائندے بھی اس میں شریک کئے جائیں اور طرز حکومت بتدریج خود اختیاری زیر سیادت برطانیہ ہوجائے

مگر نئی صدی کا آغاز ہوتے ہی حالات میں نمایاں تغیر نظر آنے لگا۔ اور ممالک مشرق کی طرح ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی نئے جذبات موجزن ہوئے۔ احیائے وطنیت کی علامات بین طور پر نظر آنے لگیں۔ ہندوستانی عالموں نے اپنے عہد ماضی کی تاریخ کو کھنگال کر ہندوستان قدیم کے کارناموں کی یاد کو تازہ کردیا۔ اصلاح یافتہ ہندو فریق آریہ سماج نے اس عمل کی مذہبی تائید بہم پہنچائی۔ یورپی تربیت یافتہ حریت پرست اصحاب اب محض جزوی اصلاحوں کی تکمیل نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ احیائے ہند قدیم تاکہ وہ دور مستقبل کی تعمیر اپنے ہاتھوں اپنے طریق پر کرسکیں۔ اور ان ارفع ارادوں کی صدائے بازگشت "بندے ماترم" زندہ باد۔ پائندہ باد مادر ہند۔ کے جوش انگیز نعروں میں پیدا ہونے لگی۔

مگر ہندوستانی وطنیت کے ابتدائی مظاہرات صرف طبقہ اہل ہنود میں پیدا ہوتے

رہے۔ مسلمانوں یا تو اِن مظاہرات سے الگ تھے۔ یا برملا طور پر مخالف۔ اور ایک حد تک یہ روش جائز بھی تھی۔ کیونکہ اہل ہندو کا نصب العین صرف آریہ ہندوستان کے عہد زریں کا احیا تھا۔ جس کے معنی ویدوں کی ترویج اور برہمنی اصولوں کی عود زندگی کے سمجھے جاتے تھے۔ اِس حقیقت نے کیا عوام اور کیا تعلیم یافتہ گروہ سب پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی۔ وہ لوگ جو چند سال قبل ترقی کا راگ گا رہے تھے۔ اب صدیوں کے بوسیدہ اور فراموش شدہ تمدن کو دوبارہ زندہ کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ہر ایک مغربی اصول سے بیزار اب وہ بت پرستی پر اتر آئے۔ اور خاک پاک ہند کو اغیار کے وجود سے پاک کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ اور اِن پرجوش حامیان آریت کے نزدیک اغیار محض انگریز ہی نہ تھے۔ بلکہ مسلمان بھی۔ یہ یاد رہے۔ کہ صدیوں سے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے متوازی آباد تھے۔ مگر اِن میں کسی طرح کا حقیقی اتحاد قائم نہیں ہوا تھا۔ حکومت انگریزی کی ہمہ گیری نے اس اختلاف کو نظروں سے چھپا دیا تھا۔ مگر اب تو اِس قسم کی نئی ہندویانہ وطنیت نے مسلمانوں کو خائف کر دیا۔ اور اِن کی نظروں کے سامنے سے عہد عالمگیری کے بعد کی تباہی سلطنت مغلیہ کے واقعات کی تصویر پھر گئی۔ مگر مسلمان محض خائف ہی نہ تھے۔ بلکہ بدل و خستہ بھی تھے۔ کیونکہ اِن کے عہد اقتدار کی یاد دلوں میں ابھی تک تازہ تھی۔ مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے کسی قسم کی عقیدت نہ تھی۔ مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے۔ کہ ملک کی آبادی میں اِن کا تناسب کیا ہے اور تعلیم اور اقتصادی ثروت میں ہندوؤں سے کہیں پیچھے ہیں۔ اس کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے کنارہ کشی اختیار کی اور حکومت سے خیر خواہی کا اظہار کیا۔ اِس سے یہ مراد نہیں۔ کہ مسلمانان ہند پر بیرونی دنیا کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ ہندوستان میں اِن کے جذبات وطنیت ایک طرح کا پان اسلامی رنگ لئے ہوئے تھے جس کا ذکر ابواب سابقہ میں ہو چکا ہے۔

وطنیت ہند کے ابتدائی مظاہرات محض ہندویانہ ہی نہ تھے۔ بلکہ برہمنانہ بھی تھے۔ جب تو برہمن ذات کے لوگ برملا اپنے عہد قدیم کے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اِس امر نے غیر برہمن اصحاب کے دلوں میں گھبراہٹ پیدا کر دی۔ کئی ایک نیچ ذاتوں کے ہندوؤں کو خوف پیدا ہوا۔ کہ برہمن کا عود اختیار اِن کے رہے سہے حقوق کو پامال نہ کر دے۔ جن کی حکومت انگریزی کفیل ہے۔ ہندو راجگان بھی احیاء برہمنیت سے بیزار تھے۔ تو گویا ہندوستانی

وطنیت کے ستون یا تو برہمن تھے۔ اور یا یورپی تعلیم یافتہ افراد جنہوں نے بحالت کامیابی۔ اقتدار حکومت کو آپس میں بانٹ لینے کا من سمجھوتہ کر لیا تھا۔

اِن آرزوں کے ماتحت وطنیت ہند کی غرض یہ دے کر اب اہل مغرب سے تنفر اور انگریزی حکومت سے تعصب رہ گئی تھی فتوحات جاپان نے اِس جذبے کو تقویت بخشی اور ۱۹۰۵ء میں نفاذ قانون تقسیم بنگال نے ملک میں ایک طوفان برپا کر دیا تقسیم بنگال محض ایک انتظامی فعل تھا۔ مگر اہل ہند نے اِسے مسئلہ انفطاعی قرار دیکر سیاسی بے چینی کی آگ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لگا دی۔ اِس زمانے کی شورش کا ایک سربرآوردہ لیڈر بال گنگا دھر مرحوم تھا۔ جسے ابو الحریت ہند بھی کہا جاتا ہے۔ تلک مرحوم ہندو وطنیت مجسم تھے۔ آپ اعلےٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے تھے اور مغربی تاثرات مغربی اصولہائے تمدن غرضیکہ ہر ایک مغربی چیز کے جانی دشمن تھے۔ وہ بااثر مقرر تھے اور اِن کی تحریریں جادو کا اثر تھا۔ اپنے اخبار بذریعہ کیسری سے انہوں نے سیاسی بلوے تو روزمرہ کی بات کر دئے تھے۔ مگر اِس جدوجہد میں کیسری کے معاون کئی ایک اور انتہا پسند مطبوعات بھی تھیں۔

ہندوستانی وطنیت کی انتہاپندی ذیل کے اقتباسات سے ہوتی ہے۔ کیسری کی ایک اشاعت میں تحریر تھا۔ غلامانہ حیثیت کی قوموں کی فلاح کا واحد ذریعہ انقلاب ہے۔ اگر تم عالم حیات میں اپنی مردمیت کا ثبوت نہیں رہ سکتے۔ تو موت سے دو۔ آج اجنبی ہمارے ملک پر قابض ہیں۔ اور ہمارا ہر ایک فعل زندگی اِن کے اختیار میں ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ طریق موت کے مالک ہم خود ہیں۔ ضروری ہے۔ کہ ملک کا ہر ایک گھرانہ اِس انقلاب کا ممد ہو۔ جب انقلاب انگیزان ہند اُٹھینگے۔ تو معدودے چند اجنبی اِن کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ مادر ہند پر جان نثار کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں مارے کیوں نہ جائیں۔ اِن کی جگہ اور لوگ لے لیں گے۔ خوف کو پاس مت آنے دو۔ شہیدانِ وطن کا خون خاکپاک ہند کو زیادہ زرخیز بنا دیگا۔ اے بہادرو! آگے بڑھو۔ یاد رکھو۔ تمہاری ایک چشمک (بمب کے گولے) نے دشمنوں میں سراسیمگی پیدا کر دی ہے۔ آؤ! بڑھو۔ اور دریائے خونِ شہیدان میں کود پڑو! کرشنا درما اڈیٹر انڈین سوشیالوجسٹ نے سیاسی قتل پر ذیل کے الفاظ میں زور دیا ہے۔ سیاسی قتل قتل نہیں۔ حملہ جارحانہ کے برخلاف عمل مدافعانہ طاقت کا ناجائز استعمال

قرار نہیں دیا جا سکتا "یگانتر" کے ناظرین کے لئے چندہ کی شرح یہ ہے۔ ایک ناظر ایک یورپی کا سر ادا کرے! اور تو اور صنف ضعیف بھی اِس بیان کا نشانہ بننے سے نہیں بچا۔ ایک انگریز اور اس کی لڑکی کے قتل ہونے پر "یگانتر" لکھتا ہے۔ "غیر ملکی بھوتوں کو نیست و نابود کرنے کے عمل کے دوران میں کئی ایک بھوتنیوں کو بھی تہ تیغ کرنا پڑیگا۔ ایسے لوگوں کے تعصب ملی کا اندازہ ڈھینگرا قاتل کرزن وائلی کے بیانات بعد از اقدام جرم سے پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہا "میرا ایمان ہے کہ جو قوم بزور سنگین دوسری قوم پر حکومت قائم کرتی ہے۔ وہ محکوم قوم سے ہمیشہ برسر پیکار ہے۔ ہندوستانی قوم مسلح نہیں۔ اس لئے مجھے انفرادی لڑائی کرنی پڑی۔ مجھے بندوق نہیں مل سکی۔ میں نے پستول کا استعمال کیا۔ میں ایک ہندو ہوں۔ اور میرے ملک کو جو فریق ناپاک کرتا ہے۔ وہ میرے خدا کا دشمن ہے۔ میرا نصب العین شری رام کا نصب العین ہے۔ میں ایک غریب اور غیر تعلیم یافتہ آدمی ہوں۔ اور میرے پاس مادر وطن کے قدموں پر نثار کرنے کے لئے سوائے میری اپنی جان کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور وہ میں نے پیش کردی ہے۔ آج میرے ہموطنوں کو صرف ایک سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ مرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ میں اِس دنیا سے رخصت ہوتا ہوں۔ مگر میرا دل ایک شہید کے دل کی طرح مسرور ہے۔ جب تک دو ملکوں کے موجودہ تعلقات قائم ہیں۔ جنگ ہندو انگلستان جاری رہے گی"۔

حکومت نے قدرتی طور پر اِس عملِ قتل و غارت کو سختی سے فرو کیا۔ ہندوستانی اخبارات کے لب سی دئے گئے۔ شورش کنندگان یا تو قید کر دئے گئے۔ یا پھانسی دے دئے گئے۔ اور عمالان حکومت کے اختیارات میں نئے اور سخت قوانین کا اضافہ کیا گیا۔ بلکہ بعض مغربی تو ان واقعات سے ایسے پریشان ہوئے کہ انہوں نے تمام سیاسی رعایات کے سلب کر لینے مغربی تعلیم کو کم کرنے اور انتہائی دفع کے استبدادی نظام کے اجرا کا حکومت کو مشورہ دیا۔ اِس متوحشانہ خیالات کے جواب میں ایجیٹیٹروں نے مزید فسادات برپا کئے۔ جن کا تدارک مزید بندشوں سے کیا گیا۔ وعلیٰ ہذا۔ کئی سالوں تک سارے ملک میں شورش کا ایک طوفان برپا رہا جسے حکومت کی شدید بندشیں پھانسیں اور حبس دوامئیں کسی طرح سے روک نہ سکیں۔

خدا خدا کر کے حالات کی صورت درست ہونی شروع ہوئی۔ معتدل روش کے ہندوستانی

اور انگریز مدبروں نے اِس حالت دارو گیر کو ختم کرنے کی ضرورت پر غور کرنا شروع کیا۔ اور مسٹر گوکھلے آنجہانی نے انتہا پسند فرقے کی حرکتوں پر ملامت کی۔ خوش قسمتی سے اس وقت وزیر ہند ایک عالم اور روشن خیال شخص جان مارلے تھا۔ جس نے فتنہ پرداز انگریزوں کے نکتہ نگاہ سے قطع نظر ایک لبرل اصلاحی نظام حکومت ہند موسومہ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۹۰۹ء کا اعلان کیا۔ اِس فعل سے معتدل خیال کے ہندوستانی اہل الرائے کا اطمینان تو نہ ہوا۔ مگر اُسے مزید اصلاحات کا پیش خیمہ سمجھ کر انہوں نے سمجھدار انگریزی مدبروں کی نیک نیتی کو تسلیم کیا۔ یہ اصلاحات گو شورش کا قلع قمع نہ کر سکیں مگر پھر بھی اِس کی شدت میں نمایاں تغیر ہو گیا۔ شاہ جارج ۱۹۱۱ء میں ہندوستان گئے۔ اور اس موقعہ پر عام جوش کا خوب اظہار کیا گیا۔

جو فسادات ۱۹۰۵ء میں شروع ہونے تھے۔ اِن کا تدارک کہیں ۱۹۱۱ء میں جا کر ہوا۔ مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ یہ امنیت بھی کم ہوتی گئی۔ اور مزید اصلاحات کی صدائیں بلند ہونی شروع ہوئیں۔ اِس درمیانی زمانے کے واقعات کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وطنیت عامہ کی بنیادیں پھیل کر سارے ملک پر حاوی ہو گئیں۔ اور جہاں پہلے عام سیاسی حقوق طلبی ایک قلیل التعداد انتہا پسند فرقے کا کام تھا۔ اب مسٹر گوکھلے جیسے ارتقائی ترقی کے حامی اعتدال پسند لیڈر اس کے مُدعی ہو گئے۔ اِس زمانے کا ایک قابل ذکر واقعہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری ہے۔ جن کا ایک حصہ تو اب کانگرس کا ہمخیال ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی پولیٹیکل جدوجہد کا ذریعہ اُن کی اپنی آل انڈیا مسلم لیگ تھی۔ جو ہندو فرقے کے بڑھتے ہوئے اثر سے اسلامی حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ مگر جوں جوں حالات ترقی کرتے گئے۔ اپنے ہندو ابنائے وطن کی معتدل اور صلح جو روش سے متاثر ہو کر مسلمان بھی اعتدال پسند وطن پرست ہو گئے۔ جن کے اب دو فریق ہو گئے تھے۔ اِن میں سے انتہا پسند فریق پُرانی شدید ایجیٹیشن کے اصول پر قائم رہے۔ اور اس کے سربرآوردہ لیڈر بیرونی ممالک سے اپنے خیالات کی اشاعت دنیا میں اور ہندوستان میں کرتے رہے۔

جنگ کے آغاز پر ہندوستان کی یہ حالت تھی۔ گو اک گونہ پُرامن تو تھی۔ مگر مشکلات بھی موجود تھیں۔ جنگ سے بے چینی اور وحشت انگیز واقعات تو ضرور پیدا ہوئے۔ مگر اِن کا اثر کچھ بھی نہ ہوا دورانِ جنگ اہل ہند نے دل کھول کر روپے سے سپاہ سے سامان سے انگلستان کی مدد کی۔ اور

ہندوستانی افواج افریقہ یورپ اور ایشیا کی سرزمینوں میں کھاتوڑ کر رہیں +

تحریکِ انقلاب جنگ کے زمانے میں تو بالکل رُک گئی۔ مگر وہ مری نہیں۔ بلکہ جنگ نے اس کی قوت میں اضافہ کر دیا۔ اب مطالبہ جمہور "حکومت منظم" نہ تھا۔ بلکہ حکومت مشروطہ تھا۔ یہی وجہ کیا کم تھی۔ کہ دورانِ جنگ ہندوستان نے اپنا روپیہ اور اپنا خون بے دریغ بہایا تھا۔ اور اس کے عوض میں وہ ایک وسیع نیابتی نظام کے طالب تھے۔ ایک نہیں بیسوں عرضداشتیں ملک کے ہر طبقہ خیالات کی طرف سے عمالِ حکومت کے سامنے پیش ہونے لگیں۔ قطع نظر اختلافات جزوی عام منتہائے نظر آزاد حکومت ہو چلا تھا۔ رجعت پسند گروہ محدود وضع کے نظام خود اختیاری کا متمنی تھا۔ مگر انتہا پسند گروہ کینیڈا اور آسٹریلیا جیسے نو آبادیہائے کے نظام حکومت کے دعاوی کر رہا تھا۔ انقلاب انگیز جماعت کے افراد ان دونو گروہوں سے الگ اپنے موقعہ کے منتظر تھے۔ اور اِن کا ایمان تھا۔ کہ صرف شدید سیاسی انقلاب ہی سے موجودہ طرز حکومت کو برباد کر کے اِس پر آزادی کا قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے +

مگر حکومت انگریزی انتہائی درجہ کے معتدل مطالبات بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ گو ان کو لاپرواہی سے رد نہیں کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ نے کہا۔ میں ایک لمحے کے لئے حکومت خود اختیاری کے نصب العین کو رد نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بالکل جائز مطالبہ ہے۔ اور تمام روشن خیال لوگ اِس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مگر یہ نصب العین ہے۔ نہ کہ اصولِ عمل۔ ہمیں حقائق سے نظر پھیر نہیں لینی چاہیئے۔ غیر متوقع اور ناممکن العمل تمناؤں سے ہماری رفتار ترقی کی مانع ہوگی۔ نہ کہ معاون اور عام مقاصد کی تکمیل دور جا پڑیگی۔ میں ہندوستانی جذبات سے پوری طور سے آگاہ ہوں اور میں کسی ایسے فعل کا بانی ہونا نہیں چاہتا۔ جس کے نتائج سے اصلی اغراض کا ردِ فعل ہو۔ اور ہمیں بعد میں اپنی قبل از وقتی پر پچھتانا پڑے +

۱۹۱۷ء مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اصلاحاتِ جدیدہ کی ابتدائی تحقیقات و گفت و شنید کے لئے ہندوستان آئے۔ اِس کی تیاری کئی مہینوں سے ہو رہی تھی۔ اور ملک کے تمام حصص میں مختلف مذاہب اور قوموں کی مجالس شورائے منعقد ہو چکی تھیں۔ اِن تمام کارروائیوں کا نتیجہ وہ مہتم بالشان رپورٹ تھی۔ جس پر جولائی ۱۹۱۸ء میں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند نے دستخط

ثبت کئے۔

اس میں دستخط کنندگان نے ایسی ایسی مراعات کی سفارش کی تھی۔ جو کبھی کسی سابقہ حکومت نے پیش نہیں کی تھیں۔ اس میں برملا طور پر اہل ہند کے لئے عطاسے ہوم رول کی ہدایت تھی۔ دستخط کنندگان کا ایک بیان یہ ہے۔ "یہ عطیہ ہندوستانی شورش کا نتیجہ قرار نہیں دی جاسکتا۔ بلکہ اِس امر کا کہ اہل ہند کا ہم پر اعتماد ہے۔ ہمارا ایمان ہے۔ کہ اگر زمانہ حاضرہ کی محافظانہ طریق حکومت کو بدلا نہ گیا۔ تو اس سے ہندوستانی قومی زندگی کو بہت نقصان پہنچیگا۔ اور حکومت خود اختیاری زیر سیادتِ انگلستان کا وہ عطیہ جو ہم اہل ہند کو دیا چاہتے ہیں۔ تاریخ دنیا کا درخشندہ ترین کارنامہ ہوگا اس عہد جدید کی بنیاد اہل ہند کی محکومانہ اور محتاجانہ طریق زندگی پر نہیں رکھی جاسکتی۔ اور حالات حاضرہ کو تہ و بالا کرنے میں ہم کو اس امر کا کامل یقین ہے۔ کہ یہ عمل ابنائے ہند و سلطنت انگلستان کے بہترین مصالحہ کا موجب ہوگا۔

اِس رپورٹ کا لب لباب ایک قسم کی "دو عملی" کا نفاذ تھا۔ جس کا ایک صیغہ تو براہ راست عمالان حکومت کے زیر اقتدار ہے۔ اور دوسرا صیغہ جمہور کے نمائندگان میں سے سرکاری طور پر انتخاب شدہ وزرا کے زیر عمل ہے۔ اس سکیم کے ماتحت انجمن ہائے واضع قوانین کے ووٹروں کی تعداد اور وکلا جمہور کے اختیارات میں خاصہ اضافہ کیا گیا ہے۔ عہد سابق میں ان انجمنوں کا دائرہ عمل مشورہ تک ہی تھا۔ مگر اب یہ مغربی مجالس نیابتی کے مماثل کر دی گئی ہیں۔ اختیارات میں اضافہ ہوتے ہوئے پھر بھی بعض صیغہ جات مثلاً صیغہ مال وغیرہ ہیں۔ جس کے اختیارات سے وہ محروم ہیں۔ اس دفعہ کے یہ معنی ہیں۔ کہ حقیقی اختیار اب تک حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ رپورٹ میں یہ درج ہے۔ کہ یہ نظام کسی طور سے مستقل نہیں۔ بلکہ محض ایک مرحلۂ کار آموزی ہے۔ جب اہل ہند معاملات وضع و نفاذ قوانین ضبط آئین و حفظ امن کی اہم ذمہ واریوں کو بوجہ احسن سمجھ لیں گے۔ تو کامل حکومت خود اختیاری کے مستحق قرار دئے جائیں گے جس کے رو سے نہ صرف مالیات بلکہ عمالانِ حکومت کی نگرانی بھی انہیں کے ہاتھ میں ہوگی۔

اس سکیم اصلاحات میں ہندوستان اور انگلستان دونو ممالک میں کافی وشافی بحث ہو چکی ہے۔ اور ان آزاد مباحثات نے حقائق مسئلہ پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وطن پرست گروہ

اِس کے متعلق بالکل متضاد آرا رکھتے ہیں۔ اعتدال پسند فریق اِس نظام کا خیر مقدم کرتا ہے اور اِس پر دیانتداری سے عمل پیرا ہونے کا وعدہ کرتا ہے۔ مگر مخالف فریق اسے جسدِ بے روح۔ بیان بے معنی اور دامِ تذویر قرار دیتا ہے۔ اولذکر فریق نے سر دینشاہ واچا کی سرکردگی میں مندرجہ ذیل اعلان اِس کے متعلق شائع کرایا ہے۔ مجوزہ سکیم اصلاحات مرکزی حکومت کے باب میں اور کسی قدر اُور معاملات پر کچھ پیچیدہ اور قابلِ اصلاح معلوم ہوتی ہے۔ مگر من حیث المجموع ایک مترقیانہ نقطہ نظر کو ثابت کرتی ہے۔ اِن اصلاحات کی اصل غایت یہ ہے۔ کہ صوبجات کشورِ ہند کامل ذمہ وار حکومت حاصل کریں۔ اور عام طور پر دوراندیشی اور ہندوستانی سیاسی تمناؤں سے مخلصانہ ہمدردی کی سپرٹ میں تیار کی گئی ہیں۔ اور اِن کے مجوز اہلِ ہند کی غایت احسانمندی کے مستحق ہیں۔ فریق مخالف کے ایک لیڈر مسٹر تلک کی رائے یہ ہے۔ کہ اہلِ ہند کو اِس سکیم سے سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ مسٹر بپن چندر پال کی رائے یہ ہے۔ اگر اِس سکیم کو قبول کر لیا گیا۔ تو اِس کی آڑ میں عمالانِ حکومت انگریز پہلے سے کہیں زیادہ مستبد اور جابر ہو جائیں گے +

مخالف وطنیت گروہ کی رائے جس میں کچھ مسلمان اور نیچ ذاتوں کے ہندو شامل ہیں نہایت دلچسپ ہے۔ یہ ایک معنی خیز حقیقت ہے۔ کہ یہ دونو گروہ وطن پرست اعلےٰ ذات کے ہندوؤں کے برسرِ اختیار کل ہونے سے خائف ہیں۔ اور انگریزی استبداد کی پناہ میں اپنے وجود کی حفاظت سمجھتے ہیں۔ اِن گروہوں کا کثیر طبقہ گو وطن پرست نقطہ نظر کا مخالف ہے۔ مگر ایک وقیع تعداد اِن کی ہمخیال بھی ہوتی جارہی ہے۔ اِس مخالف گروہ کی تعداد میں روزافزوں ترقی ہوتی رہی ہے۔ اور اِس لئے نہیں کہ انہیں انتہا پرست فرقے سے ہمدردی ہے۔ بلکہ اِس لئے اِس زمانے میں انگریزی حکومت بدعہدی کر کے سلطنت عثمانیہ کی بیخ زنی پر آمادہ ہو بیٹھی تھی۔ ہندو گروہ نے مسلمانوں کی اِس معاملے میں ہمدردی اور معاونت کی جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہندو مسلمان اتحاد ایک ایسی حقیقت بن گئی۔ جیسی کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی +

اعلےٰ ذات کے ہندوؤں کا وطن پرست فرقے میں ہونا ادنےٰ ذات کی اعتدال پسندی کی دلیل ہے۔ برہمن یا اعلےٰ ذاتوں کے عودِ اقتدار سے خائف ہو کر ادنےٰ ذات نے اپنے حقوق کے لئے ڈاکٹر نائر کی سرکردگی میں ایک انجمن بنام نسوودرا انجمن قائم کی ہے۔ نسوودرا جماعت

کے اس خوف کی دلیل بعض برہمنوں کی وہ دھمکیاں ہیں۔ جن سے انہوں نے غیر برہمن طبقے سے ووٹ حاصل کئے۔ اور جن کے نہ ملنے کی صورت میں انہوں نے غیر برہمن ووٹروں کو ذات سے خارج کر دینے کا ڈراوا دیا ✦

ہندوستانی معاشرتی کی اِن مشکلات کو دیکھتے ہوئے کئی ایک ہمدرد انگریز جو دعوے "ہوم رول" کے حامی ہیں۔ نفاذ نظام خود اختیاری کے متعلق قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اور اِن باتوں نے اینگلو انڈین طبقہ کے نقطہ نظر کو تو قطعی طور پر قوی کر دیا ہے۔ اِس قسم کے ایک اینگلو انڈین نے رسالہ دیوان مدور کے صفحات میں لکھا۔ عوام کو سیاسیات سے کچھ لگاؤ نہیں۔ اور ہوم رول کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ انگریز حاکم ضلع پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ان کی تمنا صرف یہی ہے کہ حیوانی طریق سے اطاعت شعاری میں ثابت قدم رہیں۔ اور ان کو انگریزوں پر اس لئے بھروسہ ہے۔ کہ وہ غریبوں کے محافظ ہیں۔ اور نہ ہندو ہیں اور نہ مسلمان اور بالکل منصف مزاج ہیں۔ لارڈ سیڈنہم سابق گورنر بمبئی کہتا ہے۔ انگریزی طریق حکومت میں کئی ایک نقص ہیں اور اِن میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ مگر تمام اصلاحوں کی اصلی غرض بہبودی عوام ہونی چاہیئے۔ اگر بقول وائسرائے وزیر ہند اہل ہند کے مسلمہ سکون کو اب برباد کر دیا گیا۔ اور اہل ہند کے درمیان یہ سرگوشی ہونی شروع ہو گئی۔ کہ حکومت اب کمزور ہو چکی ہے۔ تو برہمن اور اعلےٰ ذاتوں کے لوگ اپنے عہد سابق کی روایات کو تازہ کرنے کے فکر میں لگ جاویں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ انگریز قوم کی نہایت ہی عظیم الشان کارگذاری ایک لمحے میں نیست و نابود ہو جائے گی ✦

مگر اِس کے ساتھ کئی ایک اور تجربہ کار انگریز بھی ہیں۔ جو سکیم اصلاحات کی حمایت میں ہیں لائنل کرٹس اور ویلنٹائن چرل کی یہ رائے ہے۔ اب نفاذ اصلاحات میں قطعاً تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ سوائے شدید خطرے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر آج ہمارے لئے ہندوستانی انتہا پسند فرقے کو اپنا خوشامدی بنانا ناممکن ہے۔ تو اِس طبقے کے عمل کار داسی میں ہو سکتا ہے۔ کہ ہم اعتدال پسند اصحاب کی خواہش ساتھ تعاون اور حسن عمل کا ثبوت دیں ✦

سکیم اصلاحات باقاعدہ طور پر پارلیمنٹ میں پیش ہو گئی۔ اور سنہ ۱۹۲۰ء میں طویل مباحثات

کے بعد اِسے قانونی جامہ پہنا دیا گیا۔ بدقسمتی سے رپورٹ کی اشاعت اور نفاذ قانونِ اصلاحات کے درمیانی اٹھارہ ماہ میں صورت حالات اور بھی بگڑ چکی تھی۔ اور ایسی خوفناک بے چینی پیدا ہو چلی تھی جس کی مثال پہلے کبھی دیکھی نہ گئی تھی۔

اِس امر کی چند وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ انتہا پسند فریق زیادہ شورش سے پارلیمنٹ کو خائف کر کے سکیم اصلاح کی مراعات سے زیادہ رعائتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور دوسرا سبب ۱۹۱۸ء کی شدید وبائے انفلوائنزا تھی۔ ساری دنیا سے بڑھ کر اِس کا منحوس اثر ہندوستان پر پڑا۔ اور چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ستر لاکھ جانیں تلف ہو گئیں۔ علاوہ بریں موسمی بارشیں نہایت کم ہوئیں فصلیں خشک ہو گئیں اور قحط سالی نے لوگوں کی رہی سہی امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں شدید قحط ہو گیا اور اِس سال کے موسم گرما میں کم و بیش تین کروڑ انسان فاقے کا شکار ہو گئے۔ اور پندرہ کروڑ کے قریب موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور اُس پر جنگ افغان کی مصیبت آنازل ہوئی۔ جس سے مسلمانوں کے برافروختہ جذبات اور بھی بھڑک اُٹھے۔

اِن تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سارے ملک میں بلوے۔ فساد۔ شورشیں برپا ہو گئیں جس سے حکومتِ انگریزی کو شدید خدشہ پیدا ہوا۔ یہ حالات اِس قدر نازک ہو چلے تھے۔ کہ حکومت نے ایک تحقیقاتی کمشن کا تقرر کر کے اِس کے سربراہ مسٹر رولٹ جج عدالت عالیہ انگلستان کو بے چینی کی بیخ کنی کے لئے قوانین وضع کرنے کی ہدایت کی۔ اِس کمشن کی رپورٹ نے ثابت کیا۔ کہ نہ صرف اعلےٰ طبقہ کے تعلیم یافتہ نوجوان بلکہ حکومت کی افواج کے سپاہی بھی خوفناک انقلابی خیالات سے متاثر ہو چکے ہیں۔ اور اِن خطرات کی مدافعت کے لئے نہایت شدید قوانین کی سفارش کی۔

حکومت نے اِن سفارشات کی بنا پر ایک مسودہ قوانین تیار کیا۔ جس کے رو سے ادنےٰ حکام کو بغیر ثبوت اور محض معمولی شبہ کی بنا پر خانہ تلاشی اور گرفتاری جیسے اہم اختیارات تفویض کئے گئے۔

اِس رولٹ لا سے لوگوں کا جذبہ بے چینی اور بھی بھڑک اٹھا۔ اور نہ صرف انتہا پسند لیڈروں بلکہ نہایت معتدل روش کے ہندوستانی مدبرین نے اِس کی شدید مخالفت کی۔ جب یہ بل کونسل

میں مباحثہ کے لئے پیش کیا گیا۔ تو سوائے ایک آدمی کے تمام نمائندگانِ جمہور نے اس کی مخالفت کی جس کے ہوتے ہوئے حکومت نے قانون کی قبولی محض سرکاری طور پر مقرر شدہ انگریز ممبروں کی کثرت رائے سے کر دی +

اب تو حالات دگرگوں ہو گئے۔ اہلِ ہند نے اس قانون کا نام "قانون عقرب سیاہ" رکھا انتہا پسند فرقے نے اس کے یومِ نفاذ یعنی جولائی ۶ ۱۹۱۹ء کو قومی روز ماتم قرار دیا۔ اور ملک کے تمام شہروں میں دھوم دھام کے جلسے کر کے عوام کے غیظ و غضب کو بڑھایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جابجا بلوہ اور فساد ہونا شروع ہو گئے۔ افسر قتل ہونے لگے۔ انگریزوں پر حملے شروع ہوئے اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ عام غدر ہوا ہی چاہتا ہے +

مگر حکومت کی سختی میں فرق نہیں آیا۔ احتجاج کا جواب دہانِ بندوق سے دیا گیا۔ اور ہوائی جہازوں سے مرد و زن پر تباہ کن بمب گرائے گئے۔ اس داستان قتل و غارت کا نہایت ہی منحوس حادثہ وہ ہے۔ جسے قتل عام امرتسر کہتے ہیں جس میں انگریزی سپاہ نے ایک کثیر مجمع کو گولیوں کی بوچھاڑوں سے ۰۰۷ جانیں تلف کرنے اور ۲۰۰۰ زخمی کرنے کے بعد پراگندہ کیا۔ ان تمام واقعات کے آخر میں حکومت نے اپنا اقتدار پھر سے قائم کر لیا۔ امن بحال کیا گیا۔ مفسد لیڈر قید خانوں میں بند کر دئے گئے۔ اور تحریک انقلاب زیر سطح کر دی گئی۔ سکیم اصلاحات نے بحالیِ امن میں امداد دی۔ مگر پھر بھی عام غصے میں تفاوت واقعہ نہیں ہوا۔ اہل ہند کا جوش محض دب سا گیا۔ اور ان کے مطالبات تسلیم نہیں کئے گئے۔ استبداد پسند انگریزوں کی یہ رائے قائم رہی کہ سقوط نظام جبری محض شورش اور مزید بد امنی کا موجب ہوگا +

اس طریق سے حکومت کا اقتدار کیسا ہی قائم کیوں نہ رہے۔ اس کی سکیم اصلاحات سے ہمدردی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ وطن پرست طبقہ تو یہ کہتا تھا۔ کہ یہ اصلاحات دام تزویر ہیں۔ اور ان سے محترز رہنا چاہیئے۔ مسلح بغاوت کو ناممکن سمجھ کر اب اس گروہ نے حکومت کو دق کرنے کے لئے ایک نیا ہتھیار ایجاد کیا۔ اور اس کا نام "عدم تعاون" رکھا اس عدم تعاون کے معنی صرف اصلاحی کونسلوں سے کنارہ کشی ہی نہ تھا۔ بلکہ انگریزی کچہریوں۔ مدرسوں۔ اور کالجوں سے اجتناب اور ہر قسم کے انگریزی مال کا بائیکاٹ۔ اس طریق عمل سے اہل ہند کا مطلب یہ تھا

کہ انگریزی چیزوں کو نجس اور انگریزوں کو ایک قسم کا "پارٹہیا" قرار دیگر ان کی حکومت کو بے اثر کردیا جائے اور اِس طور سے اقتدار خود اختیاری کو حاصل کیا جائے ۔

عدم تعاون کا گویا یہ طریق عمل تھا ۔ اور تحریک کے محرک مہاتما گاندھی ہیں ۔ جن کے زہد اور پارسائی نے ہندوستانی عوام پر اِس قدر اثر پیدا کردیا ۔ جو ان جیسے پارسا ہندوستانی ہمیشہ سے پیدا کرتے آئے ہیں ۔ مہاتما گاندھی کے پروپاغنڈا کی حقیقت مندرجہ ذیل بیان سے کھلتی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں ۔ کیا یہ تحیر خیز امر نہیں ۔ کہ ایک لاکھ سے کم انگریز تیس کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت کررہے ہیں ۔ ان کی حکومت کے کئی فعل بلاشبہ بزور تلوار ہوتے ہیں ۔ مگر تاہم اتنے بڑے ملک کی عام حکومت سوائے اہل ملک کے تعاون کے کبھی قائم نہیں رہ سکتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ۔ کہ ہم دن بدن اپنا انحصار ان پر کرنے لگے ہیں ۔ یہ یاد رہے ۔ کہ اصلاحی کونسلوں کی ممبری ۔ گورنری یا عدالت کی ججی حقیقی قومی آزادی کا بدل قرار نہیں دی جاسکتی ۔ بلکہ اُن کی اصلی غرض تو ہماری طاقت کو ضعیف کرتا ہے ۔ انگریز محض طاقت سے ہمارے ملک پر قابض نہیں رہ سکتے ۔ اور اِس قبضہ کو قائم رکھنے کے لئے وہ ہزار جائز و ناجائز وسائل کو کام میں لاتے رہتے ہیں ۔ اور اِن کی وجاہت کا بڑا ذریعہ ہماری بے پایاں دولت اور ہماری لاکھوں افواج ہیں ۔ اگر ہم آج ان کو اُن دو باتوں سے محروم کردیں ۔ تو آج ہی ہم سوراج یعنی حریت ۔ مساوات اور مردمیت کو حاصل کرسکتے ہیں ۔

تحریک عدم تعاون کی انتہائی آرزوئیں ابھی تک بر نہیں آئیں ۔ حکومتی اصلاحات پر ابتدائے ۱۹۲۱ سے عمل ہونا شروع ہوچکا ہے ۔ مگر اس سے جمہور کا ہیجان کم نہیں ہوا ۔ انتخابات کے موقعوں پر نہایت ہی معدود ووٹ اندازی ہوئی ہے ۔ اور لوگوں نے عام طور پر انگریزی مصنوعات اور انگریزی مدارس کا مقاطعہ کیا ہے یہ علامات ہندوستان کی عام بے چینی کی ہیں ۔ جو اب محض سیاسی ہی نہیں ۔ بلکہ معاشرتی بھی ہے ۔ صدی سابقہ کے تاثرات نے ہندوستانی معیارات اور نقطہ نظر میں نمایاں تغیر پیدا کردیا ہے جس پر بحث آخری باب میں ہوگی ۔ ان تمام امور کا لب لباب یہ ہے ۔ کہ انتہا پسند گروہ نے اِس عام بے چینی کو بنائے جد و جہد قرار دیا ہے ۔ اور اِس میں کلام نہیں ۔ کہ ان کا تعلق بولشوک تحریکات سے بھی ہے ۔ ننکانہ کی داستانِ خونین فسادات ملا بار بلوہ کٹار پور وغیرہ صاف ظاہر کر رہے ہیں ۔ کہ ہندوستانی زندگی کی سطحی امنیت کے نیچے شدید

مذہبی تعصبات اور نسلی اختلافات کے جذبات بھی موجود ہیں +

حقیقت امر یہ ہے۔ کہ زمانہ حال کا ہندوستان انقلابی اور ارتقائی اصولہائے ترقی کا میدان جنگ بن رہا ہے۔ اور یہ زمانہ نہایت ہی دشوار اور خطرناک ہے۔ عہد سابق کے حالات قطعی طور پر رخصت ہو رہے اور عہد مستقبل کے امکانات کی صحیح صورت اب تک پیدا نہیں ہوئی۔ یہ کہنا کہ ہندوستان آئندہ کی قسمت اچھی ہوگی یا بُری طاقت انسانی سے باہر ہے +

باب ہفتم

تغیرات اقتصادی

دنیائے جدید کا ایک نہایت ہی نمایاں واقعہ مشرق پر دوہری مغربی فتح ہے۔ جب لفظ فتح استعمال کیا جاتا ہے۔ تو دماغ میں یہ صورت بندھتی ہے۔ کہ سامانِ جنگ سے آراستہ فوجیں آپس میں زور آزما ہوتی ہیں۔ اور قوی عساکر کمزور پر غلبہ پاتے ہیں۔ مگر صدی سابقہ کے مشرقی انحطاط کے ہوتے ہوئے مغربیوں کو اِن ذرائع کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں پڑی +

اِس فتح کو دوہری فتح اِس لئے کہا گیا ہے۔ کہ اِس سے نہ صرف مشرقی سیاسی بلکہ اقتصادی آزادی کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ اور اِس اقتصادی فتح سے وہ وہ نتائج پیدا ہوئے جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا +

اِس اقتصادی تغیر کی اصلی وجہ یورپ کا صنعتی انقلاب ہے۔ جس طرح کولمبس اور واسکوڈے گاما کی بحری راہوں کی دریافت نے مغربی سیاسی طاقت کے لئے شاہراہ کا کام کیا۔ اِسی طرح مغربی اختراعات و بدائع نے مشرقی منڈیوں کا مالک مغربیوں کو بنا دیا۔ اِن اختراعات سے معلومات سائنس میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ اِس امر سے سیاسی فتوحات سے کہیں بڑھ چڑھ کر نتائج پیدا ہونے والے ہیں۔ اِس سے مغربی اقوام نہ صرف بنی نوع انسان پر بلکہ عالم نباتات۔ جمادات اور حیوانات پر قبضہ حاصل ہونے لگا۔ اور یہ تغیر تاریخ دنیا کا نہایت ہی غیر متوقع واقعہ ہے۔ انسانی ترقی آج تک بالعموم ارتقائی اصولوں سے ہوئی ہے۔ اور عہد قدیم سے لے کر ماسوائے بارود کسی اور تحیر انگیز ایجاد کی دریافت نہ ہوئی تھی۔

اٹھارہویں صدی کے گھوڑوں کے لشکر محض عہد عتیق کے مغربی اسپی رتھوں کی نقل تھے۔ اُور بادبانی کشتیاں زمانہ قدیم کی کشتیوں کے مماثل تھیں۔ مگر بھاپ بجلی تیل اُور گیس نے ایک چشم زدن میں دنیا کی کایا پلٹ دی۔ قدرت کی پوشیدہ طاقتیں روز روشن کی طرح آشکار ہوگئیں۔ فاصلے کی حقیقت نہ رہی اُور کرہ ارض انسانی مٹھی میں ایک گیند ہوگئی۔ اُور بنی نوع انسان جدید کی دنیا نہ صرف مدارج بلکہ نوع میں بھی دنیائے قدیم کی سی نہ رہی +

محررہ بالا فقرے میں میری مراد بنی نوع انسان سے صرف مغربی انسان کے ہیں۔ یہ اختراعات یورپی لوگوں کے دماغ سے نکلیں۔ اُور وہی ان کے ثمرات سے اول اول متمتع ہوئے۔ ان نئے حالات کے دو ستون ہیں۔ اُور وہ اول تو وقت کی اہمیت بڑھانے والا مشینی ذریعہ ساخت۔ اُور دوسرا فاصلے کو گھٹانے والے انجنی ذرائع باربرداری۔ ان دو وسائل سے یورپی ثروت میں ہزار چند اضافہ ہونے لگا۔ اُور براعظم یورپ دنیا کا کارخانہ بن گیا۔ فی الحقیقت انیسویں صدی کے وسط میں یورپ اپنے قدیمی زراعتی پیشہ کو چھوڑ کر ایسا خطۂ دنیا بن چکا تھا۔ جہاں اطراف وجہات سے پیداواریں اُور ناتمام حالت میں مال آتا تھا۔ اُور ان کی جگہ کارخانوں سے تکمیل یافتہ مصنوعات تمام گوشہ ہائے دنیا میں بھیجی جاتی تھیں +

جب یورپ اس درجہ ترقی کر رہا تھا۔ تو مشرق نہ صرف اپنی قدیمی معاشرتی روایات اُور توہمات کے گڑھے میں گرا ہوا تھا۔ بلکہ اس کے اقتصادیات بھی ابتدائی اُور اس کا فن حرب بھی اپنی اصلی صورت میں قائم تھا۔ بلکہ حقیقت امر تو یہ ہے کہ اہل مشرق کو اقتصادیات سے اس نقطے کے صحیح معنوں میں تعلق ہی نہ تھا۔ اس کی آبادی کا ذریعہ معاش زراعت تھی۔ اُور اس کا نظام ایک گاؤں کی بہم وجوہ مکمل زندگی کے درجے سے ترقی نہ پاچکا تھا۔ مشرقی صنعتی زندگی کا مفہوم چھوٹی چھوٹی بستیوں کا تھا۔ جہاں لوگ ہر ایک خاص چیز کو ہاتھ سے بناتے تھے۔ اُور اسے بیچ کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ان کی صنعتی اشیا گو نہایت نفیس ہوتی تھیں۔ مگر بوجہ دستی ساخت اول تو ان کی مقدار محدود ہوتی تھی۔ اُور دوسرے ان کی قیمت نہایت گراں ہوتی تھی۔ بدیں وجہ ان اشیاء کی اُجرتِ ساخت کے قلیل ہونے کے باوجود مشرقی دستی کارخانے مغربی اُور امریکی مشینی کارخانوں کا مقابلہ نہ کیا کرسکتے۔ موخرالذکر کے اصول ہائے کثیر سازی و ارزاں فروشی سے انہیں خود اپنے ممالک

میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا +

مغربی مصنوعات سے مقابلہ نہ کر سکنے کی ایک وجہ اہل مشرق کا طریق تخیل اور کثیر سرمائے کا فقدان بھی تھا۔ مشرقِ قریب و بعید کے تمام ممالک میں اقتصادی زندگی دیرینہ حیثیت کی بناؤں پر قائم تھی۔ اور مغربی اصولِ اجارہ و مقابلہ کا علم کسی کو نہ تھا۔ فلاحین اور کاریگر اپنے اپنے آبائی پیشوں کو آبائی دستور کے مطابق کر رہے تھے۔ اگر مقابلے کی روح ناپید تھی۔ تو معیار صنعت کو بڑھانے کی تحریص بھی نہ تھی۔ اور رفع الحالی کا کسی کو خواب بھی نہ آتا تھا۔ تمام چیزوں کی ساخت مقررہ صورت میں مقررہ قاعدوں کے مطابق ہوتی تھی اور نو آموزوں کو اپنے اجداد کے طریق عمل پر سبقت لیجانے کا خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔ جلب منفعت اور فائدہ اندوزی کا ذریعہ ہونے کی بجائے مصنوعات کا طریق ساخت بھی ایک طرح کی اوامر مذہبی بن چکا تھا۔ جس کے اصول غیر متبدل اور راز سینہ بسینہ سمجھے جاتے تھے +

چند ایک نوجوان اور حوصلہ مند طبیعتیں جو ان حالات کو بدلنا چاہتی تھیں۔ بوجہ فقدان سرمایہ مجبور تھیں۔ تجارتی کاروبار کے لئے سیّال سرمایہ جو کسی منفعت بخش صنعت میں لگایا جا سکے موجود نہ تھا۔ ہر ایک مشرقی امیر یا غریب کی رائے روپے کے متعلق یہ نہ تھی کہ اسے کسی کاروبار میں لگا کر اس کی مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ بلکہ اسے "جمع" کے طور پر رکھا جائے۔ جس سے رفع ضرورت ہو سکے۔ مشرق میں زر و سیم زیورات کی صورت میں بطور گنج نہاں اور جواہرات کی قیمت ایک بڑی تعداد تک پہنچتی ہے۔ ایک انگریز کہتا ہے۔ میں حال میں ایک مہاراجہ کا گنج دیکھنے گیا۔ ایک تہ خانے میں نے بڑے بڑے گنگا جمنی طبل دیکھے جن میں ہزاروں ہیرے جواہرات بھرے پڑے تھے۔ دیواروں میں کھونٹیاں گڑی ہوئی تھیں۔ اور ان کھونٹیوں سے سونے کی سلاخیں معلق تھیں۔ جب ملازم جواہرات کو مٹھیوں میں لے کر نیچے گرانا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آب شفاف کے بڑے بڑے قطرے نیچے گر رہے ہیں۔ ہندوستان میں سینکڑوں مہاراجے اور نواب ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا "گنج ریاست" ہے۔ علاوہ بریں ہر ایک ہندوستانی روپے کو سونے یا چاندی کی صورت میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ اسے کاغذی سکے پر بھروسہ نہیں۔ اس کی دولت اس کی بیٹی یا بیوی کے بازوؤں اور گلے میں سے لٹکی رہتی

ہے۔ اور یا کسی مقام معلومہ میں پوشیدہ ہوتی ہے +

یہ یاد رہے۔ کہ یہ حالات آج کل کے ہیں۔ جب کہ ہندوستان پر مغربی اقتدار ایک صدی سے قائم ہے۔ اور اس پر مغربی حالات کا ایک گونہ اثر ہو چکا ہے۔ گو یہ حالات اب متغیر ہو رہے ہیں۔ اور یہ حقیقت سارے کے سارے مشرق پر ایک سی ہے۔ زمانہ قدیم میں جب کہ اسلامی امتناع سود خواری اور دوسرا عدم تحفظ سیاسی تھا۔ فقدان سرمایہ کی حقیقت کو سمجھ لینا مشکل نہیں۔ البتہ ایک صورت روپیہ پیدا کرنے کی ساہوکاری تھی۔ جو بدقسمتی سے شدید شرائط بیاج اور محرک عیاشی بدکرداری و اصراف ہو کر قرضدار جماعت کی برکت نہیں۔ بلکہ تباہی کا موجب تھی +

اس قدیم طریق کاروبار کے ہوتے ہوئے بھلا مغربی گرم بازاری کا کیا مقابلہ ہو سکتا۔ ہر جگہ سستی اور مشین ساختہ مغربی مصنوعات مہنگی اور دستی ساخت کی چیزوں کی سرد بازاری کرنے لگیں۔ اور اس کی ایک ادنے مثال صرف یہی کیا کم ہے۔ کہ مانچسٹر کے مشین ساختہ کپڑے نے ہندوستانی پیشہ بافندگی کا سرے سے خاتمہ ہی کر دیا۔ بعض ہندوستانی ہندوستانی مصنوعات بالخصوص پارچہ بافی کے انحطاط کو انگریزی سیاسی اقتدار کا لازمی نتیجہ بتلاتے ہیں جس کی سند میں وہ انگریزوں کو ان افعال کو پیش کرتے ہیں جس سے انہوں نے لنکا شائر ساختہ مال کے کاروبار کو ترقی دی اور ہندوستانی جولاہوں کے ہنر کی قریب قریب بالجبر پامالی کی۔ اور انگریزی افعال سے انگریزی مصنوعات کی فروخت کا راستہ صاف کر دیا۔ یہ ممکن ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ منڈی آخر بھی انہیں مصنوعات کے ہاتھ آتی تھی۔ خود ایران اور ترکی کی حالت دیکھ لیجئے۔ جہاں دستی ساخت کی ملکی مصنوعات کا یہی حشر ہوا +

اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ خود ہندوستانیوں نے سستے بدیشی مال کو مہنگے سودیشی مال پر ترجیح دی ہے۔ کیوں ایک مغربیوں کے لئے ہندوستانیوں کا پائدار اور بدرجہا نفیس سودیشی چیزوں کو چھوڑ سستی مگر بھونڈی اور کمزور بدیشی چیزوں کو خریدنا ایک معمہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اکثر اہل مشرق فنون نفیسہ کے ماہر نہیں۔ اور بسا اوقات وہ قوت لایموت کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ سستی چیزوں کے طالب ہیں۔ اور بس۔ اس کے علاوہ بعض اوقات مغربی ممالک سے ایسی اشیا آتی ہیں۔ جن کی ضرورت اشد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سلائی کی

مشین اور لمپ کا نام لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہاں ان میں سے بعض انوکھی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ سستی اشیائیں ضرورتیں پیدا کرتی ہیں۔ اور معیار معاشرت بالائتر ہو گیا ہے۔ ایک امریکن مبصر لکھتا ہے۔ اختراعات جدید نے تمام دنیا میں جدید حوائج پیدا کر دئے ہیں۔ اب چینی دہقان پیتل کے دیئے میں موٹا تیل جلانا نہیں چاہتا۔ اب اسے مٹی کے تیل کا لمپ چاہیئے۔ اور یہی حال ان کے گھڑیاں خریدنے کے شوق کا ہے۔ علیٰ ہذا شامی عرب اب پرانی وضع کے مکانوں سے مطمئن نہیں۔ بلکہ اب وہ عمارات میں سُرخ کھپریل لگاتے ہیں۔ جو فرانس سے بن کر آتی ہیں۔ ہر جگہ غیر ملکی اشیاء کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ مشرق میں تعلیم کا چرچا ہو رہا ہے۔ اور اس سے نئی ضروریات پیدا ہو رہی ہیں۔ اب انہیں ایسی چیزوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ جن کی ان کے اجداد کو خبر بھی نہ تھی +

ایک ہندوستانی اہل قلم جو اجنبی حکومت کا مخالف ہے۔ کہتا ہے۔ ہندوستانی دستکار اپنے مال کی سرد بازاری دیکھ کر ہر جگہ زراعت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ نیویارک اور باکو کا سستا تیل ہندوستانی تیلی کے کام کو تباہ کئے دیتا ہے۔ اعلےٰ درجے کے خوبصورت پیتل اور تانبے کے برتن سستے مغربی تام چینی کے برتنوں کے آگے ماند پڑ گئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ مشرقی مذاق میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ملک کے دور دراز مقامات کی پُرانی دستکاریوں کو مغربی مصنوعات کے حملے دم لینے کی مہلت نہیں دیتے اور مقابلہ کی روح نے ہر جگہ مشرقی تجارتی حالات کو درہم برہم کرنا شروع کر دیا ہے +

مگر یہ تغیرات محض مغربی مصنوعات کا نتیجہ ہی نہیں۔ بلکہ مغربی سرمائے سے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ منفعت خیز کاروبار کے مواقع نے مغربی اہل ثروت کو اپنی دولت کو مشرقی تجارت میں لگانے پر مائل کیا ہے۔ اور چونکہ مشرق میں اسی قسم کا سیال سرمایہ موجود نہیں۔ اہل مشرق نے بھی اس سرمائے سے اپنا کام نکالنا شروع کیا ہے۔ ریلیں۔ باغات چائے۔ قہوہ وغیرہ۔ اور اسی قسم کے بڑے بڑے کاروبار آئے دن پیدا ہو رہے ہیں۔ اور ان تمام سے بڑھ کر تحیّر خیز وہ منظر ہے۔ جس میں امریکی سرمائے سے چین کی سرزمین پر وسیع کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں۔ اور مغربی طریق کی مشرقی مزدوری پیشہ بستیاں جابجا قائم ہو رہی ہیں +

مشرقی کاروبار کی اس نئی صورت پر باب پنجم آئندہ میں بحث ہوگی۔ اس وقت ان مطالبات کے اقتصادی پہلوؤں تک سلسلہ کلام کو محدود رکھا جائیگا۔ نیز چونکہ اس کتاب کا مدعا صرف مشرق وسطیٰ و قریبہ کے حالات کا جائزہ ہے۔ چین و جاپان کے معاملات کو علیحدہ رہنے دیا جائیگا۔ گو مشرق اقصےٰ کے حالات مشرق قریبہ کے حالات کی ہوبہو تصویر ہے۔

ان صنعتی جدتوں کا قیام و نظام ابتدا میں تمامتر مغربیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اور یہ قدرتی بھی تھا مغربی لوگ جانتے تھے۔ کہ اہل مشرق اب تک روپے کا منظم استعمال نہیں سیکھے۔ یہاں کا طمع سریع فائدہ اندوزی اور اجتماعی کوشش کا فقدان مغربی سرمائے کے مفید استعمال کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ حالت اب نہیں رہی۔ خود ایک جماعت مشرقی سرمایہ داروں کی ایسی پیدا ہوچلی ہے۔ جو مغربی اصول کارخانہ داری و کاروبار سے آگاہ اور مغربی طریق پر کام کرنے کی متمنی ہے۔ باب دوئم میں اس خیال کے اسلامی تاجروں کا ذکر ہوچکا ہے۔ اور غیر مسلم اصحاب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ غیر مسلم طبقے میں پارسی اور بنیوں کی جماعتیں ایسی پہلے ہی سے موجود تھیں جن کو کاروباری معاملات سے خوب واقفیت تھی۔ اور زمانہ حال کے کارخانہ دار زیادہ تر انہیں جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی کے بڑے بڑے سن کے اور پارچہ بافی کے کارخانے اور ٹاٹا کمپنی کا عظیم الشان کارخانہ آہن تمامتر اہل ملک کے سرمائے اور حسن انتظام سے چل رہے ہیں۔ مگر ان معدودے چند کامیاب نظیروں کے بالمقابل ناکام مثالیں بھی ملیں گی۔ پھر بھی اہل مشرق کاروبار جدید کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔

اس متحدہ مشرقی اور مغربی کوشش کا نتیجہ یہ پیدا ہوگیا ہے۔ کہ مشرق کے مختلف ممالک میں یورپی وضع کے کارخانے بکثرت قائم ہورہے ہیں۔ ایک فرانسیسی لکھتا ہے۔ دریائے نیل کے دونو طرف سربفلک چمنیاں شکرسازی کے ان بے شمار کارخانوں کی شاہد ہیں۔ جو مصر میں قائم کئے جاتے ہیں۔ تھیوڈور مارسین کہتا ہے۔ بمبئی کا اقتصادی انقلاب تو اب ایک مسلمہ بات ہے۔ بمبئی ہر معنی میں ایک جدید صنعتی شہر ہے۔ جہاں کاروباری زندگی کے اچھے اور برے پہلو دونو نظر آئیں گے بمبئی میں وہ گنجان آباد شہر کے حصے بھی ہیں۔ جہاں مزدوری پیشہ آبادی مثل بلاد مغرب دھوبیوں کی طرح اپنی زندگی کے دن پورے کرتی ہے۔ اور تنگ و تاریک کارخانوں میں کئی کئی گھنٹے ایک وقت کام کرتی ہے۔ اور وہاں لکھ پتی تاجر بھی ہیں۔ جن کی ملوکانہ فیاضیوں نے بلدے کی گزرگاہوں

کو خوبصورت بنانے میں مدد دی ہے۔ یہ شہر کی ثروت تہذیب اور مذاق کی علامات ہر طرف نظر آتی ہیں۔ مضافاتی بستیاں اور بھورے بھورے کھیت اب اس علاقے کی داستان ماضی ہو چکے ہیں۔ اور یہ ہندوستان کے عہد مستقبل کی ایک علامت ہے +

بے پایاں قدرتی پیداوار اور نہایت ہی سستی شرح مزدوری نے ہندوستانی سرمایہ داروں کے حرص ہوس کے لئے تازیانے کا کام کیا ہے۔ ایک ہندوستانی ماہر اقتصادیات لکھتا ہے۔ ہندوستانی مزدوری اور انگریزی سرمایہ دنیا کی ارزاں ترین اجناس ہیں۔ ایک گروہ اہل مشرق کا ایسا ہے۔ جو نہ صرف مشرقی صنعتی کاروبار کا دلدادہ ہی ہے۔ بلکہ ایسا معتقد کہ اسے انجام کار مغربی تباہی کا ذریعہ بنانے کا متمنی ہے۔ ایک ہندوستانی اہل الرائے فرماتے ہیں۔ ایک طریق سے مشرق واقعی مغرب کو زک دیا چاہتا ہے۔ اور تحریص ہے ایشیا کی صاف گوئی اور صداقت پر کہ اس ارادے کو کسی طرح سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ مشرقیوں نے مغربیوں کو اقتصادی للکار بتادی ہے۔ اور اب سے مغرب اور مشرق کے درمیان اقتصادی جنگ کی ٹھن چکی ہے۔ مغرب کی ایک ہی کوشش ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کشمکش میں اپنا پنجہ مشرقی منڈیوں پر مضبوط رکھے۔ مگر مشرق اسے اس جگہ سے ہٹاتا رہیگا۔ آج مشرقی کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ صنعتی کامیابی کا راز طریق و ذرائع صنعت کی اصلاح میں ہے۔ وہ مغربی اصول کاروبار سے مسلح ہو کر انہیں ہتھیاروں کو مشرقی حالات کے مطابق درست کر کے مغربی اقتصادی اقتدار پر حملہ کریں گے۔ اور اسے مشرقی میدان سے مار باہر کریں گے +

اس بیان کی تصدیق کئی ایک پختہ کار اہل بصیرت یورپیوں نے بھی کی ہے۔ جب یہ سطور لکھی جا رہی تھیں۔ ایک امریکن ماہر اقتصادیات مشرق کا دورہ کر رہا تھا۔ اس کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے۔ ایشیا کے افلاس کے دو اسباب ذمہ دار ہیں۔ مشرقی حکومتوں کا ناقص تعلیمی نظام اور مشرقی کارخانہ داروں کی مشینری کے فوائد سے بے خبری جہالت اور مشینوں کی کمی ایشیا کی درماندگی کے موجب ہیں۔ علمی معلومات اور سرمایہ اوزار امریکہ کی خوشحالی کی بنیاد ہیں۔ مگر یہی امریکی کہتا ہے۔ خبردار۔ ایشیائی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ اور وہ اپنے حالات کی اصلاح کر رہے ہیں۔ اور اب ہمیں دن بدن اس مقابلے کے لئے تیار ہونا چاہیئے جو بیدار

ہونے والی قومیں اپنے افلاس اور عسرت سے علیحدہ ہونے سے پیدا کرتی ہیں۔ آج اہل مشرق اس جنگ عظیم کی تیاری کر رہے ہیں جس کی ظاہری شکل اقتصادی مقابلہ ہوگا۔ مگر معنوی سبب یورپی اقتدار سے ایشیا کی تمنائے آزادی۔ آج کل ایشیا کے ہر گوشے میں کارخانے اور کوٹھیاں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں بن رہی ہیں۔ تھیوڈور ماریسن لکھتا ہے۔ ہندوستانی اقتصادی انقلاب کے دن آن پہنچے۔ وہ تمام اسباب جو وسائل جدید کو اختیار کرنے کے مانع تھے۔ معدوم ہو رہے ہیں۔ ذرائع باربرداری اچھے اور تیز رفتار ہو رہے ہیں۔ نئے کاروبار شروع کرنے کے لئے سرمایہ آسان شرائط پر مہیا ہو سکتا ہے۔ یورپی انجینئر، منیجر معمولی مشاہروں پر نوکر رکھے جا سکتے ہیں۔ جن سے نوجوان ہندوستانی کام سیکھ کر پھر بغیر مدد کے وہی کام کر سکتے ہیں۔ بیرونی حملوں سے بے خطری اور اندرونی امنیت وسیع کاروبار کے معاون ہیں۔ ان تمام حالات سے ہندوستان کی ثروت میں محیر العقول اضافہ ہوا چاہتا ہے۔

مشرقی کاروباری و انتظامی ناتجربہ کاری کے نتائج کا ازالہ حد درجہ کی سستی مزدوری سے کر دیا جاتا ہے۔ جس شرح پر ایشیائی مزدور روزانہ کئی گھنٹے کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے

مغربی کارخانہ داروں کے لئے موجب حیرت ہے۔ ایک انگریز ماہر اقتصادیات بریلزفورڈ ۱۹۰۸ء میں مصر کے متعلق لکھتا ہے۔ مصر میں کسی قسم کا قانون کارخانہ داری نہیں ہے۔ اور سارے ملک میں روئی صاف کرنے کے کارخانے لگے ہوئے ہیں۔ جن میں عارضی کام کرنے والے مزدور برآمد کے لئے روئی کے گٹھے باندھتے ہیں۔ اُن کی مزدوری کی شرح یہ ہے۔ بالغ سات آنے یومیہ۔ اور خوردسال چھ آنے یومیہ۔ اور اس اُجرت کے عوض ان کو ۲۴ گھنٹوں میں عموماً بارہ اور بعض اوقات ۱۷ سے ۱۸ گھنٹوں تک کام کرنا پڑتا تھا بعض دفعہ نابالغ مزدوروں کو رات کو ڈیوٹی پر لگایا جاتا تھا جو بارہ گھنٹے کی ہوتی تھی۔

ہندوستان کے حالات بھی کم و بیش ایسے ہی ہیں۔ سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۰۷ء میں کمشن تحقیقات کارخانجات کا تقرر ہوا۔ اس کی رپورٹ کا ماحصل یہ ہے۔ بمبئی میں روزانہ اوقات مزدوری تیرہ سے چودہ گھنٹوں تک ہیں۔ کلکتہ کے سن کے کارخانوں میں مزدور روزانہ پندرہ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ روئی صاف کرنے والے مزدور روزانہ سترہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتے

ہیں۔ آٹے کی چکیوں میں سترہ گھنٹے اور ایک نظیر تو ایسی بھی ہے۔ کہ ایک مطبع کے ملازموں کو مسلسل ایک ہفتہ روزانہ بیس گھنٹوں سے کر بائیس گھنٹے تک کام کرنا پڑا۔ مزدوری کی شرحیں بھی ملاحظہ ہوں۔ بالغ مرد مزدور کی پندرہ گھنٹوں کی اجرت بیس روپیہ ماہوار۔ چھوٹے بچے جن کی عمر بعض حالتوں میں آٹھ سال تک ہوتی تھی۔ بعض اوقات آٹھ گھنٹے تک کام کرتے تھے۔ ان انکشافات کی بنا پر حکومت نے ایسے قوانین وضع کئے ہیں۔ جن سے مردوں۔ عورتوں اور بچوں کے حالات کی اصلاح ہو۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں فرانسیسی ماہر اقتصادیات البرٹ میتان نے ہندوستانی کارخانوں کا معائنہ کیا۔ اور غائر مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا۔ وہ کہتا ہے۔ قانون کارخانجات کی بار بار عدم تعمیل ہوتی رہتی ہے۔ اور اب بھی بسا اوقات پندرہ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ اس پر شرح مزدوری نہایت ہی ناکافی۔ بمبئی میں مزدوروں کی اجرت پانچ آنے سے دس آنے تک ہے۔ اور انتہائی اجرت سوا روپیہ ہے۔ عورتیں اور بچے پانچ آنے یومیہ پاتے ہیں+

ان حیرت انگیز حالات کے ہوتے ہوئے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اگر مشرقی سرمایہ داروں کو کافی سرمایہ اور مشینری بہم پہنچائی جائے۔ تو یورپ کا کامیاب مقابلہ تو کیا خود یورپ کی منڈیوں پر قابض ہو بیٹھیں۔ اور اس کا خوف کئی ایک مغربی مبصروں کو لگا ہوا ہے۔ پون صدی ہوئی ایک فرانسیسی گوبنیو نے یورپ پر مشرقی اقتصادی حملے کی پیشین گوئی کی تھی۔ اور تھوڑے سال ہوئے بریلز فورڈ نے بھی مغربی سرمایہ داروں کو اپنا روپیہ مشرقی ممالک میں لگانے کے نتائج سے آگاہ کیا تھا۔ مگر جہاں تک مشرق قریب و وسطیٰ کا تعلق ہے۔ ایسی کوئی بات ابھی تک نہیں ہوئی۔ چین سے شاید ایسے حملے کی ابتدا ہو۔ مگر جہاں تک ہندوستان یا وسط ایشیا کے کسی اور ملک کا تعلق ہے۔ ایشیائی کارخانہ دار شاید ہی یورپ اور امریکہ کے کارخانہ داروں سے کامیاب مقابلہ کر کے ان کے کاروبار کو صدمہ پہنچا سکیں۔ ہندوستان میں جہاں کثیر حصہ آبادی غریب اور فاقہ کشی میں مبتلا ہے۔ کارخانہ دار کافی اور قابل اعتبار مزدور مہیا نہیں کر سکتے۔ اوقات مزدوری کے طویل ہونے سے شاید یہ خیال پیدا ہو۔ کہ مشرقی مالکان کارخانہ سستا مال پیدا کر کے مغربی مصنوعات کو شکست دیں بے بنیاد خطرہ ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ ایسے کاریگروں کا بنایا ہوا سامان نہایت ہی گھٹیا قسم کا ہوتا ہے۔ اور یہ کاریگر خود ایسے ضعیف و لاغر ہوتے ہیں۔ کہ جو کام یہ تین مل کر کر سکتے ہیں۔

مغربی کاریگر اکیلا ہی کر دیتا ہے۔ نیز ہندوستانی کاریگروں میں نہ تو کافی جسمانی طاقت نہ اعلےٰ درجے کی مہارت اور نہ کام کرنے کی خواہش ہی ہوتی ہے۔ ہندوستانی بالعموم کارخانوں میں کام کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور جو کارخانوں کی ملازمت کر بھی لیتے ہیں۔ وہ آبادی کا ادنےٰ ترین طبقہ ہوتے ہیں اور جونہی اِن کے پاس کچھ نقدی جمع ہو جاتی ہے۔ وہ کارخانوں کو چھوڑ کر کسی اور کام کی تلاش میں پڑ جاتے ہیں۔ بنا بریں ہندوستانی کارخانوں کے مزدور کبھی اعلےٰ درجے کے کاریگر ہونے نہیں پاتے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر اُن کی اجرتوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ تو پھر یہ لوگ اچھا کام کر سکیں گے۔ اس کا جواب ایک ہندوستانی صاحب دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ہندوستان کے کارخانے ہمیشہ اچھے کاریگروں سے محروم رہیں گے۔ سستی مزدوری اور بے دلی سے کیا ہوا کام انجام کار زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستانی مزدوری پیشہ افراد بالعموم جاہل ہوتے ہیں۔ اُن کو نہ تو اپنے کام سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اور نہ اُن کا تعلق کارخانداروں سے ہوتا ہے۔ اور شہروں کی مزدوری پیشہ آبادی کی رہائش کسی مقام میں مستقل نہیں ہوتی۔

اِن اسباب کی بنا پر ہندوستانی صنعتی کاروبار کو متوقع ترقی نہیں ہو سکی۔ ایک سرکاری صنعتی سالنامے میں مندرجہ ذیل بیان درج ہے۔ ہندوستان میں قدرتی پیداوار اور صنعتی امکانات تو بہت ہیں۔ مگر صنعتی مہارات کی کمی ہے۔ اِن حالات کے ہوتے ہوئے آئندہ کے متعلق کسی طرح کی کوئی اچھی امید بندھ نہیں سکتی۔ اقتصادیاتِ ہند کے متعلق ایک انگریز مبصر کا قول ہے۔ کچھ سال ہوئے۔ امید کی جاتی تھی۔ کہ ہندوستانی صنعتی کاروبار مغربی اصول عمل اور مغربی مشینری کی مدد سے معیاراتِ جدیدہ کے مطابق اپنی صنعتی پوزیشن قائم کر سکیگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چین اور ہندوستان کی سستی مزدوری اور زمانہ حال کے رختِ صنعت کے استعمال سے یورپی اقتصادی حیثیت کو ضعف پہنچیگا۔ میرے نزدیک یہ محض ڈراوا ہے۔ اگر کوئی خطرہ ہے۔ تو وہ ایک اور ہی قسم کا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جہاں ایشیا ایک قدم آگے مارتا ہے۔ یورپ دو۔ جب ایشائی سائیکل کی سواری سیکھتے ہیں (بنانا تو در کنار) تو یورپی ہوائی جہازوں کی ساخت کی تکمیل میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ عام حالت کا خلاصہ ہے۔ جنگ نے یورپ کی صنعتی رفتار اور بھی تیز کر دی ہے۔ مگر اہل ہندوستان جہاں تھے وہی ہیں۔ اور اب

تک اِس ملک کے کاروباری حالات عہدِ سابقہ کی روایات سے نکلنے نہیں پائے۔ اِس کی عظیم ترین صنعت یعنی زراعت میں تو اونے درجے کی کلیں بھی کام میں نہیں لائی گئیں۔ اِس سے میری مراد یہ نہیں۔ کہ اہلِ ہند ہمیشہ اسی حالتِ جمود میں رہیں گے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا ہوگا۔ کہ بُعد مشرق و مغرب زیادہ ہو رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ ہندوستان کی تیس کروڑ آبادی کا آخر کیا حشر ہوگا۔ مجھے خوف ہے۔ کہ مشرق میں صنعتی کاروبار کے بدترین پہلو اپنا سر نہ اٹھائیں۔ اور اِس برِاعظم کے لوگ دُنیا کے خوشحال ممالک کے مقابلے محض ننگوں بھوکوں کی فوج نہ بن جائیں +

محررہ بالا مایوس کن بیانات سے ایک حقیقت پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ مشرق آج کل معرضِ انقلاب میں ہے۔ اور زمانہ انقلاب ہمیشہ غیر تیقّن اور کسی قدر غیر پسندیدہ ہوتا ہے۔ جو حالات شہروں کی مزدوری پیشہ لوگوں کے ہیں۔ اِن کے اثرات سے دوسرے طبقوں کے لوگ بالکل محفوظ نہیں۔ چھوٹے چھوٹے دستکار اور تاجر بھی اِن بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ گو زراعت پیشہ حصہ ملک کسی قدر اِس کشاکشی سے الگ تھلگ ہے۔ مشرقِ قدیم کا طرزِ زندگی جیسے پہلے تھا۔ سو اب نہیں رہا اور نہ رہیگا۔ وہ دِن گئے۔ جبکہ افلاس کے ہوتے ہوئے زندگی کے دِن پھر بھی سہل سے کٹ جاتے تھے۔ اور لوگ کام کی مہارت اور کثیر کاری کے عادی نہ تھے۔ سوداگر اپنی دکانوں پر پالتی مارے۔ اللہ اللہ کرتے رہتے تھے۔ اور سہج سہج سے لین دین کرتے تھے۔ بلکہ اگر کسی جلد باز گاہک کا ان سے واسطہ پڑتا تھا۔ تو ان کی طبیعت گھبرا جاتی تھی۔ ہر ایک دستکار کے کام کے اوقات اپنے اپنے ہوتے تھے۔ جب جی میں آیا کام پر جا بیٹھے۔ اور جب دِل چاہا ہتھیار ہاتھ سے رکھ دئے کسان تو اور بھی سہل رو تھے۔ صبح کو نور کے تڑکے اٹھے۔ دوپہر تک کام کیا اور لمبی تان کے سو رہے۔ سہ پہر گئی اٹھے اور ٹھنڈے ٹھنڈے مویشی کا گھاس چارہ تیار کیا۔ اور گھر آگئے۔ نہ کسی کی جلدی تھی۔ اور نہ کسی کا جبر +

ایسے لوگوں کے لئے مغربی پابندی اوقات و ضوابط کی تقلید۔ اول تو نہایت ہی مشکل ہوگی۔ اور دوسرے اگر ان اصولوں پر عمل کرنے کی خواہش موجود ہو۔ تو بھی ان کے عادی

ہونے کے لئے ایک زمانہ چاہیئے۔ اور جس وقت یہ صورت پیدا بھی ہو جائے۔ اہل مغرب کئی ایک منزلیں اور طے کر چکے ہوں گے۔ ایک انگریز مسلمان ترکوں کے گذشتہ پچاس سال کا ذکر کرتے ہوئے ارمنیوں اور یونانیوں کی ترقی کا حوالہ دیتا ہے۔ جو انہوں نے مغربی اصولوں کی محض جزوی تقلید سے حاصل کی۔ وہ کہتا ہے۔ ایشیا کوچک میں تجارتی مقابلے کی غیر حاضری میں لوگ اپنے آبائی اصولوں پر کاربند رہے۔ گو ان حالات کا عوام پر اسوقت اثر نہ ہوا۔ مگر اس سے وہ مغربی مستعدی کی سپرٹ سے بے خبر رہے۔ اور آج کل کے حالات اِس زمانے کی پس ماندگی کا خمیازہ ہیں۔ نہ ثروت پیدا کرنے کی سہولتیں تھیں۔ اور نہ اہل ثروت موجود تھے۔ جو کسی بڑے کاروبار کی تنظیم کر سکتے۔ ہاں! ادنےٰ حیثیت کے دوکاندار اور مزارعین ہر جگہ تھے۔ مگر یہ بیچارے بھلا کیا کر سکتے۔ اب جبکہ مغربی ہمہ گیری کا دورہ ہو رہا ہے۔ تو ترک اپنے آپ کو نہ صرف سیاسی بلکہ معاشرتی اور اقتصادی مشکلات کا شکار پاتے ہیں +

ہندوستان میں زمیندار گروہ کی ناعاقبت اندیشی اور عدم مستعدی کے نتائج بقول ایک فرانسیسی ماہر اقتصادیات نہایت ہی ناخوش آیند ظاہر ہو رہے ہیں۔ زمانہ جدید کی چستی سے بیخبر اب وہ ان لوگوں کے ہاتھوں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہے ہیں جنہیں زمانے کی خبر ہے۔ اور جن کے پاس پیسہ ہے۔ اور یہ حالت معمولی زمینداروں ہی کی نہیں۔ بلکہ اعلےٰ طبقہ کے تعلقداروں کی بھی جن کے اسراف اور جن کی عیاشی نے ایک طرف تو ان کی اپنی آمدنی کم کر دی ہے۔ اور دوسری طرف ان کو ہوشیار مہاجنوں کا دست نگر بنا کر زمین کی آئندہ ملکیت کو معرضِ خطر میں ڈال دیا ہے۔ یہ فرانسیسی کہتا ہے۔ "عجب نہیں ایسے حالات میں چند ہی روز میں ہندوستان کے زمیندار بیچ بانٹ کر آخیر میں محض معمولی مزارعین رہ جائیں اور زمین کے مالک ان کے چلتے ہوئے قرضخواہ ہو جائیں۔ جنہوں نے زمانے کی رفتار سے فائدہ اُٹھایا" +

ایک ہندو ماہر اقتصادیات ہندوستانی گاؤں کا الفاظ ذیل میں خاکہ کھینچتا ہے۔ "آجکل نئے نئے اصولِ اقتصاد دریافت کئے جا رہے ہیں اور اُن کا اثر لوگوں پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض مزارعین تو اپنے آبائی پیشے کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور بعض برغبت دوسرے کاموں میں لگ گئے ہیں۔ برہمن لوگ شہروں میں جا کر سرکاری ملازمت یا اعلےٰ پیشوں

میں لگ رہے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ حصولِ معاش کی خاطر سارے ملک کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ خود بعض زمیندار اپنی زمینوں کو کھو کر اب محض دوسروں کے نوکر رہ گئے ہیں۔ جب دیہات کی یہ قوی اور محنتی آبادی اس طرح پراگندہ ہو جاتی ہے۔ تو باقی ماندہ حصہ کا وجود نہایت ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ یہی حال شہروں کا ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے۔ کہ شہروں پر اس اقتصادی عدم استقلال کا اثر گاؤں سے کہیں زیادہ مُہلک ہوتا ہے۔ آج کل ہندوستان کے متوسط طبقے کا ذریعہ معاش محض نوکری رہ گیا ہے۔ زمیندار گروہ کی مرفع الحالی کا خاتمہ ہوا جا رہا ہے۔ پیداوار خوردنی خراب اور کم ہوتی چلی جا رہی ہیں جس کا خمیازہ نہ صرف ملک کی زراعت پیشہ لوگوں کو بلکہ ہر قسم کے دستکاروں کو بھگتنا پڑ گیا۔

خوش قسمتی سے یہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ کہ یہ زمانہ تغیر آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے اور حالات کی صورت میں ایک سکون پیدا ہو چلا ہے۔ ہندوستانیوں نے اور حکومت انگریزی نے مغربی آلات زراعت کی حتی المقدور ترویج کی ہے۔ جس سے زراعت کے ترقی ہونے کا یقین ہوتا ہے ان نئے ذرائع میں سے ایک قیام بنک ہائے زمیندارہ ہے۔ ان کی ابتدا ۱۹۰۴ء میں ہوئی اور ۱۹۱۵ء تک ان کی تعداد ۱۷۰۰۰ تک پہنچ چکی تھی۔ جن کے ۸۲۵۰۰۰ چندہ دہندگان تھے۔ اور ان کا سرمایہ ۱۰ اور پندرہ کروڑ سے اوپر تک جمع ہو چکا تھا۔ یہ بنک مزارعین کو آسان شرائط ادائیگی و سود پر خرید آلات زراعت و مویشی۔ چارہ۔ تخم۔ کھاد۔ اخراجات چاہ کنی اور بعض حالات میں عارضی اخراجات ذاتی کے لئے قرض دیتے ہیں۔ اب اُن کے ذریعے سے مزارعین بنیوں کے ۵۰ اور ۷۵ فیصدی شرح سود سے بچ کر ۱۰-۱۸ فیصدی پر آ رہے ہیں۔

گو یہ ترقیاں تو ہو رہی ہیں۔ مگر نہایت سست رفتار سے جس کی بڑی وجہ مشرقی بے چینی اور عدم امنیت ہے اور ہندوستانیوں کا یہ کہنا موجب حیرت نہیں کہ یہ حالات زیادہ تر مغربی تجارتی چالاکی اور باخبری کا نتیجہ ہیں اور اب کوشش یہ کی جا رہی ہے۔ کہ اس قسم کے اجنبی اختیار کا خاتمہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے جذبات حریت پر تنقید ہو چکی ہے۔ اس قسم کے ہندوستانی احساسات نے تحریک سودیشی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہندوستانیوں کا دعوے ہے کہ انگلستان اور دیگر مغربی ممالک ہندوستان کی ثروت کو سمیٹ کرتے جا رہے ہیں

اور اِن کا ارادہ یہ ہے۔ کہ مغربی سیاسی اقتدار کو کم کر کے وہ حفظ مصنوعات ملکی کے لئے قوانین تیار کریں اور اجنبی سرمایہ کے ہندوستانی استعمال کی حد بندی کریں۔ اور بڑے بڑے عہدوں پر اہل ملک کا تقرر کر کے خطیر رقوم زر کی برآمد کو روک لیں +

مگر اِن دعاوی کے غائر مطالعہ سے معلوم ہو گا۔ کہ فی الحقیقت زمانے کے عام اقتصادی حالات اِن حقائق کے ضامن ہیں۔ انگریزی حکومت اور انگریزی سرمایہ بغیر معاوضہ مل رہا ہے۔ اور یہ بات ملکی حکومت اور ملکی سرمائے کے ہوتے ہوئے ناپید ہو جائے گی۔ تھیوڈور ماریسن کہتا ہے۔ جو فوائد انگریزی بیڑے کی حفاظت اور انگریزی ساکھ سے ہندوستان کو حاصل ہیں۔ اِن کے بدلے چند کروڑ روپے غیر ملکی اہلکاروں کے مشاہروں اور پنشنوں کے لئے کچھ بہت زیادہ نہیں۔ اور یہ بھی ایک طرح کا مادی فائدہ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے۔ کہ ہندوستانی دولت کے صرف کے عوض ہندوستان کو کیا ملتا ہے۔ تو میرا جواب یہ ہو گا۔ ہندوستان کو صنعت جدید کا رخت اور وہ حالات حفظ امن ملتے ہیں جن کے بغیر ملکی صنعتی ترقی نہیں ہو سکتی اور جسے پیدا کرنے کے لئے ہندوستانیوں کو بغیر امداد انگلستان کہیں زیادہ دام صرف کرنے پڑیں۔ اِس دعوے کی دلیل جاپان کی مثال ہے۔ جس کے ملکی ٹیکس براہ حفاظت ملک کثیر شرح سود غیر ملکی اور ادنے ساکھ ہیں۔

ہندوستانی اقتصادی درماندگی کی اصلی وجہ خود کئی ایک ہندوستانیوں کے نزدیک محض غیر ملکی جلب منفعت ہی نہیں۔ بلکہ خود اہل ہندوستان کے بڑھتے ہوئے معیارات زندگی۔ جو کیا چین کیا جاپان سب جگہ یکساں ہیں۔ ریمزے مکڈانلڈ کہتا ہے۔ ایک بات تو قطعی یقینی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ قوانین حفظ مصنوعاتِ ملکی سے نہ تو ہندوستان کی قدیمی دستکاریوں اور نہ دیہاتی مصنوعات کا احیا ہو سکیگا۔ کارخانے اور مشینیں جو خود ہندوستان میں بسرعت قائم ہو رہے ہیں۔ متذکرہ بالا امور کے منافی ہیں۔ اور خود انگلستان کی دستکاریوں کی تباہی برمنگھم اور لنکا شائر کے کارخانوں نے کر دی ہے +

ایک صاحب پرا متھا ناتھ بوس فرماتے ہیں۔ غیر ملکی لوٹ سے ہندوستان تباہ ہو رہا ہے۔ بہت خوب۔ تو کیا حامیانِ سودیشی کا پروگرام ہوم رول اس لوٹ کی تلافی کر سکیگا

ہوم رول کا پروگرام کیا ہے۔ (۱) انتظامی آسامیوں پر بجائے انگریزوں کے ہندوستانیوں کا تقرر۔ (۲) حفظ مصنوعات ملکی کے لئے ایزادیٔ محصول درآمد۔ (۳) ہندوستانی مصنوعات کی مدکاری اعانت۔ (۴) ترویج تعلیم صنعتی۔ اِن کے متعلق میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ اول تو ہندوستانیوں کا تقرر اِس لوٹ کو کسی طرح سے کم نہیں کریگا۔ کیونکہ کثیر مشاہرے پانے والے ہندوستانیوں کا خرچ اِن کے یورپی اصحاب منصب سے کسی طرح کم نہیں۔ اِن ہندوستانی حکام کا اثر بلکہ عام ہندوستانی جماعت پر جنبی حکام کی نسبت کہیں زیادہ برا پڑیگا۔ اور مغربی ساخت کی اشیا کی مانگ قائم رہیگی۔ ایزادی محصولِ درآمد سے کثیر مقدار میں اجنبی سرمایہ ملک میں لگ جائیگا۔ جس کا فائدہ زیادہ تر غیر ملکوں میں جائے گا۔ اور ہندوستانی محض نوکری پیشہ ہوں گے۔ اور یہ امکان اِس لئے زیادہ تر قوی ہے۔ کہ ہندوستانیوں نے اب تک بڑے پیمانے پر کامیاب صنعتی جد وجہد کا ثبوت نہیں دیا۔ مگر یہ یاد رہے۔ ملک میں صنعتی آبادی کے نئے عنصر کا قیام نہایت ہی مکروہ معاشرتی بدیوں کا موجب ہوگا۔ نیز اگر مصنوعات کی سرکاری اعانت کی گئی۔ تو پھر بیرونی سرمائے دار اِس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے نہ کہ ملکی لوگ۔ ترویج تعلیم صنعتی کے متعلق یہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اب آب از سر گذشت والا معاملہ ہو چکا ہے۔ جاپانی اور مغربی قومیں اِس دوڑ میں اِس قدر آگے نکل گئی ہیں۔ کہ ہندوستانیوں کے لئے کامیاب مقابلے کی کوئی صورت اب نظر نہیں آتی۔

مسٹر یوس آگے چل کر مغربی طریق تعلیم پر سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ اِس طرز تعلیم نے محض ایک ایسی اعلےٰ پیشہ ور جماعت پیدا کر دی ہے۔ جو ملک کی ثروت ہضم کرتی ہے۔ نہ کہ اسے بڑھاتی ہے۔ اور اِس سے جمہور کے حالات میں کسی قسم کی اصلاح نہیں ہوتی مثلاً اِن کے وجود سے اب اِس کھیت میں دو من غلہ پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں پہلے ایک من ہوتا تھا۔ اِن کے وجود نے بدقسمتی سے ملک میں ایک جھوٹا معیار معاشرت کا قائم کر دیا ہے۔ اور اسے قائم رکھنے کے لئے اِس طبقہ کی ثروت برباد ہوتی ہے۔ جو ملک کا دولت افزا طبقہ ہے میرا خیال ہے۔ ملکی مصنوعات کو اس قدر ضعف نہ پہنچتا۔ اگر مغربی تعلیم یافتہ اصحاب جھوٹے معاشرتی معیار کے بانی ہو کر غیر ملکی سازوسامانِ معاشرت کے خریدار نہ بنتے۔ اور لکھو کھا

عوام کے لئے یہ بُری نظیر پیدا نہ کرتے +

بقول مسٹر بوس اصلاحات بوم رول کسی طرح سے ترقی ملک کا موجب نہیں ہوسکتیں بلکہ اِن سے مغربی روایات اور مغربی جدتوں کو تقویت پہنچیگی - انجام کار مسٹر بوس اپنے ہموطنوں کو اپنے عہدِ قدیم کی زندگی کی طرف عود کرنے کی صلاح دیتے ہیں - وہ فرماتے ہیں - ہندوستان کی نجات اِس میں ہے - کہ وہ مغربی طریق زندگی سے مُنہ موڑ لے - مغربی سیاسیات کو ترک کردے اور مغربی تمدن کو رد کردے - اور مغربی دام معیشت کی ریشمی اور نظر فریب کڑیوں میں اپنے آپ کو نہ جکڑے - بلکہ حتی الامکان دنیا سے الگ اپنی سادگی میں اپنی عظمت جانے

اِس میں شبہ نہیں - کہ انتہائی تمنائیں - ربندرناتھ ٹیگور کی بھی یہی ہیں - مگر زمانۂ حال میں اِن کی حقیقت خوابہائے بے تعبیر سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی - فرد واحد کی تلقین سے ساری کی ساری قوم سادھو اور تارکِ دنیا نہیں بن سکتی - "ملتِ راہبہ" کا زمانہ گیا - اور اب تو ہندوستان خود مغربی تاثرات سے اثر پذیر ہوکر اپنے عہدِ قدیم کو پیچھے چھوڑ کئی منزلیں آگے بڑھ چکا ہے +

مگر ہندوستانی عارفانہ طرز تخیل کے لئے اِس قسم کے خیالات بالکل بے اثر نہیں - اور کئی ایک ہندوستانیوں نے ایک "اعتدال پالیسی" کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے - جس میں ہندو اصولِ تصوف کے تانے پر مغربی صنعتی اور جماعتی نظام کا بانا گوندھا جا سکے +

یہ طریق استدلال عقلمندانہ کیوں نہ ہو - موثر نہیں - ایک مثل ہے - چپڑی اور دو دو - یہ نہ مغرب میں ہوا - اور نہ مشرق میں ہوسکیگا - بالکل اِس قسم کی کوشش کے یہ معنی ہوں گے - کہ مثلث کو دائرہ بنایا جائے - ایک انگریز کہتا ہے - مغربی تمدن ایک غیر منقسم جسد کامل ہے - اس کے فنون - اِس کا مذہب - اِس کا طرز معاشرت نظام صنعت تمام مل ملاکر یکجان ہوچکے ہیں - اب یہ ممکن نہیں - کہ اِس پر خوشہ چینی کا عمل ہوسکے - اہل مشرق یہ کہنے کی مجاز نہیں - کہ ہم اہل مغرب سے اِن کے جنگی جہاز - کارخانے اور فن طبابت تو قبول کریں گے - مگر اِن کی معاشرتی افراط تفریط اِن کی بھاگڑ - کاروبار مارا ماری - اور عام زندگی

کا بھونڈا پن رد کر دیں گے۔ میرا یقین ہے۔ اہل مشرق ہمارے تمدن کی ان تمام شاہراہوں پر گامزن ہونے پر مجبور ہوں گے۔ اور انہیں راستے کے عین بیچ میں سے نہ کہ راستہ کاٹ کر چلنا ہوگا۔ اور پھر وہ کہیں جا کر مغربی معنی میں "متمدن" قرار دئے جا سکیں گے +

میری بھی یہی رائے ہے۔ اہل مشرق ہمارے بعض نہایت بیّن نقائص سے احتراز کریں مگر پھر بھی انہیں مغربی تمدن کے تمام مدارج میں سے ہو کر اوپر اٹھنا ہوگا۔ اور یہ محض خیال ہی نہیں۔ مشرق جدید کے کئی معاشرتی صنعتی اور سیاسی پہلوؤں سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اب ہم خاص طور پر اس کے معاشرتی پہلو پر بحث کریں گے +

باب ہشتم

معاشرتی تغیرات

تغیراتِ عائلہ کی بہترین مثال طرزِ معاشرت کی جدتوں سے ہویدا ہے۔ مغربی اقتصادی سیاسی اور حکومتی نصب العین دائرہ معشیت پر بھی سایہ فگن ہو رہا ہے۔ بابِ سوم میں عام مغربی تاثرات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اور اس باب میں ان کے معاشرتی پہلوؤں پر بحث ہوگی +

یہ معاشرتی تغیرات بہت گہرے ہیں۔ مگر بعض حالات میں اِن کا اثر نظروں سے پوشیدہ ہے۔ مشرقِ قدیم کی روایات خانگی و رسوماتِ زندگی کے مطالعہ سے متاثر ہو کر بعض انگریز مبصرین مشرقی خانگی زندگی کے انقلاب سے بے خبر ہیں۔ مگر غائر بین اجنبی اور خود ہندوستانی بےخبر نہیں۔ اور انہیں کی رائے قابلِ وقعت بھی ہے۔ کیونکہ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی قوم مادیات میں تو ترقی کرتی جائے۔ اور معاشرت میں بحالت جمود رہے۔ اور اور ریل۔ تار برقی۔ اور صیغہ ہائے پیغام رسانی سے تو لوگ فائدہ اٹھائیں۔ اور اپنے خانگی معاملات میں ٹس سے مس نہ ہوں۔ کیا اِس بات کے کچھ معنی نہیں۔ کہ رسول اکرم کے روضہ اطہر کا سامانِ روشنی اب فانوسہائے برقی ہوں۔ اور حرم کعبہ کے باہر اِس کے عکسی پوسٹکارڈ بک رہے ہوں۔ یہ تو مان لیا جائے۔ کہ ایک مسلمان سوداگر اپنے حرم سے نکل کر جائے نماز بغل میں دبائے۔ موٹر کار میں بیٹھ کر اپنے دفتر میں آئے۔ اور دن گذرے نماز سے فارغ ہو کر ٹائیپ شدہ خط و کتابت پر دستخط کرے۔ اور اِن تمام باتوں کا اس کی خانگی زندگی پر کچھ اثر نہ ہو۔ جب اِن پر سائنٹفک تعلیم مغربی سامانِ تفریح اور آزادی نسوان کی ایزادی ہو۔ تو

مغربی تاثرات کی حقیقت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا۔

مغرب سے قریب ترین مشرقی ممالک میں ان تاثرات کے نتائج زیادہ بیّن طور پر نظر آرہے ہیں۔ جب ومبیری ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ میں واپس آیا۔ تو استبدادِ عہد حمیدی کے باوجود اسے ترکی ۱۸۵۶ء اور ترکی حال میں ایک نمایاں تفاوت نظر آیا۔ اب تو بلدہ کی ظاہری حالت بھی دگرگوں ہورہی تھی۔ تعمیرات چوبی کی جگہ مکانات سنگ وخشت نے لے لی تھی۔ جہاں باربرداری کے ٹٹو چلتے تھے۔ اب لوگ ٹراموں میں بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ اور صدائے موزن کے ساتھ انجن کی سیٹی سنائی دیتی تھی۔ اور جب میں لوگوں کے گھروں میں داخل ہوا۔ تو وہاں کی تو کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ اب ترک متوسط طبقہ اجنبیوں اور مغربیوں کے متعلق اور ہی نقطہ نظر رکھتے تھے۔

اور بقولِ ومبیری ترکوں کی مغربیت محض ظاہری ٹیپ ٹاپ تک محدود نہیں۔ بلکہ ترکی طبائع پر اس کا اثر پڑا ہے۔ اب ترکوں کا سامان آرائشی طریق خورد ونوش حتیٰ کہ تعلقات مرد وزن بدل چکے ہیں۔ اور یہ ایک معنی خیز حقیقت ہے۔ ترک مغربی تعلیم حاصل کرکے اس کے مادی فوائد سے متمتع ہوئے۔ مگر معاشرتی تغیرات ان کے حبِ حد ایثار کا نتیجہ ہیں۔ میں نے کئی ایک مذہبی پیشواؤں کو اتحاد مشرق ومغرب کا حامی پایا۔ ہاں اختیار کرنے کے طریق گو کسی قدر مختلف ہے مگر نتیجہ ان سب عملوں کا ایک ہی ہے۔

ومبیری نے ترکی خواتین کے حالات کو بالکل متغیر پایا۔ اور یہ ان کے ذاتی تخیل اور بیرونی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ اب ترکی خواتین جو بکثرت مدارس میں داخل ہورہی ہیں۔ ترکی قوم کی آیندہ ماؤں کے دل ودماغ کا پتہ دیتی ہیں۔

ہندوستانی خانگی روایات کی بابتی ہوئی صورت پر مسٹر صلاح الدین خدابخش صاحب رقمطراز ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ زمانہ انقلاب ہر حالت میں ایک ناخوش آیند عرصہ وقت ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اٹل بھی ہے۔ اس زمانے میں اخلاقی مرست۔ مذہبی لاپرواہی۔ اور سطحی تہذیب کے مظاہرات ہوتے رہیں گے۔ مگر ان کا علاج وقت خود ہی کردیگا۔ گو اس پر یہ امید رکھنی۔ کہ اس انقلاب کے باوجود بعض بہترین معاشرتی رسومات قائم رہیں گی۔ خام خیالی ہوگی۔ آج بدقسمتی سے قدیم مذہبی رواداری کی بجائے لامذہبی بزرگوں کا عدم احترام اور

رعونتانہ خیالات کو بڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں باپ کی حیثیت گھر میں نہایت ممتاز ہوتی تھی۔ آج اِس کی کم عمر اور ناتجربہ کار اولاد ہمسری کا دعوے کرتی ہے۔

خدابخش صاحب مغربی طرزِ زندگی سے اسراف جیسی لعنت کو بڑھتا ہوا پاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ اہل ہندوستان نے یورپی لباس یورپی طریق خورد و نوش حتیٰ کہ شراب خواری اور جوا بازی کی قبیح عادات کو تو اختیار کر لیا ہے۔ مگر یورپی خوبیوں کی اِن میں بو تک پیدا نہیں ہوئی۔ ہمیں یورپی ذرائعہ ترقی تو اختیار کرنے چاہئیں۔ مگر مشرقی خصائص کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ اور یہی بات ملک سے مفقود ہے۔ ہم مغربی تاریخ اور ادب سے شناسائی حاصل کر کے اپنی مذہبی روایات اور اپنے قومی کارناموں کو بھول چکے ہیں۔ ہم نے قومی تمدنی بنیادیں تو معدوم کر دی ہیں۔ مگر ان کی جگہ کوئی نئی عمارت قائم نہیں کی۔

عورتوں کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ اِن میں تعلیم روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور وہ اپنے حقوق کی مدعی ہیں۔ پردہ اب وہ پہلا سا نہیں گو کسی حد تک اب تک قائم ہے۔ آئے دن کی بدعتوں سے مسئلہ آزادی کا پیش خیمہ ہیں۔ چالیس سال ہوئے عورتیں سختی اور عسرت کو خاموشی سے برداشت کرتی تھیں مگر اب وہ حالت نہیں۔

یہ یاد رہے۔ کہ ہمیری اور خدابخش صاحب محض طبقہ بالا کے حالات پر رائے زنی کر رہے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ نمبر طبقہ ادنےٰ کے جذبات کو ابھار رہا ہے۔ اور دن بدن نئے نئے مظاہرات رونما ہو رہے ہیں۔

مغربی تاثرات کے یہ نتائج جہاں ایک گونہ تحیر خیز ہیں۔ وہاں یہ مشرقی طرزِ تعلیم کے برخلاف ایک قسم کی احتجاج بھی ہیں۔ مشرقِ قدیم میں کیا چین اور کیا ایشیا کوچک سب جگہ ایک ہی وضع کا طریق تعلیم رائج تھا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ طالب علم ادب کی بڑی بڑی کتابوں اور کتبِ مقدسہ کی طویل تفاسیر کو بغیر حجت و استدلال منہ زبانی طوطے کی طرح رٹ لیتے تھے۔ اِن کتابوں کی زبانیں یا تو عربی یا سنسکرت ہوتی تھیں۔ جنہیں سمجھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اِس طریق تدریس کے ہوتے ہوئے بھلا ذہنی فلاح کیا قائم رہتی مجھے تو یہی تعجب ہے۔ کہ اہل مشرق کی صلاحیت استدلال وجدت تخیل جس کا وہ آئے دن آج کل ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ اِن ضرر رساں درسی روایات

کے باوجود کیسے قائم رہ سکا۔ اور بدقسمتی سے یہ حالات اب تک موجود ہیں۔ صدہا ایسے مدارس ہیں۔ جہاں طلبا اسی دقیانوسی طریق پر اپنی زندگی کے بہترین سال برباد کرتے رہتے ہیں۔ ہاں جدید تحریکات کا ایک خوش نما وہ پہلو بھی ہے۔ جس کے ماتحت جابجا مغربی وضع کے مدارس اور یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں۔ اِن یونیورسٹیوں میں معمولی ادبی تعلیم کے علاوہ اعلےٰ درجے کی سائنٹفک تعلیم مثلاً انجینئری زراعت۔ طبابت وغیرہ کا انتظام بھی ہے۔ جن کی سرکاری اور غیر سرکاری طریق سے اعانت ہوتی رہتی ہے۔ مشرقی ممالک کی مغربی حکومتوں نے مصر اور ہندوستان جیسے ممالک میں خاص طور پر مغربی تعلیم کی ترویج کی ہے۔ اور دولت عثمانیہ اور کئی ایک ہندوستانی ریاستوں نے بھی اِس حکمت عملی کی شد و مد سے عملی تائید کی ہے +

یہ صحیح ہے۔ کہ عہد گذشتہ کی بدعادات ایک ہی دِن میں دور نہیں کی جاسکتی۔ بنا بریں اب بھی ہزارہا طلبا ایسے ملیں گے۔ جنہوں نے کتابوں کے رٹنے اور اعداد کو حفظ کرنے کا نام تحصیل علوم و فنون سمجھ رکھا ہے۔ اِس سے اِن کا مُدعا امتحانوں کو پاس کر کے سرکاری ملازمتوں کی خواہش ہے۔ نہ کہ ترقی دِماغ۔ اور چونکہ ہر ایک نوجوان کو یہ ملازمت نہیں مل سکتی۔ وہ اپنی ناکامی کو حکومت کی بدذاتی پر محمول کرتے ہیں۔ مغربی تعلیم کے تاریک پہلو کے متعلق ایک انگریز الفرڈ لائل کہتا ہے اِس میں کلام نہیں کہ جہالت ایک قومی لعنت ہے۔ اور اسی لئے گذشتہ صدی کے فلاسفروں اور اہل الرائوں نے تعلیم کو دنیا کی ہر ایک قسم کی پسماندگی کا علاج قرار دیا۔ اور مکالے جیسے مدبر نے اس کی ضرورت پر نہایت شد و مد سے زور دیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ دراں حالات ترویج تعلیم حکومت انگریزی کی باعث قیام تھی اور ہے۔ مگر اب ہمیں تجربے سے معلوم ہوا ہے۔ کہ جہاں تعلیم ایک حد تک نہایت ہی مفید اور موثر ذریعہ ترقی ہے۔ اِس کی بے جا با اور اناپ شناپ اشاعت کئی ایک اور مصیبتوں کا موجب ہوسکتی ہے۔ قدیمی روایات سے متاثر جماعت انسانی کے لئے اِس کا عمل کمزور دماغوں کو پگھلا دیتا ہے۔ ضعیف مبائع کو تحلیل کر کے لوگوں کے دلوں میں ناقابل عمل منتہائے خیالات و غیر ممکن الحصول تمناؤں کو پیدا کر دیتا ہے۔ اور اِن امیدوں کی ناکامی شدید غصے اور مایوسی کا باعث ہوتی ہے +

بعض ایسے مغربی اہلکار بھی ہیں۔ جو ناکام نیم تعلیم یافتہ گروہ کو تعلیم مغربی کی بجائے برکت

لعنت ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ کرومر مغربی تعلیم یافتہ مصریوں کے وجود کو ہرگز پسند نہیں کرتا کرتا تھا۔ اور ایک اینگلو انڈین اہلکار تو ان لوگوں کے فعل کو مہتم بالشان قرار دیتا ہے۔ جنہوں نے نہایت ناعاقبت اندیشی سے ہندوستان میں مغربی تعلیم کا دروازہ کھولا +

مگر یہ بہیں لوگ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ دورِ انقلاب میں اس قسم کے مظاہرات ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کئی ایک اور مغربی مبصروں نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے۔ ڈبیری کہتا ہے۔ کہ الجزائر اور ہندوستان میں صد ہا دیانت دار اور فرض شناس عرب اور ہندوستانی اہلکار ملیں گے جو اسی مغربی تعلیم کا ثمر شیریں ہیں۔ بعض رجعت پسند مشرقی اور متعصب مغربی یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ مغربی تعلیم ایشیائیوں کے جبلی خصائص اور محاسن کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اور یہ کہ جاہل مشرقی مغربی تعلیم یافتہ مشرقیوں کی نسبت زیادہ دیانتدار محنتی اور قابل اعتماد ہوتے ہیں یہ خیال صریحی طور پر غلط ہے۔ شاید نیم تعلیم یافتہ گروہ کے متعلق یہ خیال پیدا ہو سکے۔ مگر ایسے لوگوں پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا جنہوں نے باضابطہ سلسلہ دار مغربی تعلیم پائی ہے +

علاوہ بریں اگر ایسا ہو بھی تو پھر بھی کیا تحریک تعلیم اب اس وقت رک سکتی ہے۔ ہر قسم کے مغربی تاثرات سے متاثر ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا اثر دائرہ تعلیم پر نہ پڑتا۔ اور بالفرض مغربی حکومتیں ترویج تعلیم نہ کرتیں تو اہل مشرق خود بخود مغربی علوم و فنون کی طرف رجوع کرتے۔ اور ان کا باضابطہ ذرائع تعلیم کے زیر اثر رہنا اس سے کہیں اچھا ہے۔ کہ وہ اپنی تعلیم کا انتظام اپنے طریق پر کرتے۔ مغربی تعلیم کا نہایت فائز اثر عالم نسوان پر پڑ رہا ہے۔ اسلامی ممالک میں عورتوں کی حالت تو خیر بری ہی ہے۔ مگر اہل ہنود میں تو ان کی حیثیت کچھ ہے ہی نہیں۔ ازدواج کمسنی۔ امتناع شادی بیوگان اور اسلامی حرم کے سے شدید پردے نے ان کو جسد بے روح کر رکھا ہے۔ ایک انگریز کہتا ہے۔ مغربیوں کا اصول ہے۔ "سب سے آگے عورتیں" اہل مشرق کا اصول ہے۔ "سب سے پیچھے عورتیں" اور یہ ہر دو تمدنوں کا لب لباب ہے +

ایسے حالات میں شاید یہ خیال ہو کہ مغربی اثر زنانے تک کیا پہنچتا۔ مگر واقعات اس کے خلاف ہیں۔ نہ صرف اعلے طبقہ کی عورتیں جو سر تعلیم سے آراستہ ہو کر آزاد ہو رہی ہیں۔ بلکہ ادنے درجے کی عورتیں بھی فضائے آزادی میں نکل آنے کی متمنی ہیں۔ قسطنطنیہ۔ قاہرے اور بمبئی

بڑے ہندوستانی شہروں میں نسوانِ عصرِ جدید پیدا ہو چلی ہیں۔ جو اپنے حقوق کی محافظ ہیں۔ اور جن کی لوگ عزت کرتے ہیں۔ اس طبقے کی بہترین مثال استانیاں ہیں +

ترقی نسواں کیا عورتوں اور کیا مردوں ہر ایک گروہ کے لئے مفید ہے۔ مشرق میں حرم رجعت پسندی کا قلعہ ہے۔ اور جاہل اور خانہ بند عورتیں اپنی اولاد کو بھی رجعت پسند اور متعصب رکھتی ہیں۔ اس لئے کئی ایک روشن خیال والدین اپنی اولاد کو اوائل عمر میں ہی بورڈنگ سکولوں میں بھیج دیتے ہیں۔ مگر یہ حکمت عملی بھی موثر نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ جماعت کا طبقہ نسوان بھی روشن خیال نہ بن جائے اور ایک سال کی تعلیم کا اثر ماں کے پاس چھٹیاں گذارنے سے مفقود ہو جانے کا احتمال دور نہ ہو جائے +

روشن خیال مشرقی ماؤں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس نقص کو دور کر رہی ہے۔ ایک مغربی کہتا ہے۔ جب مشرقی مائیں تعلیم یافتہ ہو جائینگی۔ تو خود بخود طرز زندگی بدلتا جائیگا۔ پھر وہ قرآن شریف کے عربی جملات کے ساتھ ساتھ پہلی کتابوں سے سینے پرونے اور خانہ داری کے اصولوں کا رواج ہو گا۔ عورتیں جدید وضع کے کھانے پکانے کے اصول۔ قواعد حفظ صحت اور خانگی انتظام کے اصولوں سے آگاہ ہوں گی۔ تو خود بخود گھر کی حالت بہتر ہونی شروع ہو جائے گی۔ اور گھر کی جاہل مالکہ اپنا وقت بیکاری اور نوکروں سے گفتگو کرنے میں نہیں گذارے گی۔ تعلیم یافتہ بیوی اپنے خاوند کی رفیق ہو گی نہ کہ کھلونہ۔ اور شادی محض انسانوں کی خرید و فروخت کا ذریعہ نہ ہو گی۔ بلکہ عورت مرد کا آپس ہی کا حقیقی تعلق جس میں اولاد اور باپ ماں کو ماں سمجھیں گے نہ کہ محض عورت +

آج مشرقِ جدید کی بیبیاں نہ صرف خیالات میں بلکہ لباس میں بھی جدت کا اظہار کر رہی ہیں۔ امیر و غریب شہری اور دیہاتی سب طبقات کی عورتوں کے طریق زندگی میں ایک نیا اثر رونما ہے۔ اور اس کا اثر نہایت ہی گہرا ہے۔ کیونکہ مغربی اور مشرقی زندگی کا شاید ہی کوئی اور پہلو ہو جس میں ان دونوں کے اختلافات اس قدر نمایاں ہوں۔ جتنے کہ معاشرتی معاملات میں۔ اور اس اختلاف کی بنیاد ثروت نہیں کیونکہ یورپ و ایشیا دونو جگہ کثیر دولت اور حاد درجہ کا افلاس موجود ہے۔ بلکہ معیار آسائش پرانی وضع کے اہل ثروت ایشیائی اپنی دولت گھوڑوں۔ سامان زرق برق۔ عالیشان محلوں اور ملازمین کی تعداد پر صرف کریں گے۔ مگر ان کے معنی آسائش نہیں۔ بلکہ بعض حالات میں ان کا خانگی انتظام

ایسا ہوتا ہے۔ کہ ایک مغربی دستکار بھی اِس طرح نہ رہنا چاہیئے +

مگر آج "آسائش" کا اصلی راز کھُل رہا ہے۔ تمام ایسی چیزیں۔ مثلاً جیبی گھڑیاں۔ بجلی کے فانوس۔ برقی پنکھے۔ مشرابیں۔ چھاتے۔ کپڑا سینے کی مشینیں اہل ایشیا کے لئے نہایت دلکش جدید چیزیں ہیں۔ اور وہ اِن کو شوق سے خریدتے ہیں۔ مگر اس سے کئی ایک بُرے نتیجے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اِس کی آمدنی وخرچ کا توازن قائم نہیں رہتا۔ اِن تمام چیزوں کی دریافت اِن کے معیار بود و ماند کو ارفع کر دیتی ہے۔ اور اگر وہ غریب ہے۔ تو پھر روپیہ کہاں سے آئے۔ بنابریں وہ محض ضروری چیزیں کو خریدتے ہیں۔ اور اگر امیر ہیں تو وہ اسراف پر اُتر آتے ہیں۔ اور میں تو یہ کہونگا۔ کہ من حیث المجموع مشرق قریب۔ و وسطے کے لوگ کبھی بھی صحیح معنوں میں کفایت شعار نہیں ہوئے۔ بحالت افلاس تو خیر جیسے گذر سکتی ہے۔ گذر کرتے ہیں۔ مگر جہاں روپیہ ملا۔ اُن کے اسراف کی حد نہیں۔ ترک زمیندار اور ہندو بنیے کی شادی بیاہ کی رسومات پر بے دریغ روپیہ صرف ہوتے ہوئے دیکھکر کئی ایک یورپی انگشت بدنداں ہوتے ہیں۔ اور اِس پر جب عام ایشیائے خوردنی و پوشیدنی کی قیمت حد درجہ بڑھ گئی ہو۔ جیسا کہ اب ہے۔ تو اہل مشرق کی معاشرتی تہ و بالگی کی حالت کا اندازہ نہایت آسان ہے +

بنابریں آج جہد زیست شدید طور پر بڑھ گئی ہے۔ اور افلاس کلااثر نہایت ہی بُرا ہو رہا ہے۔ عام خانگی ضروریات کی گرانی اور سالہائے گذشتہ کی اشیائے زیبائش کا آج کل کا ضروری سامان ہوجانے نے غریب اور متوسط حیثیت کے افراد کی "چادر" کو نہایت تنگ کر دیا ہے۔ ایک مصر کی رائے ہے۔ کہ آج کل اخراجات تو بڑھ رہے ہیں۔ مگر آمدنی وہی کی وہی ہے +

اِس کے علاوہ ایک اور حقیقت یہ بھی ہے۔ کہ اہل مشرق کی آبادی دِن بدن بڑھ رہی ہے۔ مشرقی لوگ تو یوں بھی کثیر العیال مشہور ہیں اور اس کی وجہ صرف اِن کی شہوت رانی ہی نہیں۔ بلکہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک اور وہ رسومات ہیں۔ جو کمسنی کی شادی کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عہد سابق میں آبادی کا کثیر حصہ ہر سال قحطوں۔ وباؤں اور آئے دِن خانہ جنگیوں کے نذر ہوتا رہتا تھا۔ جس سے آبادی کے عام اعداد تقریباً یکساں حالت میں رہتے تھے۔ مشرقی ممالک پر مغربی طرز حکومت کا ایک اثر یہ ہے۔ کہ آئے دِن کے فسادوں اور وباؤں کا

قلع قمع ہو۔ لوگ اب امن و سکون سے رہنے لگے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ ایک طرف تو قدرتی اسبابِ موت میں تخفیف ہو گئی ہے۔ اور دوسری طرف حفظانِ صحت کے نئے قاعدوں کے ماتحت اعدادِ موت مغربی ممالک کے حالات کے مطابق ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ایسے مشرقی ممالک ہیں جن کی آزادی اب تک قائم ہے۔ پیدائش کو گھٹانے کے وسائل کام میں لائے جا رہے ہیں۔

کثیر پیدائش کی حقیقت ہندوستان میں نہایت ہی نمایاں ہے۔ ایک صدی ہوئی ہندوستان کی آبادی خاصی تھی۔ مگر اب تو انگریزی حکومت کے ماتحت اس کی مقدار میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اور یہ اہلِ ملک کی خوش قسمتی ہے۔ کہ ریل۔ کارخانجات مصنوعات اور توسیع زراعت ہو رہی ہے۔ کہ اتنے نفوس زندہ رہ سکتے ہیں۔ ڈیوک آف ارگل کہتا ہے۔ "چالیس سال ہوئے۔ جب لوگوں کے ذرائع آمدنی نہایت محدود تھی۔ اور لوگ محض قوت لایموت حاصل کرتے تھے۔ تو ان کی زندگی پُر آسائش تو کیا محض جہدِ زیست کہی جا سکتی تھی۔ سر ولیم ہنٹر کہتا ہے۔ کہ فی زمانہ آبادی ہند ایک اہم مسئلہ ہو چلا ہے۔ اور اس سے ملک کی غذا پیدا کرنے کے ذرائع پر سخت بوجھ پڑا ہے۔ ہندوستانی اعدادِ مردم شماری سے ایک نہایت معنی خیز خیال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اِس ملک پر سے قدرتی ذرائع ہلاکتِ جان کا ہٹا لینا کچھ بہت سعید ثابت نہیں ہوا۔ پُرامن حکومت کی برکت نہیں رہی۔ بلکہ مصیبت ہو گئی ہے۔ اکبر اور شاہجہاں کے زمانے میں لکھو کھہا نفوس ہیضے اور جنگوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ اور جو نہایت ہی قوی ہوتے تھے۔ جی سکتے تھے۔ اور اب اندرونی فساد تو مفقود ہے۔ اور سائنس کے ہر ممکن ذرائع سے حفظِ حیات و صحت کی کوشش کی جاتی ہے۔ بنا بریں کروڑہا جانیں آجکل محض فاقہ کشی کی حالت میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان پر ایک متمدن حکومت کی مشکلات کس قدر اہم ہیں۔

ولیم آرچیسر کہتا ہے۔ متمدن حکومت کی خوبیاں اس وقت خوبیاں نہیں رہتیں۔ جس وقت رعایا سیاسی امنیت سے اپنی حالت سنوارنے کا فائدہ نہ اُٹھائے۔ بلکہ اسے اپنی تعداد بڑھانے کا ذریعہ بنائے۔ ہنری جارج کہا کرتا تھا۔ کہ ہر ایک انسانی جسم میں مُنہ تو ایک ہے۔ مگر ہاتھ دو ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے۔ کہ جب تک ان دو ہاتھوں کو ہلایا نہ جائیگا۔ مُنہ خالی رہیگا

اور اگر تعداد وہاں کے ساتھ پیداوار اشیا غذا میں ترقی نہ ہوگی۔ تو شدید افلاس کے سوا اور کچھ نظر نہ آسکیگا +

اہل مشرق اس امر کا لحاظ نہیں کرتے۔ کہ گنجان آبادی بھی ملکی افلاس کی ایک بڑی وجہ ہے اور وہ آجکل کی مصیبتوں کو مغربی اقتدار کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ ایک کتاب موسومہ "مسئلہ آبادی ہند" مصنفہ مسٹر پی۔ کے۔ واتل اہلکار محکمہ مال حکومت ہند میں اس مسئلہ پر ایسی عالمانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ کہ میں اس کے بیانات کو اہل مشرق کی سوز افزوں روشن خیالی اور معاملہ فہمی کی دلیل سمجھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قابل مصنف نے اس کتاب میں اہل ہند کے سامنے عاقلانہ طرز استدلال کے لئے اپیل کی ہے۔ اس کتاب کے بیانات سے مشرق کے روحانی تمدن پر مغرب کی مادی معاشرت کو ترجیح دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ میری اصلی غرض ان معاملات کی تحقیق ہے۔ جن کی بنا پر ہم پُر آسائش زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس میں شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ اور کیا یہ ایک امر واقعہ نہیں کہ کئی ایک ہونہار ہندوستانی نوجوانوں کے حوصلے اور اولوالعزم مقاصد محض عمر کے ابتدائی سالوں کی شادی اور کثیر العیالی سے جس کی کافی گذران پیدا کرنے کی ان میں طاقت نہ تھی۔ برباد ہوگئے۔ یہ حقیقت ایک مادی مسئلہ ہے۔ اور اسے روحانیات سے الگ رکھنا چاہیئے۔ اور اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تو کیا یہ ہمارا فرض نہیں۔ کہ اس کی اصلاح کے وسائل پر غور کریں۔ میری رائے میں دنیاوی افلاس سے بڑھ کر اور کوئی نحوست نہیں۔ اور میں شوق ازدواج کو قابو میں رکھنے سے شادی جیسے فرض روحانی کی تخریب نہیں چاہتا۔ مجھے ان تمام مصیبتوں اور دنیا کی کشاکشیوں کا علم ہے۔ جو محدود وسعت کے متاہل کو پیش آتی رہتی ہیں۔ اور جن کی طرف کسی نے لوگوں کو اس طریق پر متوجہ نہیں کیا۔ جس سے اس مصیبت کا ازالہ ہو سکے +

ان ابتدائی بیانات کے بعد مسٹر واتل فرماتے ہیں۔ ہندوستان میں کثیر آبادی کی ابتدائی وجہ ازدواج کمسنی ہے۔ مغربی ممالک کے انسداد کثیر العیالی کے برخلاف اہل ہند تو شادی کو حکم آسمانی سمجھ کر کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ فریقین اس کی ذمہ داریوں کے متحمل بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔ ہر ایک ہندو فرض ازدواج اس لئے ادا کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ اس کی اولاد نرینہ پیدا

ہو۔ جس کی دعائیں چین انتقال میں اسے جنت الفردوس تک پہنچا دیں۔ ہندوستان میں اولادِ نرینہ کا نام "پُتر" یعنی پُت۔ دوزخ سے نجات دلانے والا۔ ایک ہندو لڑکی جو بالغ ہو کر بے بیاہی ہے اپنے آباؤ اجداد کے لئے موجب لعنت ہے۔ مسلمان بھی جن پر اس قسم کے مذہبی تشددات وارد نہیں ویسی قسم کی شادیاں کرنے کے عادی ہیں۔ جس کا سبب ہندوؤں کی صحبت اور حیثیت نسواں کا ادنٰے ہونا ہے۔ زیادہ بدقسمتی یہ ہے۔ مصلحین معاشرت کی سعی کے باوجود ازدواج کمسنی ترقی پر ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے اعداد ذیل میں دکھاتے ہیں:- پانچ سال کی عمر میں شادی کے اعداد جہاں پہلے ایک ہزار میں ۱۳ تھے۔ اب ۱۲ ہو گئے۔ ۱۰ سال کی عمر کے اعداد ۱۰۲ سے ۱۰۵ ہو گئے۔ ۱۵ سال کے اعداد ۴۲۴ سے ۴۳۰ ہو گئے۔ بیس سال کے ۷۰۰ سے ۸۰۰ ہو گئے جس کے معنے یہ نکلتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں دس فیصدی شادیاں دس سال کی عمر کے قبل ہو جاتی ہیں اور پچاس فیصدی ۱۵ سال کی عمر کے قبل اور ۸۰ بیس سال کی عمر کے قبل۔

ان حالات کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ رفتار پیدائش نہایت سُرعت سے بڑھ رہی ہے۔ اور یہ کوئی دلخوش کن بات نہیں۔ اب واقعہ یہ ہے۔ کہ شرح پیدائش تو اس درجہ ترقی کر رہی ہے۔ مگر اس کے برخلاف شرح اموات انگلستان اور سکاٹلینڈ ہو رہی ہے۔ کیا ہم ہر سال ۲ فیصدی ترقی آبادی کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پس ضروری ہے۔ کہ ہم اپنی شرح پیدائش کو بھی متمدن ملکوں کی شرح پیدائش تک گھٹائیں۔ ہندوستان کے لئے کثرت اموات خطرہ نہیں بلکہ کثرت پیدائش۔

مسٹر واتل اس کے بعد شرح اموات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ہماری شرح اموات جس میں ۵۰ فیصدی اموات اطفال بوجہ ازدواج کمسنی شامل ہے۔ ہماری کثیر شرح پیدائش کا ابدی نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں ہر ایک آدمی خواہ اسے قدرت نے شادی کا اہل کیا ہو یا نہ شادی کرتا ہے۔ اس سے عام آبادی کی قوت زیست اور عام جسمانی تنومندی گھٹتی جا رہی ہے۔ کثرت پیدائش زیادہ تر ملک کی ادنٰے اقوام قدیم مثلاً بھیلوں اور گونڈوں میں ہے۔ اور اس کثرت سے ملک کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ آج کل زیادہ عمر کے لوگ ہندوستان میں کم ہو رہے ہیں۔ اور قومی اور ملکی خدمت کرنے کی صلاحیت اور قابلیت جو طویل تجربے اور کارگذاری سے پیدا ہو سکتی

ہیں عمر کی اوسط کم ہو جانے سے پیدا نہ ہو سکیگی۔ اور ملکی رہبری کا بار نوعمر اور ناتجربہ کار اشخاص کے کندھوں پر آرہیگا +

وسعت زراعت۔ تجارت و ہجرت قابل مصنف کی نظر میں اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے اور وہ لوگ اب شرح پیدائش کی فکر میں لگ چلے ہیں۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے اعداد کا حوالہ سے بنگال کی شرح پیدائش میں نمایاں تخفیف نظر آتی ہے۔ جو قدرتی اسباب کا نتیجہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ آج کل کے حالات کے درمیان کثرت نفوس کا ہونا ایک قومی مصیبت ہے۔ بیلوں کی گاڑی والے ملک میں اب موٹر کار کا رواج ہو چلا ہے۔ ہم دیو جانس کلبی کی طرح سکندر سے یہ نہیں کہہ سکتے "دھوپ چھوڑ دو" جنگ کے بعد یورپ کی قومیں آبادی بڑھانے کے فکر میں ہوں تو ہوں۔ مگر اس سے ہندوستانی مسئلہ آبادی حل نہ ہوگا۔ یہ یاد رہے۔ کہ مسٹر داتل کے حقائق نہیں بیانات محدود نہیں اور ان کے ساتھ جب کئی ایک معاشرتی اور اقتصادی برائیاں بھی ہوں تو اس سے سارے ملک کی نکبت کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں + اس کثیر آبادی کا نتیجہ ذیل کے بیانات سے معلوم ہوگا۔ ایک انگریز ماہر اقتصادیات کہتا ہے۔ اس قدر گنجان آباد ملک کے لوگ ذرائع زیست کے متلاشی رہتے ہیں۔ مصر کے دیہات کی صورت دیکھ لیجئے۔ کثیر العیال فلاح کا گھر ایک کچا جھونپڑا ہوتا ہے۔ جس کی مثال مقدونیہ کے پہاڑوں اور آئرلینڈ کی دلدلوں میں بھی نہ ملیگی۔ اور ان جھونپڑوں میں نہ تو کوئی روزن ہے۔ اور نہ دودہ دان۔ ان میں سوائے چند برتنوں۔ ایک چٹائی اور جو کے ایک ڈھول کے اور کچھ بھی نہیں ملتا غریب ہندوستانی دیہاتی کا بھی یہی حال ہے۔ ایک کچا پھوس کا جھونپڑا جس کے آگے ہمیشہ گوبر کوڑا اور لید جمع ہوتی ہے۔ اور ایسے جھونپڑوں کے مجموعے کو دیہات اور قصبات کہا جاتا ہے +

شہروں کی حالت کچھ بہتر نہیں۔ مغربی غریب آبادی کے مکانات مشرق سے کہیں اچھے ہوتے ہیں۔ فرانسیسی لوئی برٹراں قاہرے۔ قسطنطنیہ اور دیگر مشرقی شہروں کے غریب حصہ آبادی کی نہایت بھیانک تصویر کھینچتا ہے۔ قاہرے کے متعلق مندرجہ ذیل بیانات ہیں۔ دو یا تین کمروں کو ملا کر جس میں روشنی کا نام نہیں۔ گھر کہا جاتا ہے۔ ان کی

دیواروں کا پلستر بوسیدہ اور چھتیں شکستہ ہوتی ہیں۔ اور چٹائیوں اور غلیظ کپڑوں میں کیڑوں اور حشرات الارض کے گھر ہوتے ہیں +

ہندوستان کی موجودہ صنعتی زندگی کے ابتدا سے پہلے ہی ہندوستانی شہروں کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ ان شہروں کے تنگ و تاریک بازاروں اور گلیوں میں آج کل کے کارخانوں کے مزدوری پیشہ لوگ بھچے ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات کام سے چور ہو کر مرد اور عورتیں کارخانوں سے دور نہیں جا سکتے۔ اور وہ آس پاس کے بازاروں ہی میں پڑ رہتے ہیں۔ کلکتہ میں رہائشی مکانوں کے گنجان حصے کی قیمت زمین اب ساڑھے سات لاکھ روپے فی ایکڑ ہو گئی ہے۔ اور ان مکانوں کے متعلق ایک مبصر لکھتا ہے۔ ایسے مکانات میں غربا انسانوں کی نہیں۔ بلکہ حیوان کی سی زندگی بسر کرتے ہیں گھروں میں سے بدبو آتی ہے۔ نہریں اور نالیوں سے سڑاند اٹھتی ہے گلیوں کے بیچ غلاظت کو کوٹتے رہتے ہیں۔ اور مویشی کثیف تالابوں سے پانی پیتے ہیں اور اس غلاظت سے لوگ مکان لیپتے ہیں۔ بمبئی کے متعلق ایک ہندوستانی افسر حفظان صحت لکھتے ہیں ایسے مکانوں میں امراض کے کیڑے اور اجرام پیدا ہوتے ہیں۔ اور افلاس۔ بد اخلاقی شراب خوری اور جرم کی آماجگاہ ہیں۔ ہزارہا مرد و زن چھوٹے چھوٹے حجروں میں اٹے رہتے ہیں +

ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں گنجان آبادی لندن سے چہار گنا ہے۔ جنگ نے لکھو کھہا مخلوق کو شہروں میں آکر آباد ہونے کی ترغیب دی ہے۔ مگر مکانات کی تعمیر بوجہ صرف کثیر رک گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے۔ کہ مکان کے کرائے چہار چند اور زمینوں کی قیمت ہزار چند ہو گئی ہے۔ مسٹر فشر کہتا ہے۔ بمبئی میں کرائے حد درجہ بڑھ گئے۔ اور شدید احتجاج کے بعد کرایوں کی شرحیں مقرر کی گئیں۔ مگر اس سے مکانات کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا +

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے۔ کہ کرایہ مکانات میں اضافہ عام ضروریات زندگی کی گرانی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا ہے۔ ۱۹۱۶ء سے تو اس نے نہایت شدید وضع اختیار کر لی ہے اس سال سے زیادہ زمانہ ہوا پریڈال لکھتا ہے۔ قسطنطنیہ۔ دمشق۔ بیروت۔ قاہرے میں اخراجات کی عام ترقی کی شکایت ہو رہی تھی۔ اور آج تو حالات بالکل ہی دگرگوں ہیں۔ دلنشاں چہول مقرر کے حالات پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ایزادی شرح مزدوری ضروریات زندگی کی گرانی کے متعلق

نہیں ہوئی۔ جس کے باعث کم استطاعت مزدور گاڑی بان اور ادنےٰ دوکاندار کافی معاش بہم نہیں پہنچا سکتے +

اِس کا ایک اور بد نتیجہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ افلاس شرابخواری۔ جوأ بازی اور اقدام جُرم کی محرک ہو رہی ہیں۔ اور اِن سب سے بڑھ کر ایک قسم کی شدید معاشرتی بےچینی پیدا ہو رہی ہے۔ جس کا ذکر باب پیش آیند میں کیا جائیگا +

باب نہم

معاشرتی بے چینی اور بلشویت

بے چینی تغیرات کا لازمی نتیجہ ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ تغیرات اچانک واقعہ ہوئے ہوں یہ ایک امر واقعہ ہے۔ کہ جب کہیں حالاتِ سابقہ کی رد و بدل ہو کر نئے حالات قائم ہوا چاہتے ہیں تو جب تک وہ حالات قائم نہ ہو جائیں۔ صورت افراط و تفریط موجود رہتی ہے۔ بے چینی ہر ایسی جماعت انسانی کا جبلی خاصہ ہے۔ جو بالکل ہی حالت جمود تک تنزلی نہ کر گئی ہوں۔ اور تھوڑی بہت بے چینی تو نہایت ہی خوش آیندہ ہے۔ اور بے چینی جماعت کی زندگی کی علامت ہے۔ اور اس قسم کی بے چینی کو بے چینی نہیں کہا جاتا۔ بلکہ یہ ایک عام صورت عمل ہے۔ یعنی پرانی باتوں کی بنا پر نئے حالات کا قیام۔ یہ نئے حالات اس تدریج سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ کہ تغیر کا پتہ نہیں چلتا اور یہ حالات ہمیشہ اپنی جگہ ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ جس سے ان کا احساس عام طور پر لوگوں کو نہیں ہوتا +

مگر یہی رائے شدید بے چینی کے متعلق قائم کی نہیں جا سکتی۔ بلکہ یہ ناگہانی تغیر۔ افرط تفریط اور ایسی تہ و بالگی کی علامت ہے جس کی سنوار فوراً ہی نہیں ہو سکتی۔ شدید بے چینی شدید جماعتی خرابی صحت کی علامت ہے۔ اور یہ اس پُرخطر امکان کا پیش خیمہ ہے۔ جسے اصطلاح میں انقلاب کیا جاتا ہے

تاریخ مسلمانانِ مشرق اس دعوے کی اچھی دلیل ہے۔ تمدنِ عرب کے زمانۂ عمل میں ناگہانی تغیرات اور شدید جاتیں رونما ہوئیں۔ تحریک معتزلہ سے تخیلات کی مختلف النوعی کا ظہور ہوا جس سے کئی قسم کے اقتصادی سیاسی اور معاشرتی نتائج پیدا ہوئے۔ مگر یہ زمانہ تغیر ایک عارضی زمانہ

تھا۔ عربی تہومندی اور اسلامی محرکات عمل مشرقِ قدیم کی بے حس اور عام سستی کا ازالہ نہ کرسکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تھوڑے عرصے کی جدوجہد کے بعد پرانی فلاکت نے پھر عود کیا۔ اور گو ظاہری صورتیں کسی قدر بدلی رہیں۔ مگر حالات کی حقیقت میں کچھ گہرا تغیر واقع نہیں ہوا۔ تمدن عربی اب دن بدن حالت سکون وجمود اختیار کرتا گیا۔ اور اس جمود نے ہیجانِ عمل کے سلسلے بند کردئے۔ ہاں کہیں کہیں خوارج اور بکتاشی اصول عمل کا اظہار ہوتا رہا۔ مگر ان کا اثر عام حالات پر کچھ نہ پڑا +

انیسویں صدی کی اسلامی تجدید کے آغاز معاشرتی بے چینی کی علامات پھر ظاہر ہونے لگیں وہابی تحریک محض مذہبی بدعات کی دشمن ہی نہ تھی۔ بلکہ دنیائے اسلام کے موجود جمود کے خلاف احتجاج اور اس کے عام مظاہرات حکومت حاضرہ کی بیخ کنی تھی۔ اور یہی حقیقت ایران کی بابی تحریک کی بھی ہے +

ان تحریکات کو مغربی احساسات واختراعات سے خوب مدد ملی۔ اور ملتی کیوں نہ۔ کیا خود اہل مشرق اپنے عہد سابق کی بے بسی۔ بے حسی اور عدم اولوالعزمی سے بیزار نہ ہوچکے تھے۔ اور ایسے ایسے تغیرات کا سامان نہ بنا رہے تھے۔ جنہیں انقلابات کہا جائے۔ تو بجا ہوگا۔ ان سیاسی معاشرتی۔ اقتصادی اور روحانی تغیرات کا اور ان کے نتائج کا ذکر بابہائے سابقہ میں مفصل طور پر ہوچکا ہے +

اس زمانہ مرور کے انقلابی نتائج کا خاکہ ایک انگریز ماہر اقتصادیات نے ذیل کے الفاظ میں کھینچا ہے وہ کہتا ہے۔ ہندوستان کے شہری اور مفصلاتی متضاد حالات بھلا کہیں اور جگہ ملیں گے۔ دیہاتی ہندوستان اب تک قرون وسطیٰ کے حالات کے ماتحت ہے۔ اور شہروں کی کیفیت بالکل مغربی بلاد کے مماثل ہیں بنک۔ تھیٹر۔ حتیٰ کہ اشتہاری تختے لئے پھرنے والے آدمی جو لندن کے بازاروں میں نظر آتے ہیں یہاں بھی ہیں جہاں یورپ میں سارے ملک کی حالت ایک سی ہے۔ خواہ بڑے شہر ہوں یا دیہات جس کی وجہ یہ ہے کہ یورپی ترقی تدریجی اور ارتقائی ہے۔ مگر ہندوستان میں یہ بات نہیں۔ وہاں شہر کے اندر تو دور جدید ہے مگر اس کے نواح دو سو سال کے طریق زندگی پر بود وباش کر رہے ہیں +

ہندوستان کی اس انقلابی ترقی کا بہترین ثبوت ہندوستان کے دیہات ہیں۔ دیہات میں قدیم رواج قائم ہیں۔ تو ان کے ساتھ ساتھ زمانہ جدید کے طریقوں پر بھی عمل کیا جاتا ہے۔ اختلاف

کی قیمتیں بعض اوقات مقررہ ہیں۔ اور بعض اوقات منڈی کے بدلتے ہوئے بھاؤ کے مطابق ہوتی ہیں لوگوں کے دلوں میں آمدنی اور حیثیت بڑھانے کا شوق پیدا ہو چلا ہے۔ اور قدیم طریق استدلال میں اب نئے نئے وجوہ داخل کئے جا رہے ہیں۔ مگر شہروں کے حالات اِن سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ اور یہ اندازہ لگانا کہ اِن ہر دو کو آپس میں کیسے مربوط کیا جائے۔ نہایت ہی مشکل نظر آتا ہے +

تو گویا ہندوستان پر اقتصادی انقلابات کا غلبہ ہے۔ اگر کسی قسم کے یورپی حالات اِس کے مماثل کہے جا سکتے ہیں۔ تو وہ شاید مغربی صنعتی انقلاب کے حالات ہیں۔ مگر پھر بھی تشبیہ ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ یورپ کے لئے یہ خوش قسمتی کا سبب ہے۔ کہ اِس کے عقلانی اور صنعتی انقلاب کے دور ایک ہی وقت میں نہیں آئے۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو مغربی جماعتی شیرازہ پراگندہ ہو گیا ہوتا۔ مگر نپولین کی لشکر کشیوں کے تھپیڑوں کے باوجود کاروباری اور صنعتی بے چینی نے پھر بھی خاصی معاشرتی اور سیاسی بے چینی پیدا کر دی۔ یہ ایک قائم شدہ اصول ہے۔ کہ جب قومیں کی قومیں حالات زمانہ سے متاثر ہو کر اپنے اقتصادی معیارات کو بدلتی ہیں اِس عمل سے لکھوکھہا نفوس کو نقصان پہنچتا اور لکھوکھہا کو فائدہ بھی ہوتا ہے۔ جس سے سیاسی شورش کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں۔ مغربی صنعتی انقلاب سے نہ صرف انقلاب ۱۸۴۸ء بلکہ جماعت اشتراک پرست کی ابتدا ہوتی +

مگر پھر بھی یہ انقلاب اسقدر تند اور ناگہان نہ تھا جیسا کہ اسکا ہندوستانی مماثل یورپی دریافت طاقت بخار و اختراعات مشینی سامانوں کی صنعتی اور تجارتی کاروبار اور سرمایہ کے استعمال کے بعد ہوئیں۔ مگر ہندوستانی صنعتی ترقی مغربی حالات سے کہیں بڑھ کر سرعت سے ہو رہی ہے۔ اب ریل کی لائن اِن علاقوں میں بنائی جا رہی ہیں۔ جہاں پہلے کچی سڑکیں نہ تھیں۔ وہاں کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں۔ جہاں اِس سے قبل دستکاریاں بھی کم تھیں۔ اور اِن کارخانوں کے لئے لوگ بالکل تیار نہ تھے۔ اِس کا نتیجہ کیا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج کل برہمن محض مندروں کے پجاری نہیں رہے بنیے بنیے نہیں ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے دستکاروں کا کام مندا پڑ گیا ہے۔ جب اِن بدلے ہوئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے حالات پر اور اِن کے لازمی نتائج پر غور کیا جائے۔ تو پھر صحیح طور پر اِس سیاسی بے چینی کی معنوی حقیقت کا پتہ چلے گا۔ جس کے مظاہرات آج کل ہمارے پس و پیش ہو رہے ہیں۔ مجھے تو تعجب ہے کہ اِس بے چینی کے مظاہرات زیادہ شدید اور خوفناک کیوں نہیں۔ اگر ہندوستان ایشیا میں نہ ہوتا۔ تو اِس کی بے چینی اِس کی موجودہ حالت سے گذر

کر شدید کشت وخون اور کشا کشی کی صورت اختیار کرلینی +

مندرجہ بالا بیانات صدی جاریہ کے آغاز میں لکھے گئے تھے۔ جب کہ جنگ عظیم کے ہولناک واقعات برپا نہ تھے۔ اور روس میں ایک وضع کی نیم ایشیائی حالت قائم نہ ہو چکی تھی۔ مگر اِس زمانہ میں بھی کئی ایک مبصروں نے ایشیا کے بڑھتے ہوئے ہیجان کا پتہ دے دیا تھا۔ ہندوستانی وطن پرست لیڈر بپن چندر پال کہتے ہیں۔ یہ نام نہاد بے چینی محض بے چینی نہیں۔ بلکہ ایک قسم کی شدید معاشرتی اور روحانی انقلاب ہے۔ جس کا منتہائے نظر کچھ اور ہی ہے۔ فرانسیسی مبصر شیلے کہتا ہے۔ اِس بے چینی سے شدید اقتصادی تبدیلیاں ہوں گی۔ جس سے مصیبت اور تکلیف پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی +

جنگ سے پہلے گرانی ضروریات نے آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان منافرت پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک سر حفظانِ صحت نے کہا "ہندوستانی بے چینی کا اصلی سبب لوگوں کی مکروہ گندگی ہے۔ بعض کہیں گے۔ کہ عام جسمانی گندگی تو ہندوستان میں ہمیشہ سے تھی۔ تو میرا جواب یہ ہے۔ کہ اِس وقت میں مختلف افراد و طبقاتِ جماعت کے درمیان چنداں تفاوت نہ تھا۔ اور ماسوا معدودے چند سب ایک ہی معاشرتی درجے میں تھے۔ مگر اب لوگ اپنی فلاکت اور افلاس کے ساتھ انگریزوں اور قلیل التعداد ہندوستانیوں کی فارغ البالی اور ثروت و خوشحالی کو دیکھ کر برافروختہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سیاسی ایجیٹیٹروں بابوؤں اور مدعیان حقوق کے غصہ کا اصلی موجب اِن کی معاشرتی غربت اور درماندگی ہے +

مختلف طبقات کی اِس آپس کی منافرت میں اور بھی ترقی ہونے لگی۔ جب ایک ذات۔ قبیلے یا پیشے کے ہندوستانی دوسرے اہل وطن گروہ کے افراد سے لاپرواہی برتتے رہے۔ تمام مشرق ممالک میں "انسانی خدمت" مغربی معنوں میں قطعاً مفقود ہے۔ اِسی عنوان پر ایک ہندوستانی صاحب فرماتے ہیں۔ جماعتی سلوک کا کوئی عام معیار موجود نہیں۔ بنابریں معاشرتی اصلاح کا دائرہ عموماً اپنی ذات یا اپنے ہم پیشہ لوگوں تک ہی محدود رہا ہے۔ اور مجموعہ افراد کا وہ جسد بے روح جسے شہر کہا جاتا ہے۔ انسانی ہمدردی اور سلوک باہمی کے فیوض سے بے بہرہ ہے۔ ایک امریکن ماہر معشیت بلاد مشرقی میں غریب طبقے کی بے بسی پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ایشیائی مزدوری پیشہ افراد کا کثیر تعداد میں ایک جگہ رہنے کے خطرات میں سے ایک یہ ہے کہ اہل مشرق باہمی ہمدردی اور

جماعتی سلوک کے محاسن سے قطعی عاری ہیں اور ان میں اب تک وہ قومی اور موثر رائے عامہ پیدا نہیں ہو چکی۔ جو مغربی قومی طبقات کی آپس کی رواداری اور سلوک کی محرک اور ضامن ہیں۔ اور جو ایک صدی کی اقتصادی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ جب ایشیائیوں کا باہمی رابطہ اور ہمدردی کا جذبہ عملی صورت اختیار نہ کریگا۔ معاشرتی بے چینی کے بدترین پہلو ظاہر ہوئے بغیر نہ رہیں گے +

معاشرتی بے چینی کا حلقہ اثر دو طبقات جماعت ہیں۔ ایک تو مغربی تعلیم یافتہ گروہ اور دوسرا مزدوری پیشہ حصہ آبادی۔ اس تعلیم یافتہ گروہ بالخصوص اس کے نیم تعلیم یافتہ حصہ کے انقلابی میلانات زمانہ حاضرہ کی تمام ایشیائی شورشوں کے بانی ہوئے ہیں۔ مزدوری پیشہ گروہ کے متعلق بعض مبصروں کا خیال ہے کہ وہ بوجہ اپنی ناتجربہ کاری جہالت اور جدوجہد معاش پر منحصر لیاقتِ انقلاب نہیں ہو سکتے بالخصوص جب کہ ان کے اور تعلیم یافتہ گروہ کے درمیان کچھ تعلق نہ ہو +

فرانسیسی ماہر اقتصادیات یہاں کہتا ہے۔ تحریک وطنیت کا بانی ملک کا متوسط طبقہ ہے اور یہ لوگ سرمایہ دار یا صاحب ثروت جماعت کے مخالف نہیں بلکہ معاون ہیں۔ مزدوری پیشہ جماعت میں سے "قلی گروہ" کو تو اپنی حالت کو درست کرنے کی اُمید ہی نہیں۔ اور مزارعین کی طرح ان میں غصے کا جذبہ قطعاً موجود نہیں۔ اور بچارے وہ کس پر اپنا غصہ نکالیں۔ آبادی کے تمام طبقات اور ذاتیں ان سے دور رہنا چاہتی ہیں۔ اور اُن کی حیثیت کو ذلیل سمجھتی ہیں۔ کارخانوں کے دستکار تعداد میں محدود ہیں۔ اور ان کا گروہ اسقدر منظم نہیں۔ کہ وہ حالات حاضرہ پر کچھ اثر ڈال سکیں۔ ہاں کبھی کبھی وہ ہڑتالیں کرتے ہیں۔ مگر ان کی حیثیت نہ تو مغربی "ٹریڈ یونین" کی سی ہے۔ اور نہ کسی اور ذات کے متحدہ ممبروں کی سی۔ تعلیم یافتہ طبقہ سے وہ نا اُمید ہیں۔ کیونکہ یہ گروہ اپنی "شہریت پن" اور حفظ و توقیر ذات کا حامی ہے۔ اور بالعموم اہل ثروت لوگوں کا دست نگر +

ہندوستانی صنعتی زندگی ابھی اپنے ابتدائی مدارج میں ہے۔ فی الحقیقت مادی تعمیرات جو کارخانوں کے قائم ہونے اور معاشرتی معیارات کے تہ و بالا ہونے کا نتیجہ ہیں۔ ابھی تک اپنی اولین حالت میں ہیں اور ارتقاء ذہنی جس سے معاشرتی فلاح کی تمنائیں پیدا ہوتی ہیں۔ ابھی تک شروع ہی نہیں ہوئی +

ہندوستانی صنعتی کاروبار کے حالات کے متعلق دیگر مبصرین یہ خیال نہیں رکھتے۔ مسٹر رامزے مکڈانلڈ انگریزی مزدوری پیشہ جماعت کا لیڈر کہتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ در ماندہ ہندوستانی مزدوری

پیشہ جماعت مختلف طبقات آزادی کا ایک معتد بہ حصہ بن کر ان کی آپس کی کشاکش میں نمایاں حصہ لے سکے۔ میری رائے میں امید موہوم ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اِس امکان کی جھلک بعض دفعہ پڑ ہی جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ اول تو ہندوستانی کارخانجات کے قیام سے ایک ایسا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جس کے پاس نہ زمین ہے اور نہ کوئی مکان اور جس کی مماثل یورپ میں کوئی بھی فرقہ آبادی نہیں۔ اور یہ اُمید رکھنی کہ یہ جماعت اپنے اِن حالات کے باوجود سیاسیات سے علیحدہ رہیں۔ ایسا ہی بے معنی ہوگا۔ جیسا کہ یہ خیال کرنے لگ جانا۔ کہ وہ جماعت اپنے آپ کو مغربی اصولوں کے مطابق منظم کرے۔

علاوہ بریں یہ مزدوری پیشہ جماعت مغربی قسم کی ٹریڈ یونین بنانے کی خواہش ظاہر کر چکی ہے ہندوستان میں صنعتی انجمنیں قائم کیجارہی ہیں۔ آئے دن ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں۔ بعض تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تحریک ہائے اصلاح ٹریڈ یونین کے قیام کے حامی ہیں اور اِس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ جن سے انگلستان کے اہل حرفت واقف ہیں۔ سرمایہ داروں کی مالی حکمت عملی سے بھی اِسے مدد ملنے کی امید ہے۔ بعینہٖ جیسے جاپان میں ہوا۔ گو جاپانیوں کی طرح ٹریڈ یونین پالیسی ہندوستان میں بزور قانون دب نہیں سکتی۔ مگر اب تک یہ حرفت پیشہ گروہ جس کے افراد پہلے پہل دیہات سے آئے۔ ابھی تک کسی بڑی حیثیت کو حاصل نہیں کر سکا۔ مگر امید کی جاتی ہے۔ کہ یہ جلد ہی اپنی طاقت کی تنظیم کر لیگا۔ اور جونہی اسے سیاسیات کا احساس ہوتا جائیگا۔ اِس کا نظام پختہ ہوتا جائیگا۔

مشرقِ قریب کے متعلق سلسلہ بیان پھر کریں۔ ایک فرانسیسی مبصر کی پیشین گوئی کا حوالہ دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس نے مصری فلاحین کی معاشرتی نکبت کو دیکھ کر ان میں شدید ہیجان پیدا ہونے کے امکان کو جتا دیا تھا۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں نے مصری مزدوری پیشہ جماعت میں دن بدن اضافہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ضروریات زندگی گراں ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مگر آمدنیاں وہیں کی وہی ہیں۔ افلاس ہر طرف نظر آرہا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں۔ جبکہ اِس طبقے کے لوگ مایوس ہو کر فساد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ گو اجنبی سرمائے کے استعمال سے کسی وقت تک یہ شورش معرض تعویق میں پڑ جائے تو پڑ جائے۔ مگر یہ بات آخر ہو کر رہے گی۔ اور بہت جلد

واقع ہو جائے۔ تو تعجب کی بات نہ ہوگی۔ لوگوں کی خوشحالی کا دائرہ دن بدن تنگ ہو رہا ہے۔ اور اب اِس اسلامی ملک میں اسلامی اشتراکیت کے شعلوں کا بلند ہونا بس دنوں کی بات ہے۔ ایک بلجی نے الجزائر میں شہری مزدوری پیشہ طبقہ میں اِس قسم کے جذبات کے وجود کو محسوس کیا۔ مغربی خیالات کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔ الجزائر کے بندرگاہ پر اہل ملک کے اسلامی خیالات کی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔ جہازوں میں کوئلہ بھرنے والے۔ خلاصی۔ انجنوں میں کام کرنے والے خواہ کسی ملت کے ہوں۔ رفتہ رفتہ ایک نئے اقتصادی جماعت میں مربوط کئے جا رہے ہیں۔ اور یورپی اہل حرفت کے دوش بدوش وہ اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر الجزائر میں بہت کارخانے بن جائیں۔ تو وہاں بھی خالص مذہبی زندگی ایسا ہی مفقود ہو جائے گی۔ جس طرح سے یورپ سے رخصت ہو چکی ہے +

قطع نظر اِس امر کے کہ حرفت پیشہ گروہ کب اپنے نظام کو درست کریگا۔ اِس بات سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ ہیجان قبل از جنگ جس کے سیاسی پہلوؤں پر بحث ہو چکی۔ معاشرتی معاملات میں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم اب سمت انحطاط کی طرف اِس قدر ترقی کر گئے ہیں۔ کہ ہندوستان میں کئی ایک اضلاع ایسے ملیں گے جہاں سے بوجہ عدم امنیت لوگ اپنی املاک چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ اور قانون کا رعب اس درجہ زائل ہو چکا ہے۔ کہ شریر لوگ اسے اب اپنے ظلم کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ سرحدی پٹھان ایسے ایسے ہوشربا ظلم کرتے ہیں۔ کہ جن کو سن کر اوسان خطا ہوتے ہیں۔ عام جلسے ہوتے ہیں۔ اور اُن میں ایسے معاملات پر بحث ہوتی ہے۔ جن کا تعلق اصل حالات سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور اندرونی یا خارجی معاملات ملک کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جس پر وہ رائے زنی نہیں کرتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو پہاڑ بنا کر دکھاتے ہیں۔ اور امن اور نظام قائم رکھنے کی بجائے حاکم ضلع کو کئی ایک ایسے امور پر توجہ کرنی پڑتی ہے۔ جو بالکل بے حقیقت ہوتے ہیں۔ سرکاری ملازمت کے ادنٰے مدارج میں اِس قسم کی ٹریڈ یونین بن گئی ہیں۔ اور فوج اور پولیس کے افسر اپنے رنگروٹوں کے تمرد اور گستاخی کے شاکی ہیں +

جنگ نے بلاشبہ اِس مشرقی بے چینی میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ اور مشرق قریب کے کئی حصوں میں غصہ۔ غضب اور مایوسی کے جذبات متحرک ہو گئے ہیں۔ اور ان سب کے ہوتے ہوئے

ان کے تنظیم کے لئے بلشویت آموجود ہوتی ہے۔ بلشویت بین طور پر انقلاب عالم کی حامی اور مغربی تہذیب کے بیخ کنی کے درپے ہے۔ اور اس مدعا کو حاصل کرنے کے لئے بلشویک لیڈروں نے نہ صرف یورپ پر حملے کئے ہیں۔ بلکہ یورپ کے مشرقی مقبوضات پر جانب سے وار کئے ہیں۔ ان سے ان کا مقصد یہ ہے۔ کہ مشرقی انقلاب کے ہوتے ہوئے مغربی اقتصادی توازن درہم برہم ہو جائیگا اور خود یورپ کے لوگ انقلاب پر آمادہ ہو جائیں گے +

بلشویت کے مدعیوں کی کوششیں اس مقصد کو اپنے سامنے رکھے ہوئے تھیں۔ اور ان کے نمائندے دنیا کے ہر گوشے میں ہر ممکن ذرائع سے اپنے دعاوی کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے۔ مگر ان کے مقصد انقلاب محض اصول اقتدار جمہوری ہی نہ تھا۔ بلکہ ان کی غرض یہ تھی۔ کہ سب سے پہلے امنیت اور انتظام کی روح کو نیست و نابود کیا جائے۔ بنابریں دنیا کے ہر ایک براعظم میں بلشویک نمائندوں نے لوگوں کے جذبات انتقام و حرص کو بھڑکانا شروع کیا۔ اور ہر ایک مقامی بے چینی کے اسباب سے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ بلشویک جماعت نے اس سے اپنا مطلب نکالنا شروع کیا +

انقلاب سرخ کا بہترین میدان عمل مشرق قریب تھا۔ اور یہ قدرتی بھی تھا۔ کیونکہ یہ حصہ زار روس کی طمع سے باخبر تھا۔ اور روسیوں نے اس بات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ترکی۔ ایران۔ افغانستان اور ہندوستان کے لوگوں کے بھڑکانے کے لئے لیڈران ماسکو کو لمبے چوڑے پروپاغندا کی ضرورت نہ تھی۔ زار کی حکومت کے صدمے ان ملکوں پر پڑ چکے تھے۔ اور اس کے عہد کے خفیہ عہدناموں کی اشاعت نے اہل مشرق کی آنکھیں کھول دیں +

مشرق میں بلشویک پروپاغندا کے دو مقصد ہیں۔ (۱) مغربی اقتدار کی بربادی (۲) اس مغربی اقتدار کی بربادی کے بعد ایشیائی اہل دولت و اقتدار کی تباہی جس کا اثر وہ جانتے ہیں۔ یورپ پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان مقاصد کا ذریعہ یہ ہے۔ کہ بلشویک گروہ مشرقی اقوام کے مذہبی اور معاشرتی احساسات اور ان کے وطنی جذبات کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ مگر اس مرحلے کے بعد مذہب اسلام اور مصطفٰے کمال پاشا جیسے لوگوں کا خاتمہ کرنے کی خواہش مند ہے۔ ناظرین ان دو متضاد مقاصد کی تکمیل کو مشکل سمجھیں گے۔ مگر اس کی حقیقت بھی واضح کی جاتی ہے +

روسی بلشویک کی پالیسی کا آغاز ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں اس پالیسی کو عملی صورت دینے کی

تیاری ہوتی رہی۔ ایک ہمہ گیر صیغہ پروپاگنڈا قائم کیا گیا۔ عہد نامہ کے کئی ایک افسروں کو اس کام کی تکمیل میں لگایا گیا۔ روس کے مسلمان بالخصوص تاتاریوں اور ترکمانوں نے اس کام کے لئے بہت مدد دی۔ اور جنگ کے خاتمے پر کئی محب وطن حریت پرست روس میں بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے۔ اور ترکی کے تمام منتخب لیڈر۔ طلعت پاشا۔ جمال پاشا۔ انور پاشا فتحمند اتحادیوں سے بچنے کے لئے روس چلے گئے۔ اور ایسا ہی ہندوستانی وطن پرستوں نے کیا۔ ۱۹۱۸ء کے اخیر تک روسیوں کا صیغہ اشاعت خوب منظم ہو چکا تھا۔ اور اس کی دو شاخیں تھیں۔ اول شاخ ہندوستان کے لئے اور دوسری شاخ مشرق اقصےٰ کے لئے۔ اس شاخ کے متعلق اس کتاب میں بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مگر یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ چینیوں نے روسی عمل کی ایک حد تک اعانت کی ہے ہندوستانی اور اسلامی ممالک کے متعلق شاخ نے کارنمایاں کا ثبوت دیا۔ اس کے معاونوں نے ہزاروں بلشویک کتابیں اور رسائل مشرقی زبانوں میں ترجمہ کر ڈالے۔ اور سینکڑوں خفیہ ایجیٹیٹروں کو میدانی کام کے لئے تیار کیا۔ جو ہر رنگ بے چین گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۱۹ء کے شروع سے بلشویک اشاعت کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اتحادیوں کے بعد از جنگ بدعہدیوں اور بدکرداریوں نے روسی لیڈروں کی خوب مدد کی اور ماسکو نے بر ملا مصطفےٰ کمال پاشا اور ایران افغانستان مصر اور ہندوستان کے لیڈروں کی حوصلہ افزائی کی۔ مشرق قریب میں روسیوں کو خاص کامیابی ہوئی۔ نہ صرف ہندوستان کی ۱۹۱۹ء کی شورش میں روسی نظر آ رہی تھی بلکہ افغانستان کے ذریعے سے روس نے انگلستان کو کاری ضرب دی۔ یہ تو معلوم ہی ہے۔ کہ امیر سابق حبیب اللہ خان مرحوم کی خیر خواہی کی بدولت دوران جنگ شمال مغربی سرحد پر امن رہا۔ مگر ۱۹۱۹ء میں امیر مرحوم شہید ہو گئے۔ اب افغانستان کی پالیسی بدل گئی اور انگریزی اقتدار کے دشمن یعنی امیر امان اللہ خان خلد اللہ حشمتہ تخت نشین ہوئے۔ امیر حال نے جھٹ ماسکو سے نامہ و پیام کرنا شروع کرایا۔ اور حکومت ہند سے اپنی آزادی منوانے کا پیام بھیجا۔ قبائل سرحد نے سارے سرحد میں بے چینی کی ایک آگ سی لگا دی۔ شدید جنگ کے بعد انگریزوں اور افغانوں کے درمیان صلح کی ٹھہری۔ مگر انگریزی حکومت نمایندگان افغانستان پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکی۔ اور اسے افغانی دعوئے آزادی کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس وقت میں روسیوں نے اپنی شاخ اشاعت روسی ترکستان

میں قائم کر لی تھی - اور اُس کا مقصد نہ صرف ترکستان بلکہ افغانستان اور ہندوستان میں اشاعت بلشویت تھا ؛

سنہ ۱۹۲۰ء میں بلشویک پروپاغنڈا کے تاثرات مشرق قریب میں بیش از پیش شدت سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے - جس شوق اور گرمجوشی سے روسیوں نے ایرانیوں اور ترکوں کے جذبات حریت کا خیر مقدم کیا - اُس کا ذکر محررہ بالا صفحات میں ہو چکا ہے - حقیقت امر یہ تھا - کہ انقلاب سُرخ کے عقاید سے تنفر کے باوجود اتحادی چیرہ دستیاں مشرقی اقوام کو روس کا دست نگر بنا رہی تھیں - مثلاً ماسکو میں افغانی سفیر نے ازدستیا اخبار میں اظہار خیالات کرتے ہوئے برملا کہا - میں نہ اشترا کیت پسند ہوں - اور بلشویت پسند - مگر میرا اسیاسی پروگرام ایشیا سے اخراج اثر مغربی ہے - میں ایشیا سے مغربی منفعت اندوزی کا جس کے انگریز نمایندے ہیں - دشمن ہوں - اور اس بات میں ہم میں اور بلشویک جماعت میں یکجہتی ہے - افغانستان اور ہندوستان سرمایہ داری کے تجارتی اصولوں سے متنفر ہیں - اور شاید مغربی وضع کی پارلیمنٹی حکومت کا قیام بھی ان ملکوں میں نہ ہو سکے - میں یہ نہیں کہہ سکتا - کہ ان واقعات کا اثر کہاں تک ہوگا - مگر میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا - کہ حکومت سُرخ کی اس اپیل کا جو اس نے سرمایہ دار قوموں (جو ہمارے نزدیک اجنبی کیا بلکہ صاف صاف طور پر مغربی ہیں) کے خلاف کی ہم پر بےحد اثر ہوا ہے - ایک اور بات جو روس نے کی وہ خفیہ عہد ناموں کی اشاعت تھی اور اس نے دنیا کی تمام اقوام کو خواہ وہ کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہوں - حق خود اختیاری دے دیا تھا - اس فعل نے ایشیا کی تمام محکوم قوموں کو روس کا گردیدہ کر دیا - چونکہ ہم بلشویک منصوبہ بازیوں سے واقف ہیں - ہمیں یہ یقین نہیں - کہ سفیر افغانستان نے یہ الفاظ واقعی کہے ہوں گے - اور اگر یہ روداد ملاقات جعلی ہی کیوں نہ ہو - مگر پھر بھی ان سے روس کے متعلق مشرقی ممالک کی روش کا پتہ چلتا ہے ؛

اور بلشویک پروپاغنڈا اس قدر کامیاب ہو چلا ہے - کہ اب تو حکومت سُرخ کے مدعی علانیہ طور پر اپنے خیالات کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں - ماسکو کی ایک پالیسی یہ بھی تھی - کہ مسلمان آبادی دنیا کی حوصلہ افزائی کی جائے - اور مشرقی اقوام کو مغربی امپیریل ازم سے محفوظ کیا جائے - بلشویک اپیلیں کسی خاص فرقہ انسانی کو نہیں کی گئیں - بلکہ جمہور کو جیسے حکومت روس نے

نظام خود اختیاری دینے کا وعدہ کیا۔ ۱۹۱۹ء میں لینن نے مندرجہ ذیل اعلان ترکوں کے نام بھیجا "اے مسلمین عالم۔ سرمایہ دار حکومتوں کے غلامو! بیدار ہو جاؤ۔ روس نے عہد زار کے استبداد کو خیرباد کہہ کر تمہاری دستگیری کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ تمہاری مذہبی اور سیاسی خودمختاری کو تسلیم کیا جائیگا۔ تمہارے قبل از جنگ حدود مملکت کا احترام کیا جائیگا۔ اور ترکی وطن کا کوئی حصہ یونانیوں کو نہیں دیا جائے گا۔ دردانیال اور قسطنطنیہ کی شاہراہ ممنہ پر ترکی سیادت قائم رہیگی۔ اور قسطنطنیہ کی حیثیت دارالخلافتِ اسلامیہ برقرار رہیگی۔ مسلمانان روس کو حکومت خود اختیاری عطا کی جاویگی۔ اِن تمام باتوں کے عوض ہم تم سے صرف یہی چاہتے ہیں۔ کہ تم جی توڑ کر استبداد مغربی کا مقابلہ کرو۔ اور اِن کی اطاعت سے باز آؤ۔ جو تمہارے گھروں میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اہل روس کے متعلق بھی عمال سوویٹ نے یہی روش قائم رکھی۔ سرحد ہندوستان کی روسی فوج کو مندرجہ ذیل اعلان سنایا گیا۔ پامیر ڈویژن کے جوانو! تم پر ایک اہم ذمہ واری عاید کی گئی ہے جمہوریہ سوویٹ تم سے امید رکھتی ہے۔ کہ تم ہندوستان اور افغانستان جیسے دوست ممالک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے رہوگے۔ سطح مرتفع پامیر جمہوریہ روس اور محکوم ملک ہندوستان کے درمیان ایک سد کے طور پر ہے۔ اور اِس ملک کے تیس کروڑ باشندے چند ہزار انگریزی نفوس کے پاؤں تلے روندے جا رہے ہیں۔ اِس سطح مرتفع پر تم کو جو فوجِ انقلاب کے ہراول ہو۔ علم آزادی بلند کرنا چاہیئے۔ تاکہ اہل ہندوستان کو جو انگریزی استبداد سے بیزار ہیں۔ معلوم ہو جائے۔ کہ اِن کے خیرخواہ دنیا میں موجود ہیں۔ تم شمالی ہندوستان کے آزاد منش لوگوں سے رشتہ محبت پیدا کرو۔ اور اِن کے جذبہ انقلاب کو قوی کرو۔ اور انگریزی تاجروں سرمایہ داروں اور اُمرا نے جو بہتان اور دروغ بافیاں حکومتِ روس کے برخلاف کی ہیں۔ اِن کا ابطال کرو۔ زندہ باد اتحاد و انقلاب ایشیا و یورپ"

روسی پروپاگنڈا کے ابتدائی مراحل کی یہ کیفیت تھی۔ مگر اس کے چند ماہ بعد اِس کی صورت عمل کچھ اور ہی ہو گئی۔ اِس درجہ ثانیہ میں مغربی حکومتوں پر حملے تو ہوتے رہے۔ مگر اِن کے ساتھ ساتھ اب مشرقی قوموں کو عملی جد و جہد کی طرف مائل کیا جانے لگا۔ اور انگریزی حکام اور ہندوستانی اہل ثروت گروہ کے خلاف عوام کو اشتعال دیا گیا۔ اِس قسم کا ایک بلشویک

اعلان جو انہوں نے جمہور ترک کے نام شائع کیا۔ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ محنت کش جماعت ملک آج کل ہر جگہ اہل ثروت کے خلاف جنگ جدال کر رہی ہے۔ اور یہ اہل ثروت اپنے غلاموں کی مدد سے ملک کے کثیر مگر کمزور افراد کو اپنے پنجہ سطوت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ترکوں کے موجودہ مصائب کے ذمہ وار یورپی امرا ہیں۔ اے رفیقو دنیا کے محنت کش حصۂ آبادی کے ساتھ متحد ہو جاؤ۔ اگر ایسا نہ کیا جائیگا۔ تو ہماری آزادی کی کوئی صورت نہیں۔ انقلاب ترکی کے بہادرو اور انقلاب روس کے مبارزوں سے یک پنجہ ہو جاؤ۔ زندہ باد نظام حقوق ملل ثالث۔ قادر مطلق ہمارا یاور ہو +

مگر یہ اعلانات محض لفظی کارروائی نہ تھے۔ ان پر عمل ہونا بھی شروع ہو چکا تھا۔ روسی ترکستان میں روسیوں نے بلشویک اصول حکومت کی ابتدا کی۔ جب بلشویک حکومت کو ۱۹۱۷ء میں اقتدار حاصل ہوا۔ تو انہوں نے ترکستان کو حکومت خود اختیاری عطا کی۔ اس عمل کے نفاذ ہوتے ہی مقامی رعایا نے اپنی قدیمی سلطنتیں اپنے ملکی امرا کی سرکردگی میں قائم کریں اور حکومت ماسکو سے ایک عام پیمان اتحاد کر لیا۔ ۱۹۲۰ء کے شروع ہوتے ہی روسیوں نے سمجھا۔ کہ اب جمہور اشتراکی انقلاب کے اہل ہو چلے ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ روسی عمال نے مقامی امرا کو معزول کر دیا۔ اہل ثروت لوگوں کی دولت اور املاک پر قبضہ کر لیا۔ اور جستہ جستہ لیناوتو کی کثیر کشت و خون ایذا رسانی اور اسی قسم کے اور بلشویک طریق جبر سے قلع قمع کیا۔ قفقاز میں آذربائیجان پر بلشویک حکومت کو قائم کر دی ہے۔ آذربائیجان کی تاتاری جمہوریہ سلطنت زار کا وہ حصہ تھی جس نے انقلاب روس کے بعد خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کا دارالخلافہ باکو ہے۔ جس میں مشہور عالم روغن زمین کے چشمے ہیں۔ روغن زمین کی پیداوار نے باکو کو ایک مغربی شہر بنا دیا ہے۔ اور اس کے باشندے نیم ایشیائی اور نیم روسی ہیں۔ مقامی مزدوری پیشہ جماعت کی اشتراکیت پسندی سے فائدہ اٹھا کر حکومت روس نے نظام جاریہ کا خاتمہ کر کے اس پر بلشویت کی بنا رکھی۔ اس انقلاب کی تمہیں کی وہی معلومہ ذرائع قتل عام و غارت گری کام میں لائے گئے۔ ۱۹۲۰ء کے ابتدائی مہینوں میں۔ بلشویت کا مشرق اور مغرب پر قبضہ ہو چکا تھا +

اور ان کامیابیوں سے قوی دل ہو کر حکومت ماسکو نے اپنے اصلی ارادوں پر سے پردہ ہٹا دیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں باکو میں اقوامِ مشرقی کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس کا مقصد مشرق میں مغربی استبداد کا خاتمہ ہی نہ تھا۔ بلکہ اِن پر بلشویت قائم کرنے کا جو تقریریں اس عظیم الشان مجمع میں ہوئیں۔ اِن کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ماسکو کی حکومت بین الملل ثالث کی طرف سے تمام ایشیائی محنت کش اور مزارعین جماعتوں کے نام ایک دعوت بھیجی گئی۔ اس دعوت نامے کے الفاظ یہ ہیں۔ مزدوریں و مزارعین ایران طہران کے خاندان قاچار اور اطراف ملک کے خوانین نے پشتوں سے تمہارے ثمرِ محنت کو لوٹا ہے۔ زمین اور املاک جن کے بردے شریعت تم خود مالک تھے۔ تم سے چھین لی گئیں ہیں۔ تمہارے جابر حاکم تم پر ستم آرا ہیں۔ اور تم پر جس قدر چاہیں ٹیکس لگا رہے ہیں۔ اور جب انہوں نے تمہارے ملک کی حالت ایسی کر دی۔ کہ اس میں سے وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ تو انہوں نے تمہارے پاک وطن کو دو ملین قیمت سے کر فروخت کر دیا۔ اور اغیار کو تمہارے ملک میں فوج آراستہ کرنے اور تمہارے خوانین کی مدد سے لوٹنے کا حق بخش دیا۔ یہی حال انہوں نے جنوبی ایران کے روغن زمین کے چشموں کے ساتھ کیا ہے۔

مزارعین عراق۔ انگریزوں نے تمہارے ملک کی آزادی کا اعلان کیا ہے۔ مگر ابھی اہلِ اجنبی فوج تمہارے حلقوم پر چھری لئے بیٹھی ہے۔ اور تمہارے ننگ و ناموس کو تباہ کیا جا رہا ہے۔

مزارعین اناطولیہ۔ انگریزی فرانسیسی اور اطالوی بیڑہ جہازات تمہارے ملک پر قابض ہے۔ اور ان ہر سہ حکومتوں نے تمہارے سلطان کو قید کر رکھا ہے۔ اور اب وہ اس سے بجبر ایک ایسے عہد نامے پر دستخط کروا رہے ہیں۔ جس سے تمہاری ملکی زراعت دولت کے مالک اغیار قرار دئے جائیں گے۔ اور وہ تم کو خوب اچھی طرح لوٹیں گے۔ اس تباہ کن جنگ کے بعد اب بھی کچھ تمہارے پاس رہ گیا ہے۔ انہوں نے ہر کلیہ میں کوئلے کی کانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور اب وہ تمہارے بندرگاہوں پر قبضہ کر کے تمہاری آبادیوں اور کھیتوں کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔

مزدوریں و مزارعین آرمینیا۔ دس سال ہوئے مغربی طاقتوں نے آرمینیوں پر کردوں کے نام نہاد مظالم کی داستان کو دہرا کر تمہیں۔ اپنے سلطان کے برخلاف بغاوت پر اکسایا اور تمہارے خون کی قیمت سے خود سلطان سے تجارتی مراعات حاصل کیں۔ دوران جنگ اِن

طاقتوں نے تمہاری آزادی کا وعدہ کیا۔ اور تمہارے حکام۔ تجار اور پادریوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ تمہارے آئے دن کے فسادوں سے وہ ہاتھ رنگتے رہیں۔ اور جب تک تم میں آپس میں صلح نہ ہو۔ وہ ایک طرف تمہیں شہ دیکر تمہارے ہمسایوں سے تمہیں لڑواتے رہیں۔ اور دوسری طرف ترکی حکومت کے خلاف تمہارے قتل پر احتجاج کر کے ترکی سے اپنے لئے مراعات حاصل کرتے رہیں +

مزدورین و مزارعین شام و عرب۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے تمہاری آزادی کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب انہوں نے تمہارے ملکوں پر اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لی ہیں۔ پہلے تم حکومت سلطان کے ماتحت تھے۔ مگر اب تم فرانسیسیوں اور انگریزوں کے غلام ہو جو ترکوں سے کہیں زیادہ تمہیں لوٹیں گے +

ان تمام واقعات کے نتائج سے آگاہ ہو کر مزارعین ایران نے اپنی پرانی طرز کی حکومت کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ اہل عراق انگریزوں کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ اور مزارعین اناطولیہ مصطفیٰ کمال پاشا کے جھنڈے تلے بیرونی حملے کی مدافعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر ہمیں معلوم ہوا کہ تم ایک جماعت "مزارعین" کی تنظیم کر رہے ہو۔ جس کا مقصد وطن فروش پاشاؤں کی بیخ کنی ہے۔ شام میں امن نہیں ہوا۔ اور اہل آرمینیا کو معلوم ہو چکا ہے۔ کہ اتحادی طاقتوں کے لفظی وعدوں کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور اب خود آرمینیا کی دشناک حکومت حکومت ماسکو سے امداد کی التجا کر رہی ہے +

مشرق قریب کے مزدورین و مزارعین۔ اگر تم اپنے اپنے جماعتی نظاموں کی تکمیل کر لو۔ اور مزارعین کے مفاد کی محافظ حکومتوں کا قیام کرو۔ اور روسی حکومت مزارعین سے اپنا رابطہ قائم کرو۔ تو پھر تمہارے لئے فرانسیسی۔ انگریزی اور امریکی سلطنتوں سے سمجھ لینا کچھ بڑی بات نہیں۔ اور اس کے بعد تم کو ان قوموں سے لین دین کرنے کا لطف آئیگا۔ جو جس قدر تم سے حاصل کریں گی۔ اسی قدر تم کو دیں گی +

کانفرنس باکو میں ان تمام معاملات پر بحث ہو گی۔ کثیر التعداد نمایندوں کو یکم ستمبر کے دن باکو روانہ کرو۔ تم ہر سال ریگستانوں پہاڑوں اور سمندروں کو عبور کر کے اپنے کعبے کو جاتے ہو

اِس مرتبہ میدانوں اور دریاؤں کو طے کر کے باکو آؤ۔ جہاں تمہاری دنیوی فلاح کے اسباب پر بحث ہوگی +

باکو کانفرنس کے اِس دعوت نامے سے اِس کے اغراض کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ یہ کانفرنس میری رائے میں اشتراکی انقلاب کی انجمن تھی۔ نہ کہ وطن پرست افراد کا مجمعہ۔ اِس کے ۱۹۰۰ ڈیلیگیٹوں میں سے صرف ۱۰۰ بلشویت پرست تھے۔ ترکی ایران۔ قفقاز سے کثیر ترین اصحاب ایک مہئے گو عربستان۔ ہندوستان اور چین وجاپان کے نمائندے بھی موجود تھے۔ روسی حکومت کے عمال بلاشبہ اِس مجمع کی جان تھے۔ اور اِس کی کاروائی پران کا خاص اثر تھا۔ مشہور بلشویک لیڈر زمینویو نے جو نظام بین الملل ثالث کی ہیئت عمل کا رُکن اول ہے۔ مندرجہ ذیل تقریر کی "میرا ایمان ہے۔ کہ یہ مجمعہ دنیا کے تاریخی واقعات میں سے ایک ہے۔ کیونکہ اس سے یورپ وامریکہ کی ترقی یافتہ مزدوری پیشہ جماعت کے اتحاد کا ثبوت ہی نہیں ملتا۔ بلکہ اقوام کے جذبات آزادی وغیرت کا احیا بھی نظر آتا ہے۔ اور مشرق اور مغرب کے محنت کش افراد کی تعداد نہ صرف کروڑوں ہے۔ بلکہ وہی تمام دنیا کی روح رواں ہیں اور انہیں کی کوششوں سے اہل ثروت اور اہل محنت فرقوں کے درمیان جنگ کی تکمیل ہوگی +

بلشویت پرست نظام بین الاقوام کا پہلا دعویٰ یہ ہے۔ ہم تمام محنت کش مخلوق خدا کو آزاد کر کے رہیں گے۔ ہمیں معلوم ہے۔ کہ مشرقی مزدوری پیشہ لوگ نہایت ہی درماندہ حالت میں ہیں۔ گو اِس کے وہ خود ذمہ وار نہیں۔ وہ پڑھ لکھ نہیں سکتے۔ اور اوہام باطلہ پر اُن کا اعتقاد ہے۔ انہیں اخبارات کے بیانات کا علم نہیں اور وہ دنیا کے حالات سے بے خبر ہیں۔

اے رفیقو۔ ہیئت بین الاقوام منعقدہ ماسکو نے اِس امر پر کافی بحث کی ہے۔ کہ آیا مشرق میں اشتراکی انقلاب کی تحریک کی جاوے۔ یا اس وقت کا انتظار کیا جائے۔ جب کہ وہ سرمایہ دار فرقے کی منفعت اندوزی کے لئے محنت کرتے کرتے عاجز ہو گئے ہوں۔ تم سب جانتے ہو۔ اِس ہیئت کی رائے عامہ یہ تھی۔ کہ وہ ممالک سب سے پہلے سرمایہ داروں کے ظلم سے آگاہ ہوجائیں تو بہتر ہوگا۔ تاکہ جب اشتراکیت پسندی کے جذبات دوسرے کے فائدہ رسانی سے خود بخود مشتعل ہو جائیں۔ مگر اب ہمارا خیال یہ ہے۔ کہ اِس درمیانی مرحلے کی انتظار تکمیل غیر ضروری ہے۔

روس نے اِس نتیجہ پر عمل کیا ہے۔ اور اہل ایران۔ ترکی۔ چین۔ ہندوستان اور مصر کو بھی نظام خود اختیاری کی تکمیل کے لئے پوری جد وجہد برپا کر دینی چاہیئے۔ اور اِن ملکوں کو سوویٹ طرز حکومت کے لئے ابھی سے تیاری شروع کر دینی چاہیئے۔

مگر با ایں ہمہ ہم اِن افراد کو امداد دیتے رہیں گے۔ جو ہمارے طرز حکومت کے قائل نہیں یا برخلاف ہیں۔ بنا بریں سوویٹ حکومت مصطفےٰ کمال پاشا کی حامی ہے۔ ہم ایک ایک لمحے کے لئے اِس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتے کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی حکومت سوویٹ حکومت نہیں۔ ہم اِسے خوب جانتے ہیں۔ میرے سامنے پارلیمنٹ انگورہ کے اجلاس اول کی روداد ہے۔ اور اِس میں اِس امر کا اقرار کیا گیا ہے۔ کہ "ذات سلطان و خلیفہ محترم ہے" انگورہ کی حکومت مملکت سلطان کو پنجہ اغیار سے آزاد کرانے کی مدعی ہے۔ اور یہی ترکی وطن پرستوں کا نصب العین ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا یہ بلشویک نصب العین بھی ہے۔ میرا جواب ہے۔ نہیں! ہم جمہور کے مذہبی جذبات کی قوت کو خوب جانتے ہیں۔ اور ہم اِن کو نیک تلقین دیتے رہیں گے۔ جس کے لئے کئی سال درکار ہیں۔

اور جب کبھی ہم اقوام مشرق کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ہمیں اِن کے مذہبی احساسات کا خیال خاص طور پر ہوتا ہے۔ مگر اِس کانفرنس میں ہم برملا تم سے یہ کہتے ہیں۔ کہ تم وہ بات مت کرو۔ جو مصطفےٰ کمال پاشا تم سے کہے اور سلطان کی سیادت کو الگ کرو۔ تم آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ زمانۂ سابق کی روایات کی تقلید میں مت لگے رہو ہمارا یقین ہے۔ کہ عہد سلطانی کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ تم کو چاہیئے۔ کہ ایسے طرز حکومت کو برباد کر دو۔ جس کے رو سے ایک شخص لاکھوں نفوس پر حکومت کر سکے۔ روسی رعایا بھی ایک زمانے میں اپنے زار کی مطیع و منقاد تھی۔ مگر جب اِن پر اپنی طاقت کی حقیقت آشکار ہوئی۔ تو انہوں نے زار کے تخت کو اُلٹ دیا۔ اور جب وہی حقیقت اہل مشرق پر ظاہر ہو گی۔ تو وہ بھی اپنے اپنے فرمانرواؤں کی مطلق العنانیوں کا استیصال کریں گے۔ ہم پھر کہتے ہیں۔ کہ ترکی طرز حکومت بلشویت نہیں۔ لیکن ہم ہر طریق سے سلطنت مغربی کے استبداد کی بربادی کے معاون ہونے کے لئے تیار رہیں۔

ہاں ہم مغربی شہری گروہ کے جانی دشمن ہیں۔ اور ہم مغربی اہل ثروت کے منصوبوں کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ اہل مشرق کو ہر قسم کے جابروں کا خاتمہ کرنا چاہیئے خواہ وہ اجنبی ہوں یا وطنی۔ مشرقی انقلاب کا یہ مقصد محض مغربی استبداد کی بربادی ہی نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ ملکی دشمنانِ وطن کی بیخ کنی بھی۔ آج اِس عہد کا آغاز کر رہے ہیں جس میں متمرد اور کاہل طبقۂ امرا کا خاتمہ کیا جائیگا۔ اور دنیا کی دولت اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی جو اِس دولت کو اپنے گاڑھے کی کمائی سے پیدا کرتے ہیں +

باکو کانفرنس سے حکومت ماسکو کے اِس مقصد کا اظہار مقصود تھا۔ جس سے تمام ممالک مشرق میں جمہوریت کا دور دورہ ہو جائے۔ بنا بریں انہوں نے ۱۹۲۱ء میں آرمینیا اور گرجستان میں بلشویک حکومت قائم کر کے چھوڑی +

مگر اِن روسی کامیابیوں سے اہل مشرق کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ اور وہ مغربی استبداد کی جگہ پر بلشویت کو متمکن ہوتا ہوا دیکھنے لگے۔ مگر ماسکو کی منصوبہ بازیاں مشرقی لیڈروں کو پہلے سے بھی معلوم تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ وہ ماسکو کی امداد تو لینا چاہتے تھے۔ مگر اِس کے بدلے بلشویت قبول کرنے کے روادار نہ تھے۔ مانا کہ اہل مشرق میں اصولہائے اشتراکیت سے بے خبری تھی اور بلشویت کی اِن کو سمجھ نہ آتی تھی۔ مگر وہ بلشویک روس کی جفا کاریوں کو بھی دیکھ رہے تھے جس کی حقیقت یہ تھی۔ چھ لاکھ مسلّح بلشویک ۱۷ کروڑ غیر بلشویک روسی رعایا پر حاکم تھے۔ مغربی ممالک میں تو عوام کی تعلیم اور منظم حکومت کی روایات بلشویک سیلاب کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ مگر مشرق میں اِن دونوں میں سے ایک بھی موجود نہیں۔ بلکہ مشرق کی حالت بالکل روس کی سی تھی۔ عوام کی جہالت کی حد نہ تھی۔ قوی اور باثر طبقہ متوسط کا وجود نہ تھا۔ اور شخصی حکومت کے سوا اور کسی نظام کا پتہ نہ تھا۔ اور اس پر بلشویک ترکستان اور آذر بائیجان کی نظیر سامنے تھی۔ اِن تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اہل مشرق روسی بلشویکوں سے دامن کترانے لگے +

اب اِن نتائج کا ذرا عملی حالات پر ملاحظہ ہو۔ ایک طرف تو مصطفےٰ کمال پاشا نے سوویت اصولوں کا تدارک کیا۔ اور دوسری طرف خود ترکوں اور روسیوں میں قفقاز کی پہاڑیوں پر آپس میں بارہا لڑائیاں ہوئیں۔ بلشویک اسکالات نے مصر میں مصری لیڈروں اور انگریزوں

کا سمجھوتہ کرا دیا۔ اور ونسٹن چرچل نے بلشویت کی ناکامی کو ۱۹۱۸ء ہندوستانی عوام کے سنبھل جانے کا موجب قرار دیا۔ وہ کہتا ہے۔ خود روشن خیال ہندوستانی جن کی تعداد روسی تعلیم یافتہ گروہ سے کم ہے منظم حکومت کے تہ و بالا ہو جانے کے امکان سے گھبراتے ہیں۔ افغانستان کی بلشویکوں سے محبت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بلشویکوں کے ہاتھوں بخارا کی تباہی اور امیر بخارا اور کئی ہزار بخاری مہاجرین کے ورود کابل پر خود امیر امان اللہ خان والی افغانستان نے روسیوں کے ان افعال سے بیزاری ظاہر کی۔ اور اس پر ایک بلا اور یہ آئی کہ سرحد افغانستان کی افغانی پلٹنوں نے روسی نمونے کی سپاہیوں کی فوجی کونسل کے قیام کا مطالبہ کیا۔ روسی امیر کو ہندوستانی لوٹ کا سبز باغ دکھا رہے تھے۔ مگر اس لوٹ کا کیا فائدہ۔ جس میں خود امیر کو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ مشرقی قومیں روسیوں کی بدعنوانیوں کو دیکھ کر ان کی طرف سے ہٹتی گئیں۔ اگر اہل مشرق کو خود مغربی مستبدین کی طرف سے بھی بدظنی نہ ہوتی تو روسی بلشویک مدبروں کو تمام مشرقی ممالک سے بیک بینی و دو گوش کبھی کا باہر کر دیا گیا ہوتا۔

بدقسمتی سے مشرقی وطن و ملت پرست اصحاب اپنے آپ کو شیاطینِ روس و دجالانِ یورپ کے درمیان گھرا ہوا پاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ دونوں سے پہلو تہی کرنا چاہتے ہیں۔ یورپی استبداد سے تنگ آ کر وہ روسیوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور ماسکو کی بدعنوانیوں کو دیکھ کر وہ واپس رجعت اختیار کرتے ہیں۔ مغربی مدبروں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ماسکو کا بہترین ذریعہ پروپیگنڈا زینوویو نہیں۔ بلکہ جنرل گورو اور اس کے فرانسیسی سپاہی ہیں۔ جو شام اور الجزائر میں ظلم روا رکھ کر اہل مشرق کو مغرب کا دشمن بنا چکے ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ اصولِ بلشویت کی مشرقی اشاعت نہ صرف مشرق بلکہ مغرب کیلئے بھی منحوس ثابت ہوگی۔ اگر بلشویک فتح سے مغرب میں حیوانیت کا عود ہو جائیگا۔ تو اہل مشرق تو اس کے اثر سے اپنی قدیمی مذہبی اور معاشرتی قیود سے آزاد ہو بالکل بربری اور وحشی ہو جائیں گے۔ اور قلیل التعداد طبقہ اعلےٰ و وسطےٰ کی بربادی ہو کر تمدن و تہذیب مشرق کا نام سوا ایک بھی نہ رہیگا۔ اور مشرق ایک ایسے غارِ بربریت میں جا گریگا۔ جس سے صدیوں میں جا کر اس کا نکلنا بھی مشکل ہوگا۔ اگر مشرق میں مغربی حکومتوں کے نمائندے اس خطرے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تو انہیں جلد سے جلد اقوام مشرق کے مطالبۂ آزادی کا اعتراف کرنا چاہیئے

خاتمہ

مشرقِ قریب و وسطےٰ کا جائزہ ہوچکا۔ اِس عام جائزے کے نمایاں پہلو کیا کیا ہیں۔ میری دانست میں ایک پہلو تو یہ ہے۔ کہ مشرق میں ایک شدید انقلاب ہو رہا ہے۔ مشرق جامد اب حرکت میں آچکا ہے۔ اور حرکت بھی کیسی جس نے اس کی بیخ و بنیاد بھی ہلا دی ہے۔ یہ زمانہ مشرقِ جدید کا زمانہ تغیر ہے۔ اور وہ تغیر بھی ایسا کہ جس کی مثال اس کی تاریخ سابق میں کہیں نہیں ملتی۔ دنیائے اسلام اب تک ایک ہزار سالوں سے جمود میں تھی۔ مگر اب وہ سکتہ ختم ہوچکا۔ اور اس کے نام لیوا جادۂ ترقی پر گامزن ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا منتہائے عمل کیا ہے۔ اِس کا کسی کو علم نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ وہ کون شخص ہوگا۔ جو اس عظیم سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشرتی اور روحانی ہیجان کا اندازہ لگا سکے۔ اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ تو وہ صرف اِسی قدر ہے۔ کہ اِس تحریکِ عظیم کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں۔ اور اِس کے مختلف پہلوؤں کی صحیح حقیقت دریافت کریں۔

ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ اِس مہتم بالشان تغیر کے مختلف مظاہرات کا امتحان ہو جس سے اِن مختلف النوع مظاہرات کا باہمی تعلق پیدا ہو۔ اور اِس پیچیدہ عقدے سے بظاہر متضاد تاثرات کے اصلی میلان کا اندازہ لگے۔ اگر یہ سعی کامیاب ہو جائے۔ تو اس سے کم از کم حوادثِ آئندہ کے امکانات کا پتہ چل سکیگا۔

علم عقل کا درماندہ ہے۔ اور اگر اہلِ مشرق نئی معلومات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ تو کیا عجب ہے۔ اِن کی یہ جد و جہد بارور ہو۔ اور ہیں اُن کا عہد جدید قیام دنیائے جدید کا معاون ہو۔ ورنہ بقول ڈاکٹر بکر ٹی۔ واشنگٹن مشہور امریکن حبشی ریفارمر ایسا نہ ہو۔ کہ زنگی اور دنیا کے ساتھ یورپی تعلقات کی موجودہ بے اعتدالی اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہے"۔ مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہے۔ فاضل مضمون نگار نے حالات عالم اسلام و ملل ایشیا کے مستقبل کو محض بطور نظریہ پیش کیا ہے۔ جس وقت یہ بیانات لکھے جا رہے تھے۔ اس وقت کے حالات کچھ اور تھے۔ دو سال کے طویل عرصے میں نہ صرف وسیع حصص ایشیا میں اِن کے نتائج پیدا ہوچکے ہیں۔ بلکہ دیگر ممالک کے سیاسی و اقتصادی امکانات تیقن صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر ظاہری اسباب کی بنا پر

تتابع کی صورت قرار دی جاتی تو چاہئیے تھا۔ عہد نامجات و قرار دادہا بعد از جنگ متوقعات پیدا کرتے۔ مگر مشاہدات حال قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہُوا۔ ترکی نے جس کی موت کیا تکفین تک کر دی گئی تھی۔ کفن پھاڑ کر پھر سے عالم حیات میں آ پہنچی۔ اور اہل مصر اور اہل ہندوستان نے غیر معمولی تنومندی کا ثبوت دیا۔ اِس میں کلام نہیں۔ ایشیا کا مستقبل کسی خاص حصۂ مشرق کے ہاتھ میں نہیں۔ بلکہ جوں جوں ایک ملک یا ایک جماعت اپنی حالت بہتر بناتی جائیگی۔ اِس کا اثر مجموعی حالت پر پڑتا رہیگا۔ بنا بریں وطن پرستانِ وادیٔ نیل کا جوش و خروش صرف اِس لئے موجودہ صورت اختیار کر سکا کہ اِس کے دعاوی کی تائید ترکی کی ظفر مندانہ اور کامیاب جدوجہد سے ہوئی۔ اور برخلاف اِس کے اگر فلسطین اور عراق اور شام اب تک اپنی درماندگی میں مبتلا ہیں۔ تو صرف اِس لئے کہ جماعتی تعاون اور جمہور کے وہ مظاہرات جو ترکی میں ہوئے۔ اور جس کی اہالیانِ مصر نے تقلید کی۔ اِن خطوں میں ظاہر نہ ہو سکے۔ فلسطین اِس وقت فرقہ ہائے اسلامی و عیسوی و موسوی کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ اہل عراق بر مبنے عہد نامہ جدید ابھی تک ملکی سیاسی کارروائی کا کوئی مستقل نظام قرار نہیں دے سکے۔ اور اِن حالات کے ہوتے ہوئے یہ امر مشتبہ رہیگا کہ خاک پاک ایران کب حقیقی آزادی کو حاصل کر کے خارجی مشکلات سے دائمی چھٹکارا پا سکے۔

اب رہا مسئلہ ہندوستان۔ مسئلہ ہندوستان صرف اِس ملک کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ کل ایشیا کا مجموعہ۔ مشرقی مغربی سیاسیات کا لیور اور معاملات عالم کا واحد ستون ہے۔ اگر ہندوستان آج دنیا سے معدوم ہو جائے۔ تو نصف سے زیادہ بین الاقوامی خرخشے اِس کے ساتھ ہی رخصت ہو جائیں۔ اقتصادیات دنیا میں ایک وسیع تغیر واقع ہو۔ اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو کر جدید شیرازہ بندی کا محتاج ہو جائے۔ مگر نہ ایسا کبھی ہوا اور نہ ہوگا یہ عالم اسباب ہے۔ اور پروردگار نے ہر ایک حاجت اور ہر ایک تغیر کی علت مقرر کی ہے انقلاب تو ہوگا۔ مگر اِس کے بانی ہم ہوں گے۔ نہ کہ کوئی اور۔ اِس کے حالات سیاسی معاشرتی اور اقتصادی میں بھی تبدیلیاں ہوں گی۔ مگر اِن کے پیدا کرنے والے بھی اپنے اہل وطن ہی ہوں گے۔ اب اِس بیان کی حقیقت ملاحظہ ہو۔ دو سال ہوئے جب اِس بھارت ورش

میں اتحاد قومی کا دور دورہ تھا۔ سنگٹھن اور شدھی۔ اور فرقوں کی منافرت کی جگہ رواداری پر
عمل تھا۔ اور انڈین نیشنل کانگرس اپنے چہل سالہ دور میں اول مرتبہ صحیح معنوں میں نیشنل
قرار دی گئی تھی۔ ان دلخوش کن واقعات کے جو اثرات یورپ اور مشرقِ قریبہ کی ملتوں پر
ہوئے۔ اس کی یاد اب روح کو صدمہ پہنچاتی ہے۔ اہل مصر میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد
کو تائید غیبی اور مژدہ رحمت قرار دیا گیا۔ زغلول پاشا۔ حسن حبیب پاشا و اعیان وطن
مصر نے احیاءِ ہند کو اپنی فلاح کا پیش خیمہ گردانا۔ ایران اور ترکی میں لیڈران وطن
نے اسے ساری مشرقی دنیا کا ستارہ امید سمجھا حتیٰ کہ آذربائیجان اور کریمیہ کی دور افتادہ
اسلامی جماعتوں نے اس کا بھی خوشی سے خیر مقدم کیا۔ مگر وائے برحال ما بر آفتابِ اُمید
کی کرنیں جلد ہی کورانہ تعصب اور انتہائی ناعاقبت اندیشی کے بادلوں میں گھر گئیں۔ اور
ملتان اور سہارنپور جیسے ہوشربا حادثات کا ظہور ہوا۔ اب کوئی سمجھے کہ ملکی فلاح کا عدم
وجود جمہور کی ذہنی۔ اقتصادی یا معاشرتی درماندگی کا نتیجہ ہے۔ مگر اس بدنصیب ملک
میں ہر قسم کی امید افزا مادی حالات کے ہوتے ہوئے کیا ایک مذہبی منافرت ترقی کے
اور تمام منافع کو مجہول نہیں کر سکی۔ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے عناد کا اصلی
سبب مذہبی نہیں۔ بلکہ اقتصادی ہے۔ شام میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی کشیدگی
روحانی نہیں۔ بلکہ معاشرتی ہے۔ مگر اس ملک میں عقائد بجائے اس کے انسانوں کے
باہمی تعاون و مدارا کے معاون ہوں۔ اُلٹے بدترین رذالت اور بداخلاقی کے باعث قرار پا
گئے ہیں۔ اب اس عام ضلالت میں کوئی صورت امید آتی ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ کہ شاید
کوئی ساعت سعد پھر اس ملک پر آئے۔ کہ ملکی اتحاد و یکجہتی کے بے بہا برکات سے آگاہ
ہو کر یہاں کے لوگ مذہب کو تفرقہ نہیں بلکہ باہمی ارتباط کا ذریعہ قرار دیں۔ مسئلہ ہند یوں
تو ایک دنیا کے مسائل کی جان ہے۔ مگر بالذات سہل ترین مسئلہ ہے۔ اگر اس ملک
کی جماعتی منافرت اور تفرقہ سازی آج ختم ہو جائے۔ تو ایشیائی فلاح اور آزادی
کے سب سے ممتاز رکن ہم ہوں۔

ایشیا کے مستقبل کی دلخوش کن صورت اگر ہندوستان کے حال و ماضی

میں نظر نہیں آتی۔ تو مشرق قریبہ میں ترکی کے فوق العادۃ تہور اور مشرق اقصےٰ میں چین اور جاپان کی عظیم الشان اور باوقار جدوجہد میں صاف نظر آرہی ہے۔ ناظرین جو مغربی خبر رساں ایجنسیوں کے اعلانات سے مشرق بعیدہ کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ شاید جمہوریہ چین کے ربع صدی سابقہ کے محیر العقول ذہنی، اقتصادی اور معاشرتی تغیرات سے ناواقف ہوں۔ مگر آئے دن کی چینی سرکشیوں اور اندرونِ ملک کی خانہ جنگیوں سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوتا رہتا ہوگا۔ کہ ملک میں کچھ ہو رہا ہے۔ اہل یورپ جن کے نمائندے بتعداد کثیر چین میں سواحلی اور اندرونی مقامات پر کوٹھیاں ڈالے پڑے ہیں۔ اس آنے والے خطرے سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ جب بیدار شدہ پچاس کروڑ نفوس اپنے وسیع اور قدیم ملک کو دنیا کی سیادت بخشنے کا قصد کریں گے۔ تحیر انگیز یورپی ایجادیں ہوا کریں۔ مگر یہ یاد رہے۔ جب کہ انسانی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ مثل دیگر اقوام عالم اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ قومی ثروت اور قومی شرف کا ساز و سامان حاصل کرنے کے لئے نکلے گا۔ تو اس وقت متمدن دنیا جو آئے دن کی کشاکشیوں سے چور ہو چکی ہوگی۔ اپنی خیر اسی میں محسوس کریگی۔ کہ اس نوخیز اور عقلانی اور مادی جواہر سے آراستہ پیراستہ منگول نسلِ انسانی کے ہاتھ میں دنیا کی قیادت دے دے۔ اس سے اس تصور کی تائید بھی ہوگی۔ جس کی بنا پر کئی ایک مستشرقین تاتاری اور تورانی یعنی (منگولی) قوموں کو "دنیا کی آنے والی" قرار دے چکے ہیں۔ چین کی موجودہ ترقی کا بڑا راز اس ملک کی مختلف جماعتوں کا ایک ہی نظامِ معاشرت میں منسلک ہونا اور ملک سے مذہبی تعصب اور منافرت کا عدم وجود ہے۔ یہی حال جاپان کا ہے۔ جہاں بدھ بھی ہیں۔ اور تابعین شنتو۔ عیسائی بھی اور اہل ٹو بھی مگر کیا مجال ان مختلف المذاہب افراد میں سے کوئی ملکی اور قومی مفاد کو اپنے خصوصی عقائد کی خاطر قربان کردے جو بات اہل چین و جاپان کو ہم سے متمیز کرتی ہے۔ وہ صرف مذہب کا جائز استعمال ہے تاریخ قتالِ عالم کی ورق گردانی کیجئے تو آپ کو وہی عقائد کا ناجائز استعمال ملکوں اور قوموں کی تباہی اور اس کا جائز استعمال اور مناسب عمل دنیا کی فلاح اور ترقی کا باعث ملیگا۔

ترکی کے ارمنی اور یونانی اپنے کورانہ تعصب میں مبتلا رہے۔ جس نے آخر کار انہیں اپنے وطن دیرینہ سے نکلوا کر چھوڑا۔ اور انہیں کے بھائی مصری عیسائی یعنی قبطی گروہ بسبب تعاون و رواداری اپنے اسلامی ہم وطنوں کے ساتھ ملک کی حکومت میں برابر کے شریک ہیں۔ لہٰذا سرزمین ایشیا جس پر ابدالآباد سے مذہب کا دور دورہ رہا ہے۔ اور اس کے قلب و جگر یعنی دنیائے اسلام کی ترقی صرف ایک عمل میں پنہاں ہے اور یہ کہ قلوب جہول بدعات اور کورانہ تعصب سے پاک ہوں اور مذاہب باہمی ہمدردی کا معاون ہو۔ نہ کہ مخالف۔ جہاں اس پر عمل ہو گا۔ آزادی ہو گی۔ ترقی ہو گی۔ جو اس زریں اصول سے بے خبر رہیں گے۔ پیٹے رہیں گے۔ مغلوب و مقہور ہونگے۔

یہ کتاب اور ہر قسم کی کتابیں و سامان سٹیشنری
ہماری دوکان سے بارعایت ملسکتے ہیں۔
نیز کتب خانہ کی مکمل فہرست ایک
کارڈ آنے پر مفت روانہ کیجاتی ہے

المشتہر
شیخ عبدالرحمٰن حبیب الرحمٰن تاجران کتب
بازار مائیسواں امرتسر

کتبہ محمد صدیق